حقیقتوں میں اہل اُصول کا اختلاف کیسا بیّن ہی۔ طبعیات میں کارروائی کے مختلف عنوان اور طریقے ہیں لیکن سب کے نتیجے ایک ہی ہوتے ہیں خلاف اس کے مابعد الطبعیات میں یہ ہمیشہ دیکھا جاتا ہی کہ اگر دو آدمی مساوی قابلیت اور مساوی دیانت کے لیے نفس کے مطالعہ میں مختلف طریقوں پر چلتے ہیں تو جن نتائج پر وہ پہنچتے ہیں وہ بھی مختلف ہوتے ہیں۔ جو اشخاص ان امور میں درک نہیں رکھتے وہ ان امور کو چند مثالوں کے ذریعہ سے بخوبی سمجھ جائیں گے۔ وہ اہل مابعد الطبعیات جو تصورات کے مطالعہ سے کام شروع کرتے ہیں وہ اپنے نفوس میں وسعت (مکان) کا ایک تصور پاتے ہیں اور پھر سوال کرتے ہیں کہ یہ تصور کہاں سے پیدا ہوا ظاہر ہی کہ اس تصور کی بنا حواس پر تو ہو نہیں سکتی کیونکہ حواس اُنھیں اشیاء کو محسوس کرتی ہیں جو محدود اور عارضی ہوتی ہیں۔ اور مکان کا تصور نامحدود اور لازم ہی۔ وہ نامحدود اس لیے ہی کہ ہم یہ بات خیال نہیں کر سکتے کہ مکان/وسعت کی کوئی حد و انتہا ہی اور وہ لازم اس وجہ سے ہی کہ ہم اُس کی غیر موجودگی کے امکان تک کو خیال نہیں کر سکتے۔ یہاں تک تو اہل تصور سے بحث ہوئی۔ لیکن اہل محسوسات کو لیجیے کہ وہ تصورات سے شروع نہیں کرتے بلکہ حواس سے شروع کرتے ہیں اور جداگانہ نتیجے پر پہنچتے ہیں۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم کو مکان/وسعت کا کوئی تصور اُس وقت تک ہو نہیں سکتا جب تک اشیاء کا تصور پہلے نہ ہو لے۔ اور اشیاء کے تصورات اُن محسوسات کے نتیجے ہوں گے جو اُنھی اشیاء نے پیدا کیے ہیں۔ چونکہ وسعت/مکان کا تصور لازم ہی تو وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ صرف اس حالت سے پیدا ہوا ہی کہ ہم کسی ایسی شی کا تصور نہیں کر سکتے۔ جو کسی دوسری شی کے بہ نسبت کسی خاص موقع یا محل میں نہ ہو۔ اس سے کسی شی اور کسی محل یا موقع کے تصورات کا ایک سلسلہ ملتا ہی اور چونکہ یہ سلسلہ بار بار ہمارے پیش نظر ہوتا ہی تو آخر کار ہم لوگ اپنے اندر یہ قابلیت نہیں پاتے کہ کسی شی کو بغیر کسی محل یا موقع کے تصور کر سکیں۔ یا بالفاظ دیگر بغیر کسی مکان کے تصور کر سکیں۔ پھر مکان کے نامتناہی ہونے کے بارہ میں وہ کہتے ہیں کہ یہ ایسا خیال ہی جو ہم میں خطوط یا سطحات یا مقادیر کے متواتر اضافہ

سے پیدا ہوتا ہے اور یہی تین چیزیں وہ ہیں جو وسعت (مکان) کے اجزائے ترکیبی ہیں۔ اسی طرح اور بیشمار امور میں ہم اسی قسم کے اختلاف دونوں فرقوں میں پاتے ہیں۔ مثلاً اہل تصوریہ دعوے کرتے ہیں کہ ہمارے تصورات نسبت علت زماں، وجود شخصی (عینیت شخصی) اور جسم کے عالمگیر اور ضروری (لازمی) ہیں۔ یہ سب سادہ (غیر مرکب یا مفرد) ہیں۔ اور چونکہ ان میں تحلیل کی گنجائش نہیں اس لیے نفس کی ابتدائی ترکیب پر محمول کیے جا سکتے ہیں۔ برخلاف اس کے اہل حواس بجائے اس کے کہ ان تصورات کے (تفرد) کو تسلیم کریں ان کو بیحد مرکب (پیچیدہ) خیال کرتے ہیں اور اُن کی "عالمگیریت"، اور لزوم کو ایک متواتر اور قریبی تعلق کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔

یہ سب سے پہلا اہم اختلاف ہے جو لازمی طور سے مختلف طریقوں کے برتنے سے پیدا ہوتا ہے اہل تصور اس بات کے اعتراف پر مجبور ہیں کہ حقائق لازمی اور حقائق عارضی کی اصل جدا جدا ہے اہل حواس اس اعتراف پر مجبور ہے کہ اُن کے ماخذ ایک ہیں۔ یہ دونوں فریق اور جس قدر آگے بڑھتے جاتے ہیں اُسی قدر اُن کا اختلاف و تناقض زیادہ واضح ہوتا جاتا ہے وہ دونوں اخلاق، فلسفہ اور صنعت کی ہر شاخ میں علانیہ برسرپیکار ہیں۔ اہل تصور کہتے ہیں کہ کل انسان دراصل نیکی، سچائی اور حسن کی بابتہ ایک ہی خیال رکھتے ہیں۔ اہل حواس کہتے ہیں کہ اس قسم کا کوئی معیار نہیں ہے کیونکہ تصورات مبنی ہوتی ہیں محسوسات پر اور انسانوں کے محسوسات اُن کے اجسام کے تغیرات اور اُن خارجی حوادث پر مبنی ہوتے ہیں جن سے وہ اجسام متاثر ہوتے ہیں۔

یہ ایک مختصر بیان ہے اُن متقابل نتائج کا جن پر اہل مابعد الطبعیات کو محض اس وجہ سے پہنچنا پڑا ہے کہ اُنھوں نے تحقیقات کے ایسے طریقے برتے ہیں جو مخالف یکدیگر ہیں اور اس بات پر نظر کرنا اس وجہ سے اور بھی ضروری ہے کہ جب یہ دونوں طریقے عمل میں آ چکتے ہیں اُس وقت مابعد الطبعیات کا سارا خزانہ خالی ہو جاتا ہے۔ دونوں فریق اس پر متفق ہیں کہ

نوامیس ذہنی صرف نفوس منفردہ کے مطالعہ سے دریافت ہو سکتے ہیں اور یہ کہ نفس میں کوئی شے ایسی نہیں ہے جو کہ حاسہ یا تفکر کا نتیجہ نہ ہو۔ لہذا اُن کے اختیار میں جو کچھ ہے اسی قدر ہے کہ یا تو حواس کے نتائج کو قوانین فکر و تصور کے ماتحت ٹھہرائیں یا فکر و تصور کے نتائج کو قوانین حواس کے ماتحت گردانیں۔ چنانچہ مابعد الطبعیات کا ہر طریقہ انہیں منصوبوں میں سے کسی ایک نہ ایک کے بموجب قائم کیا گیا ہے اور یہی حالت ہمیشہ رہیگی۔ کیونکہ جب یہ دونوں منصوبے ملا دیئے جاتے ہیں تو وہ کل آثار مابعد الطبعیات پر حاوی ہو جاتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک طریقہ مساوی طور سے قرین قیاس ہے۔ اور ہر ایک کے حامی بجائے خود مطمئن ہیں اور اس نزاع کی حقیقت ہی ایسی ہے کہ ناممکن ہے کہ کوئی حد اوسط قرار دی جا سکے۔ پھر کوئی منصف علیہ بھی ایسا نہیں ہو سکتا جو تصفیہ کر دے کیونکہ مابعد الطبعیات کے مباحثوں میں بجز ایسے شخص کے جو مابعد الطبعیات والوں میں سے ہو اور کوئی پڑ نہیں سکتا۔ اور کوئی شخص مابعد الطبعیات والوں میں سے ہو نہیں سکتا جب تک کہ وہ یا تو اہل حواس یا اہل تصور میں سے نہو۔ تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ کوئی شخص جو ان فریقوں کے جھگڑوں کا منصف بننا چاہئے وہ انہی فریقوں میں سے کسی نہ کسی میں کا ہوگا۔

ان وجوہ سے میرے خیال میں ہم کو یہ نتیجہ ماننا چاہیے کہ چونکہ مابعد الطبعیات والے ضرورتاً اور اپنی تحقیقات کی نوعیت کے لحاظ سے دو بالکل ہی متضاد فرقوں میں تقسیم ہو گئے ہیں اور ان دونوں کی اعتباری صحت و راستی کے جانچنے کا کوئی ذریعہ معدل نہیں ہے۔ نیز چونکہ اُن کے پاس بہت ہی قلیل ساز و سامان ہے اور چونکہ وہ ان سامانوں سے اس طریقہ پر کام لیتے ہیں جس طریقہ سے کبھی سائنس (حکمت تجربیہ) کی نشو و نما نہیں ہوئی اس لیے ہم کو یہ باتیں دیکھ کے اس کی توقع ہی نہیں رکھنا چاہیے کہ نفس انسانی کی تاریخ جن مسائل عظیمہ کو ہمارے سامنے پیش کرتی ہے اُن کے حل کرنے کے واسطے وہ ہم کو کافی سامان دینگے اور جو شخص کہ فلسفہ ذہنی کی موجودہ حالت کو واجب طور سے جانچنے کی زحمت گوارا کریگا

اُسے یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ باوجودیکہ اُس نے ہمیشہ بعض سب سے زیادہ زبردست نفوس پر اور پھر اُن کے ذریعے سے عموماً سوسائٹی پر اثر ڈالا ہی باایںہمہ کوئی اور مطالعہ ایسا نہیں ہے جس پر اس مستعدی سے ہمت مصروف رہی ہو اور جو اتنی مدت تک زیر مشق رہا ہو اور پھر بھی فوائد کے لحاظ سے اس قدر بے برگ و بار نکلا ہو۔ علم کی کوئی شاخ ایسی نہیں جس میں اتنی زیادہ سعی کی گئی ہو اور نتیجہ اس قدر کم ترقی ہوا ہو۔ ممتاز ترین قابلیتوں اور اعلیٰ درجہ کے حوصلہ اور ہمت والے اشخاص متمدن ملک میں اور صدیوں تک مابعد الطبعیات کے تحقیقاتوں میں مصروف رہے اور پھر بھی اس وقت تک اُن کے طریقے بجاے اس کے کہ راستی سے لگ بھگ ہوتے نہایت شدت سے ایک دوسرے سے بیگانہ اور مخالف ہو رہے ہیں۔ یہ معلوم ہوتا ہی کہ اس بیگانگت و مخالفت کو علم کی ترقی اور بڑھا رہی ہی۔ مخالف فریقوں کی متواتر چشمکوں، اُن کی نہایت زور شور کی تائیدوں اور قطعی اور غیر فلسفیانہ اعتماد جس سے ہر فریق اپنے طریقہ کی حمایت کرتا ہی ان سب امور نے مطالعۂ نفس کو ایسی پریشانی میں ڈال دیا ہی کہ اُس کا مقابلہ صرف اُس پریشانی سے کیا جا سکتا ہی جس میں مطالعۂ مذہبی کو اہل مذاہب کے بحث و مباحثہ نے ڈال رکھا ہی۔ انجام یہ ہی کہ اگر ہم سلسلہ خیالات کی بابتہ چند قوانین اور (غالباً میں اتنا اور کہہ سکتا ہوں کہ) زمانہ حال کے چند نظریات نسبت باصرہ ولامسہ کے مستثنیٰ کر دیں تو مابعد الطبعیات کے کل احاطہ میں کوئی ایک بھی اصول ایسا باقی نہیں رہتا جو اہم اور کارآمد ہو اور نیز ایسا ہو کہ اُس کی راستی میں چون و چرا نہ ہو سکتی ہو۔ ان حالات میں اس شک و شبہ کا ترک کر دینا ناممکن ہی کہ جس طور سے یہ تحقیقاتیں جاری رکھی گئی ہیں اُس میں کوئی اصولی غلطی ہی بجاے خود تو میرا یہی عقیدہ ہی کہ صرف اپنے نفوس کے مطالعہ سے نیز ایسے مہمل تجربات سے جو ہم اُن نفوس پر کر سکتے ہیں یہ بالکل ناممکن ہوگا کہ سائکولوجیہ (علم نفس ذہن انسان) کبھی ایک سائنس کے درجہ پر پہنچ سکے۔ اور مجھے اس بارہ میں بہت ہی کم شک ہی کہ مابعد الطبعیات کا مطالعہ کامیابی سے ہو سکتا

ہے تو صرف اسی طرح کہ تاریخ کی تحقیقات ایسی جامعیت (شرح وبسط) کے ساتھ کی جائے
کہ جس سے ہماری سمجھ میں وہ حالات آجائیں جو نوع انسانی کے افعال وحرکات پر
حکمرانی کرتے ہیں۔

باب چہارم

نوامیس ذہنی یا اخلاقی ہیں یا عقلی
مقابلہ نوامیس اخلاقی اور نوامیس عقلی کا

اور

اُس اثر کی تحقیق جو ان میں سے ہر ایک سوسائٹی کی ترقی پر ڈالتے ہیں

باب گزشتہ میں مجھے امید ہو کہ یہ بات واضح ہو چکی ہو کہ آگے چل کے چاہے جو کچھ حالت ہو لیکن اپنے معلومات کی حالت موجودہ پر نظر کر کے ہم کو یہی کہنا چاہیے کہ مابعد الطبیعات کا طریقہ اُس مقصد کے لیے شایاں نہیں ہو جو اکثر ہمارے پیش نظر کیا جاتا ہو یعنی اُن قوانین کا دریافت کرنا جو نفس انسانی کے حرکات کی رہنمائی کرتے ہیں۔ لہذا ہم کو چار ناچار اُسی دوسرے باقیماندہ طریقہ کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہو جس کے ذریعہ سے آثار ذہنی کا مطالعہ کرنا چاہیے نہ صرف اس طور سے کہ جیسے وہ منفرداً مطالعہ کرنے والے کے نفس پر ظاہر ہوتے ہیں بلکہ جس طور سے کہ وہ عموماً نوع انسانی کے افعال میں نظر آتے ہیں۔ ان دونوں طریقوں میں جو اصلی تخالف ہو وہ بہت کھلا ہوا ہو۔ لیکن غالباً یہ بہتر ہوگا اگر کچھ اور مثالیں اس قسم کی پیش کر دی جائیں جو احقاق حق کے واسطے ان میں سے ہر طریقہ میں استعمال ہوتی ہیں۔ اور اسی غرض کے لیے میں ایک ایسے بحث کو انتخاب کرونگا کہ جو (اگرچہ اب تک ناقص و نامکمل طور سے سمجھا بوجھا گیا ہو لیکن) ایک نفیس مثال اس امر کی ہو کہ نوامیس فطرت باوجود نہایت ناموافق و متضاد حالات کے کس ترتیب و باقاعدگی کے ساتھ اپنی رفتار قائم رکھتے ہیں۔

جس معاملہ کی طرف میں اشارہ کر رہا ہوں وہ اس طرح کا سبب ہے جو دو جنسوں (یعنی مرد عورت) کی پیدائش میں قائم رہتا ہے اور یہ تناسب ایسا ہے کہ اگر کسی ملک میں اُس میں کچھ زیادہ خلل پہنچ جائے خواہ وہ صرف ایک ہی نسل میں کیوں نہ ہو تو سوسائٹی کو سخت ابتری اور پراگندگی میں ڈال دے اور ادبرا کے قوم کی بداعمالی کو بہت بڑھا دے۔

ہمیشہ سے مردوں اور عورتوں کی اوسط پیدائش کی بابتہ یہ گمان رہا ہے کہ وہ تقریباً برابر رہتی ہے کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ بالکل برابر ہوتی ہے یا کچھ کم و بیش ہوتی ہے۔

اور اگر کچھ کمی بیشی ہوتی ہے تو بیشی کس طرف ہوتی ہے۔ چونکہ اولاد کی پیدائش ماقبل کے واقعات طبعی کا نتیجہ ہوتی ہے لہذا یہ بات لازم ہے کہ پیدائش کے قوانیں اُنھیں واقعات ماقبل میں مضمر ہوں یعنی یہ کہنا چاہیے کہ مرد و عورت کے تناسب کے اسباب خود والدین میں پنہاں ہوں گے۔ ان حالات کے تحت میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ ہم اس عقدہ کو اپنے معلومات علم اعضائے حیوانات کے ذریعے سے حل کریں۔ کیونکہ بہت معقول طریقہ سے یہ کہا گیا ہے کہ "چونکہ علم اجسام میں قوانین بدن پر غور کیا جاتا ہے اور چونکہ کل انسانوں کی پیدائش جسم سے ہوتی ہے لہذا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر ہم قوانین بدن کو جان جائیں تو ہم قوانین پیدائش کو بھی جان جائینگے"۔ یہ وہ رائے تھی جو ماہرین علم اجسام نے ہماری مبدء و نشار کی بابتہ قائم کی تھی۔ اور ٹھیک یہی رائے وہ ہے جو ہماری تاریخ کے ماہرین مابعد الطبعیات قائم کیے ہوئے ہیں۔ دونوں فریق والے یہی عقیدہ رکھتے تھے کہ آثار کے علل پر یکبارگی پہونچ جانا اور اُس کے قوانین کو مطالعہ کر کے خود آثار کی بابتہ پیشین گوئی کر دینا ممکن ہے۔ علمائے عضویات کہتے تھے کہ منفرد جسموں پر غور کرنے سے اُن قوانین کو دریافت کر کے جو والدین کی مقاربت کی رہنمائی کرتے ہیں ہم دونوں جنسوں کے تناسب کو دریافت کریں گے۔ کیونکہ یہ تناسب مقاربت والدین کا پیدا کیا ہوا نتیجہ ہے"۔ ٹھیک اسی طرح سے

مابعد الطبعیات والوں کا قول ہی کہ منفرد نفوس پر غور کرکے ہم اُن قوانین کو تحقیق کریں گے جو اُن کے افعال وحرکات کی رہبری کرتے ہیں۔ اور اس طور سے ہم نوع انسانی کے افعال وحرکات کی بابتہ پیشین گوئی کرسکینگے کیونکہ یہ کھلی ہوئی بات ہی کہ وہ افعال وحرکات انھیں افعال وحرکات منفردہ سے مرکب ہوئے ہیں۔ یہ وہ امیدیں ہیں جو نہایت اطمینان کے ساتھ علمائے عضویات نے قوانین جنسی کی بابتہ اور مابعد الطبعیات والوں نے قوانین تاریخ کی بابتہ قائم کی ہیں لیکن ان وعدوں کے ایفا کے باب میں نہ تو اہل مابعد الطبعیات ہی نے کچھ کیا ہی نہ علمائے عضویات ہی نے کوئی کامیابی حاصل کی ہی حالانکہ علمائے عضویات کے خیالات کو علم تشریح اجسام سے بھی مدد ملتی ہی کیونکہ اس میں براہ راست تجربہ کو بہت دخل ہی اور یہ ایسا سامان ہی جو اہل مابعد الطبعیات کو میسر نہیں۔ بااینہمہ اس پیش پا افتادہ مسئلہ کی تنقیح کے واسطے یہ ہدایت و سامان بھی بیکار ثابت ہوا۔ اور علم اجسام والوں کے ہات میں اس وقت تک کوئی ایک واقعہ بھی ایسا نہیں جو اس مسئلہ پر ذرا بھی روشنی ڈالتا ہو۔ یعنی یہ مسئلہ کہ آیا مردوں کی پیدائش عورتوں کی پیدائش کی برابر ہی یا کم وبیش ہی۔

یہ وہ سوال ہیں جن کا جواب علمائے عضویات باوجود اپنے علمی سرمایہ کے ارسطو کے وقت سے لیکر ہمارے زمانہ تک نہیں دے سکے۔ البتہ فی الحال ہم نے اُس طریقہ کو برت کر جو بالکل مطابق فطرت معلوم ہوتا ہی ایسی سچائی کو پالیا ہی جسے نہایت ممتاز اشخاص کے ایک سلسلہ دراز کی متفقہ کوششوں نے بھی دریافت کر نہیں پایا تھا۔ اور وہ صرف اس سیدھی سادی ترکیب سے کہ پیدائشوں (ولادتوں) کی تعداد اور بچوں کی جنسوں کو قلمبند کرکے پھر متعدد برسوں اور مختلف ملکوں میں اسی قلمبند کرنے کی کارروائی کو جاری رکھ سکے ہم اس قابل ہوگئے ہیں کہ تمام اتفاقی بیقاعدگیوں کو خارج کرکے اُس قانون کے وجود کو تحقیق جان سکتے ہیں جسے اگر اعداد میں بیان کرنا چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ ہر بیس لڑکیوں

دعوے کے مجاز ہیں کہ اگرچہ اس قانون کے عمل میں درحقیقت فتور پڑ سکتے ہیں لیکن خود یہ قانون اتنا زوردار اور صحیح النتیجہ ہے کہ ہمارے علم میں کوئی ملک ایسا نہیں جس میں ایک سال کے اندر بھی لڑکوں کی پیدائش لڑکیوں سے زیادہ نہ ہوئی ہو۔

ہمیں افسوس ہوتا ہے کہ اس قانون کی اہمیت اور اُس کی نفیس باقاعدگی ابتک خودسرانہ حالت میں ہے اور ہنوز وہ اُن آثار طبعی کی تحت میں نہیں آیا جو اس کے عامل ہیں لیکن ہمارے موجودہ مقصد کے لحاظ سے یہ امر کچھ وقعت نہیں رکھتا ہمارے پیش نظر تو صرف یہ بات ہے کہ اُس طریقہ کو دیکھیں جس کی رو سے یہ دریافت ہوا ہے۔ کیونکہ یہ طریقہ بالکل اس طریقہ کے مشابہ ہے جس کے ذریعہ سے میں نفس انسانی کے افعال کی تحقیق کا ارادہ رکھتا ہوں۔ اور وہ پرانا اور ناکامیاب طریقہ اُس کے مشابہ ہے جسے مابعد الطبعیات والے برتتے تھے۔ جب تک علمائے عضویات نے یہ کوشش کی کہ تناسب جنسی کے قوانین کو منفرد تجربوں سے دریافت کریں وہ اُس مدعا کے حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے جس کے حاصل ہونے کی اُنھیں توقع تھی۔ لیکن جب لوگ ان منفرد تجربوں سے مطمئن ہوئے اور اُنھوں نے اُن مشاہدات کو جمع کرنا شروع کیا جو زیادہ جزوی نہیں تھے بلکہ زیادہ وسیع اور حاوی تھے تب کہیں وہ بڑا قانون فطرت جس کی تلاش میں وہ کئی سو برس سے سرگرداں تھے پہلے پہل ان کو نظر آیا ٹھیک اسی طرح جس وقت تک کہ نفس انسانی کا مطالعہ مابعد الطبعیات کے تنگ اصول اور محدود طریقہ سے کیا جاتا ہے اُس وقت تک ہمارا یہ خیال کرنا بجا ہے کہ جو قوانین اُس کے افعال وحرکات کی رہبری کرتے ہیں وہ نامعلوم رہیں گے۔ پس اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ کوئی ایسی بات پیدا کریں جو دراصل نتیجہ خیز ہو تو ہم پر واجب ہے کہ یہ پرانے طریقے چھوڑ دیں جن کا ناکافی اور بے مصرف ہونا عقل اور تجربہ دونوں سے ثابت ہو چکا ہے۔

اور بجائے اس کے ہم کو واقعات پر ایسی وسیع نظر ڈالنی چاہیئے جس کی مدد سے ہم ان

عمل اندازیوں کو خارج کر سکیں جنھیں تجربہ کے ناممکن ہونے کے سبب ہم کبھی جدا نہ کر سکیں گے

میرے دل کی یہ خواہش کہ اس مقدمۃ الکتاب کے مضامین کو پوری طرح واضح کر دوں خود اس عذر خواہی کے واسطے کافی ہے کہ میں نے اپنے مرکز بحث سے تجاوز کیا ہے۔ اور یہ تجاوز اگرچہ دلیل کو قوی کرنے میں کچھ بھی معین نہیں ہے لیکن اُس کی توضیح و تشریح کے لیے غالباً مفید ثابت ہوگا اور بہرکیف اُس کی وجہ سے معمولی ناظرین کو میری مجوزہ طریقہ تحقیقات کی قدر و قیمت معلوم ہو سکے گی۔ اب ہم کو صرف تحقیقاً یہ جان لینا باقی ہے کہ کس طرح پر اس طریقہ کے عملدرآمد سے ترقی ذہنی کے قوانین آسان ترین شکل میں دریافت ہو سکتے ہیں۔

اگر سب سے پہلا سوال یہ کیا جاتا ہے کہ یہ ترقی کیا ہے تو اس کا نہایت سادہ جواب یہ ہے کہ ترقی دو قسم کی ہے اخلاقی اور عقلی۔ اخلاقی ترقی زیادہ تر ہمارے فرائض سے واسطہ رکھتی ہے اور عقلی ترقی ہماری معلومات سے یہ ایسی تقسیم ہے جو اکثر معرض تحریر میں آتی رہی ہے اور بکثرت اشخاص اُس سے مانوس (آشنا) ہیں۔ جس حد تک کہ تاریخ نتائج کے سلسلہ بیان کا نام ہے بلاشبہ یہ تقسیم کامل طور سے صحیح ہے اس میں کچھ شک نہیں کہ کسی قوم کی وہ ترقی درحقیقت ترقی ہی نہیں ہے اگر ایک طرف ان کی بڑھتی ہوئی قابلیت کے ساتھ اُن کی بداعمالی بھی بڑھ رہی ہے یا دوسری طرف وہ زیادہ نکو کار تو ہوتی ہے۔ مگر اسی کے ساتھ اُس کی جہالت بھی بڑھتی جاتی ہے۔ تمدن کے مفہوم کے لیے یہ نہایت ضروری ہے اور ترقی ذہنی کا اصلی مفہوم یہی ہے کہ اخلاقی اور عقلی دونوں تحریکیں ایک ساتھ ہوں۔

ہمارا اس پر مستعد ہونا کہ ہم اپنے فرائض ادا کریں اخلاقی حصہ ہے اور ہمارا یہ جاننا کہ ہم کس طرح اُنھیں ادا کریں عقلی حصہ ہے۔ جسقدر قریب تر یہ دونوں پیوند ہو جائیں گے اُسی قدر زیادہ موافقت (سازگاری) کے ساتھ دونوں اپنا عمل کرینگے۔ اور جس قدر زیادہ صحت کے ساتھ ذرائع حصول مقصد کے کام میں لائے جائینگے اُسی قدر زیادہ تکمیل کے ساتھ ہماری زندگی کا منشا پورا ہوگا اور اُسی قدر زیادہ استحکام کے ساتھ نسل انسانی

لہٰذا اب یہ نہایت ضروری سوال پیدا ہوتا ہے کہ ترقی ذہنی کے ان دونوں اجزا یا حصص میں کون سب سے زیادہ اہم اور کارآمد ہے۔ کیونکہ خود یہ ترقی چونکہ اُن کی متحدہ عمل کا نتیجہ ہوتی ہے لہٰذا یہ تحقیق کرنا ضروری ہو جاتا ہے کہ ان میں سے کون زیادہ قوت سے اپنا فعل کرتی ہے تاکہ ہم جزو ضعیف کو جزو غالب کے قوانین کے تحت لا سکیں۔ اگر تمدن کی ترقی اور بنی نوع انسانی کی عام خوشحالی بہ نسبت ان کی قوت عقلی کے اُن کے اخلاقی خیالات پر زیادہ مبنی ہوتی ہے تو بیشک ہم کو سوسائٹی کی ترقی کا اندازہ اُنھیں خیالات کے معیار پر کرنا چاہیئے۔ لیکن اگر برعکس اس کے وہ خاصکر اُن کے علوم عقلیہ پر مبنی ہوتی ہے تو ہم کو اُن کی عقلی سرگرمی کی کمیت اور کامیابی کو معیار ٹھہرانا چاہیئے۔

جب ہم یہ معلوم کر لیں گے کہ ان دونوں اجزا کی قوت عمل کس حد تک ہے تو ہم احقاق حق کے معمولی طریقے کو عمل میں لائیں گے۔ یعنی اُن دونوں کے متحدہ نتیجہ عمل کو دیکھکر آسانی سے سمجھ میں آجائے گا کہ یہ زیادہ قوی کارکن کے قانونی اثر کا محکوم ہے جس میں دوسرا ادنیٰ کارکن کا کمزور قانونی اثر خلل انداز ہے۔ اس تحقیقات میں پڑنے سے ہم کو ابتدائی مشکل کا سامنا کرنا پڑتا ہے یہ مشکل اس وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ جن مضامین کے بیان کرنے میں نہایت درجہ باریک بینی اور دقت نظر درکار ہوتی ہے اور جن میں سب سے زیادہ نزاکت بیان اور جچے تلے الفاظ کا استعمال ہونا چاہیے، وہاں ہم معمولی الفاظ کو بہت بے پروائی سے بے سوچے سمجھے استعمال کرتے ہیں کیونکہ ترقی اخلاقی و عقلی کے الفاظ سے ایک نہایت سخت مغالطہ کا احتمال ہوتا ہے۔ جس طور سے یہ الفاظ عموماً بولے جاتے ہیں اُس میں یہ مفہوم مضمر ہوتا ہے کہ انسانوں کے قوائے اخلاقی و عقلی تمدن کی پیشقدمی میں فطری طور پر بہ نسبت سابق کے پھر زیادہ تیز (ذکی الحس) اور زیادہ قابل اعتبار ہوتے ہیں۔ لیکن یہ بات ایسی ہے کہ چاہے سچ ہی ہو مگر کبھی ثابت نہیں کی گئی ہے۔ ممکن ہے کہ بعض اسباب طبعی سے جس پر ہماری معلومات

بھی احاطہ نہیں کر سکتی ہیں دماغ کی اوسط قابلیت (اگر ہم زمانہ کی بڑی میعادوں کا مقابلہ کریں) نسبتاً بڑھتی رہتی ہو اور اسی وجہ سے ذہن انسانی (جو بذریعہ دماغ فعل کرتا ہی) تعلیم سے آزاد ہو کر بھی قابلیت اور خیالات کی مجموعی کامیت میں ترقی کر رہا ہو مگر قوانین طبعی کے باب میں ہماری لاعلمی ایسی ہی اور ہم اس درجہ ان حالات و اسباب سے ناآشنا محض ہیں جو ان کی متوارث اُفتاد مزاج سیرت و خصلت اور دیگر مخصوصات شخصی پر حکم راں ہیں کہ ہم کو یہی سمجھنا لازم ہی کہ جس ترقی کا دعویٰ کیا جاتا ہی یہ کچھ یقینی نہیں ہی اور اپنی معلومات موجودہ پر ہم ہرگز اطمینان کے ساتھ یہ فرض نہیں کر سکتے کہ انسانوں کی اخلاقی اور عقلی قوتوں میں کوئی مستقل ترقی ہوئی ہے، نہ ہمارے پاس کوئی قطعی دلیل اس بات کے کہنے کے لیے ہی کہ جو لڑکا یورپ کے سب سے زیادہ متمدن ملک میں پیدا ہوتا ہی اُس میں وہ قوتیں فطرۃً اُس لڑکے سے زیادہ ہوتی ہیں جو کسی وحشی ملک کے سب سے زیادہ غیر متمدن مقام میں پیدا ہوتا ہی۔

پس انسانوں کی اخلاقی اور عقلی ترقی چاہے کچھ بھی ہو وہ انسان کی فطری استعداد کی ترقی پر منحصر نہیں ہی بلکہ (اگر اس کہنے میں کچھ مضائقہ نہ ہو تو) اُن موقع و محل کی ترقی میں ہی یعنی اُن حالات کی اصلاح میں ہی جن میں پیدائش کے بعد فطری استعداد جلوہ نما ہوتی ہی پس سارے مضمون کا یہی خلاصہ ہی اور واضح رہنا چاہیے کہ یہ ترقی اندرونی قوت کی وجہ سے نہیں ہی بلکہ بیرونی مفید حالات کی وجہ سے ہی جو لڑکا کسی متمدن ملک میں پیدا ہوتا ہے وہ اس حیثیت سے کہ متمدن ملک میں پیدا ہوا ہی کچھ ضرور نہیں کہ اُس لڑکے پر فائق ہو جو وحشیوں میں پیدا ہوا ہی کیونکہ جو فرق ان دونوں لڑکوں کے افعال میں ظاہر ہوتا ہی وہ (جہاں تک کہ ہم جانتے ہیں) صرف اسباب خارجی کا نتیجہ ہی۔ اسباب خارجی سے میری مراد گردوپیش کی آرا و خیالات، معلومات اور متعلقات یعنی وہ کل فضائے ذہنی ہی جس میں ان دونوں لڑکوں نے پرورش پائی ہی۔

اس بنیاد پر یہ بدیہی بات ہی کہ اگر ہم بنی نوع انسان پر بحیثیت مجموعی نظر کرینگے تو معلوم ہوگا کہ اُن کی اخلاقی اور عقلی سیرت اُن اخلاقی اور عقلی خیالات سے ہدایت پاتی ہی جو اُن کی اپنے زمانہ میں رائج اور شائع ہوتی ہی۔ حقیقت میں بہت سے لوگ ہونگے جو ان مروجہ خیالات سے بلند پائے جائینگے اور بہت ایسے ہونگے جو اُن سے کہیں پست ہونگے۔ لیکن یہ مستثنےٰ صورتیں اُس کل تعداد کے مقابلہ میں کسی شمار قطار میں نہ ہونگی جو برائی یا بھلائی میں کسی لحاظ سے ممتاز حیثیت نہیں پیدا کرسکے۔ اشخاص کی تعداد کثیر ہمیشہ متوسط حالت میں رہیگی نہ زیادہ احمق نہ بہت زیادہ قابل (فرزانہ) نہ بہت زیادہ نکوکار نہ بہت زیادہ بدکار بلکہ ایک وسط درجہ کی با امن اور معتدل حالت میں ہوگی اور جو خیالات اُس زمانہ میں پھیلے ہونگے اُن سے بغیر کسی دقت (مشکل) کے متاثر ہوگی اُسے نہ تو چھان بین سے کوئی واسطہ ہوگا نہ وہ مروجہ خیالات کے خلاف شور و شغب مچاتی ہوگی۔ نہ اُس سے عجائبات سرزد ہوتے ہونگے۔ بلکہ جس سطح پر اُسکی ہم عصر ابنائے زمانہ ہونگی اُسی پر وہ بھی کھڑی ہوگی اور جس زمانہ اور جس ملک میں وہ ہوگی اُس میں اخلاق اور علم کا جو معیار مروج ہوگا اُسی کے مطابق وہ بھی عمل کرے گی۔

اب اس بات کے جاننے کے واسطے کہ یہ معیار برابر بدلتا رہتا ہی اور یہ کہ نہایت متشابہ ملکوں میں یا ایک ہی ملک کے دو نسلوں میں بھی وہ کبھی یکساں نہیں رہتا تاریخ کی سرسری واقفیت کی ضرورت ہی۔ جو رائیں کسی وقت کسی ملک میں مقبول ہوتی ہیں وہ مختلف صدیوں سے سال بسال بدلتی رہتی ہیں۔ وہی باتیں جنھیں ایک وقت میں لوگ کفر (بدعت) وضلالت سمجھتے ہیں دوسرے وقت میں خوشی بخوشی سنجیدہ حقائق سمجھی جاتی ہیں اور پھر ایک زمانہ ایسا آجاتا ہی جب کوئی اور جدید بات اُس کی جگہ پیدا ہوجاتی ہی۔ افعال انسانی کے معمولی معیار میں جو یہ بیحد بے ثباتی ہی اس سے ظاہر ہوتا ہی کہ جن حالات پر وہ معیار مبنی ہوتا ہی وہ خود ہی نہایت بے ثبات ہونگے اور چاہے یہ حالات کچھ بھی ہوں بہرکیف وہی حالات بنی نوع انسان کی کثیر تعداد کے اخلاقی اور عقلی سیرت کے ماخذ خیال کیے جاتے ہیں۔

جس اسی مقام پر چلکر ہم کو ایک راستہ ایسی مل جاتی ہی جس پر ہم باطمینان آگے چل سکتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ افعال انسانی کا اصلی سبب نہایت تغیر پسند ہوتا ہی۔ لہذا ہم کو صرف حالات وکیفیات کے اُس مجموعہ کو اس معیار پر جانچنا ہی جو سبب سمجھے جاتے ہیں اس جانچ میں اگر ہم کو یہ معلوم ہو کہ وہ حالات وکیفیات زیادہ تغیر پسند نہیں ہیں تو ہم کو یہ نتیجہ اخذ کرنا چاہیئے کہ جس سبب کو ہم دریافت کرنے کی کوشش میں ہیں وہ سبب یہ نہیں ہی۔

جب یہ معیار اخلاقی علتوں (علل اخلاقی) یا جبلت اخلاقی کی ہدایتوں پر منطبق کیا جائیگا تو ہم کو فوراً معلوم ہو جائے گا کہ یہ علل وہدایات تمدن کی ترقی میں کس قدر کم موثر ہیں۔ کیونکہ اس میں کچھ گفتگو نہیں ہی کہ دنیا میں کسی شئی میں اتنا کم تغیر نہیں ہوا ہی جتنا ان اصول اعظم (تعلیمات) میں ہوا ہی جن سے آئین اخلاق مرکب ہیں دوسروں کے ساتھ بھلائی کرنا۔ دوسروں کی بہبودی کے لیے اپنی خواہشوں کو مٹا دینا۔ اپنے ہمسایہ کو اپنی طرح عزیز رکھنا۔ اپنے دشمنوں کو معاف کر دینا۔ اپنی جذبات وخواہشات کو روکنا والدین کی عظمت وتکریم، اپنے بالادست حاکموں کی عزت وتوقیر یہ اور اسی قسم کے اور چند امور ہیں جو اخلاق کی ضروریات میں اور ہزار ہا برس سے جانے بوجھے ہوئے ہیں یا اہل مذاہب نے اس کے متعلق جس قدر پند و نصیحت تلقین وموعظت کی، وعظ اور خطبے سنائے اور کتابیں لکھیں اُن میں سے ایک رتی ریزہ یا ایک نقطہ برابر بھی تو اضافہ نہو سکا۔

لیکن حقایق اخلاقی کی اس ایک ہی مرکز پر رکی تھمی حالت کا مقابلہ اگر ہم حقایق عقلی کی روزافزوں حالت سے کرتے ہیں تو حقیقت میں ایسا فرق نظر آتا ہی کہ حیرت ہو جاتی ہی۔ تمام وہ بڑے بڑے اخلاقی نظام جنھوں نے دنیا پر بہت کچھ اثر ڈالا ہی وہ اصل اصول میں ایک ہی تھے برخلاف اس کے تمام بڑے بڑے عقلی نظام اصل اصول ہی میں مختلف رہے۔ ہمارے اخلاقی نظام میں کوئی ایک اصول بھی جو یورپ کے سب سے زیادہ متمدن ملک میں شایع ہی ایسا نہیں ہی جو اسی طرح اگلے زمانہ والوں کو معلوم نہ ہو۔ لیکن ہمارے عقلی نظام کے بارہ میں

[illegible] کی ان سامانوں میں جن میں اگلے زمانہ والوں نے بھی کچھ بھی غور و مطالعہ کیا تھا نہایت ہی اہم اضافے کئے بلکہ مادر اس کے اُنھوں نے پرانے طریقہ تحقیقات میں عظیم تغیرات بلکہ اُسے بالکل اُلٹ پلٹ ڈالا ہے اُنھوں نے استقرار کے اُن کل سامانوں کو ایک ہی نظام اعظم میں یکجا کر دیا ہے جنھیں صرف ارسطا طالیس نے دھندلی طور سے دیکھا تھا اور اُنھوں نے وہ سائنس پیدا کئے ہیں کہ جس کا کوئی تصور بھی اگلے زمانہ کی سب سے بڑھ کے بلند خیال حکیم کے پاس نہیں پھٹکا تھا۔

ہر ایک تعلیم یافتہ کے نزدیک یہ واقعات مسلم اور معروف ہیں اور ان سے جو نتیجہ نکلتا ہے وہ بالکل بدیہی ہے۔ چونکہ تمدن نتیجہ ہے کارکنان اخلاقی و عقلی کے کارناموں کا اور وہ نتیجہ برابر ادلتا بدلتا رہتا ہے۔ پس یہ امر بدیہی ہے کہ ایسے نتیجہ کی رہبری کوئی ایسا کارکن ہرگز نہیں کرسکتا جو غیر تغیر پذیر اور اپنی جگہ پر قائم ہو۔ کیونکہ جس وقت گرد و پیش کے حالات غیر متغیر رہیں گے تو ایک قائم کارکن قائم ہی نتیجہ پیدا کریگا۔ اب دوسرا کارکن جو باقی رہا وہ عقلی ہے اور یہ بات کہ یہی کارکن اصلی محرک ہے یہ دو جداگانہ صورت سے ثابت ہو سکتا ہے۔ اولاً (جیسا ہم دیکھ چکے ہیں) چونکہ دو ہی کارکن ہیں اخلاقی اور عقلی اور (جیسا ہم دیکھ چکے ہیں) چونکہ وہ محرک کارکن اخلاقی نہیں ہے لہذا ضرور ہے کہ محرک عقلی کارکن ہو۔ ثانیاً اس لیے کہ اصول عقلی میں ایک قابلیت اور ہر حالت کے مطابق بنجانے کی استعداد ہے اور یہ استعداد (جسے ثابت کرنا میں نے اپنے ذمہ لیا ہے) اُس غیر معمولی ترقی کی توجیہ کرنے کے لیئے کافی ہے جو کئی سو برس سے مسلسل طور پر یورپ کر رہا ہے۔

یہ تو خاص وہ دلائل ہیں جن سے میری رائے کی تائید ہوتی ہے لیکن علاوہ ان کے کچھ اور بھی انھیں کے پہلو بہ پہلو حالات و اسباب بہت زیادہ قابل لحاظ ہیں۔ اول یہ کہ اصول عقلی بہ نسبت اصول اخلاقی کے نہ صرف زیادہ ترقی کن ہیں بلکہ اپنے نتائج کے لحاظ سے کہیں زیادہ پائیدار بھی ہیں۔

عقل جو فتوحات حاصل کرتی ہے وہ ہر متمدن ملک میں احتیاط کے ساتھ محفوظ رکھے جاتے
ہیں اور معروف کلیوں میں ڈھال لی جاتی ہیں اور علمی اور اصطلاحی الفاظ اس کے محافظ
ہو جاتے ہیں اور وہ آسانی سے ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہو جاتی ہیں۔ اور
اس طرح وہ ایک ایسی صورت اختیار کر لیتی ہیں جس تک ہر ایک کی رسائی ہو سکتی ہے۔ گویا وہ
ایک محسوس شکل میں آجاتی ہیں اور اکثر وہ نہایت بعید زمانہ مستقبل پر اپنا اثر ڈالتی ہیں۔
وہ بنی نوع انسان کا ارث ہیں۔ اور ان عالی دماغ محققین کی جو اُن کے بانی تھے لازوال یادگار
ہوتے ہیں۔ لیکن بخلاف اس کے ہماری اخلاقی قوتیں جن اچھے افعال کو خلق کرتی ہیں
اُن میں بہت کم میراث چل سکتی ہے۔ وہ زیادہ تر اشخاص کی شخصی خانگی زندگی سے تعلق رکھتے
ہیں پھر جن تحریکات کے سبب سے ان کا ظہور ہوتا ہے وہ عموماً نتیجہ ہوتے ہیں سیاست
نفس اور ایثار کا یہ ہر شخص کو اپنے لیے خود حاصل کرنے پڑتے ہیں اور اس طور پر چونکہ
ہر شخص اُنھیں نئے عنوان سے شروع کرتا ہے لہذا نہ تو گزشتہ تجربوں کے مقولوں سے
اُنھیں کچھ فیض پہنچتا ہے نہ وہ عمدگی کے ساتھ آینوالی اہل اخلاق کے واسطے مدون کیے
جاسکتے ہیں۔ انجام یہ ہے کہ اگرچہ اخلاقی بزرگی زیادہ ہر دلعزیز ہے اور اکثر اشخاص کے
واسطے زیادہ دلفریب بہ نسبت عقلی فضیلت کے ہوتی ہے تاہم یہ اقرار کرنا چاہیے کہ
نتایج بعیدہ کے دیکھتے ہوئے وہ بہت کم موثر بہت کم پائدار اور (جیسا میں ابھی ثابت
کرونگا) بہت کم اصلی نفع پہونچانیوالی ہے۔ حقیقت میں اگر ہم اپنی جنس کی سب سے زیادہ
کارگر خیر طلبی اور سب سے بڑی اور سب سے اعلی بغرضانہ لطف و کرم کے نتایج کی
جانچ کریں گے تو ہم کو معلوم ہوگا کہ مقابلۃً وہ نتیجے نہایت عارضی ہوتے ہیں اور بہت
قلیل تعداد اشخاص کی ان تک رسائی پاتی اور مستفید ہوتی ہے اور وہ اُس نسل کے
بعد شاذ ہی لیے باقی رہتے ہیں جس نے اُن کا آغاز دیکھا تھا۔ اور جب وہ امور رفاہ عام
کے قائم کرنے کی زیادہ پائدار صورت اختیار کرتے ہیں تو ایسے نظامات اول تو خرابیوں کا

کا شکار ہوتے ہیں پھر ان میں انحطاط شروع ہوتا ہے اور کچھ عرصہ بعد یا تو برباد ہو جاتے ہیں یا مقصد اصلی سے بہت دور جا پڑتے ہیں اور یہ گویا اس سعی کی ایک طرح تضحیک ہوتی ہے جس کے ذریعے سب سے زیادہ پاک و صاف اور سب سے بڑھ کے پُرجوش فیاضی کی یاد تازہ رکھنے کی کوشش کی گئی تھی۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ یہ نتائج بہت ناخوشگوار ہیں اور وہ خاص کر اس وجہ سے زیادہ ناگوار ہیں کہ ان کی تردید کرنا ناممکن ہے۔ کیونکہ جس قدر زیادہ ہم اس مسئلہ میں دراتے ہیں اُسی قدر زیادہ وضاحت سے ہم کو فتوحات عقلی کا تفوق فتوحات اخلاقی پر نظر آتا ہے اس بارہ میں کوئی مثال نہیں پائی جاتی کہ کسی جاہل شخص نے جس کی نیت نیک ہو اور جو اپنے مقاصد کی تکمیل کی اعلیٰ قوت بھی رکھتا ہو بھلائی سے بڑھ کے بُرائی نہ کی ہو۔ اور جہاں کہیں نیت کے ساتھ شوق و رغبت کی آمیزش ہو اور قدرت بھی وسیع تو وہاں تو برائی کی کوئی حد و نہایت ہی نہیں رہتی۔ اگر تم اُس شخص کے خلوص کو کم کر سکو یا اُس کی نیت میں کوئی آمیزش کر سکو تو تم اُن برائیوں کو بھی کم کر سکو گے جن کا وہ مرتکب ہوتا ہے۔ اگر وہ خود غرض ہو کر جاہل بھی ہے تو اکثر یہی ہو گا کہ تم اس کی برائیوں کو جہالت کا تقاضا سمجھو گے اُسے خوف دلا کے بُرائی سے باز رکھو گے لیکن اگر اُسے کچھ خوف نہیں ہے؛ اگر وہ بالکل ہی خود غرض نہیں ہے۔ یا اس کا اصلی مقصد دوسروں کی بہبودی ہے۔ اگر وہ جوش کے ساتھ بڑے پیمانہ پر اور بالکل بیغرض سرگرمی سے اس مقصد کے پیچھے پڑا ہے تو پھر تمہارے پاس اُس کی کوئی روک نہیں ہے اور تم اُن بلاؤں کو ٹالنے کا کوئی ذریعہ نہیں رکھتے جو زمانہ جہالت میں ایک جاہل آدمی کے ہاتھوں یقیناً نازل ہوتی ہیں۔ تجربہ سے اس کا جیسا کچھ کامل ثبوت ملتا ہے وہ مذہبی خونریزیوں کی تاریخ مطالعہ کرتے وقت تم کو معلوم ہو جائیگا کسی ایک شخص کو بھی اُس کے معتقدات مذہبی کی وجہ سے تعزیر دینا بیشک نہایت ہی سنگین جرم ہے۔ لیکن انسانوں کے کسی بڑے گروہ کو تعزیر دینا یا کسی پورے فرقہ

کو عقوبت میں مبتلا رکھنا یا یہ کوشش کرنا کہ وہ خیالات بیخ و بن سے نیست و نابود ہو جائیں۔ جنھوں نے اُسی سوسائٹی کی حالت سے نشو و نما پائی ہے جس میں وہ پیدا ہوئے تھے اور جو بجائے خود نفس انسانی کی حیرت انگیز شادابی (مضمون آفرینی) کے ظاہر کرنیوالی ہیں۔ یہ سب باتیں نہ صرف سب سے بڑھ کے خطرناک ہیں بلکہ ایسے بیحد سفیہانہ و احمقانہ افعال ہیں جن سے بڑھ کے تصور میں نہیں آ سکتے۔ یہ ایک واقعہ نفس الامری ہے کہ مذہبی سفاکوں کی فہرست میں سب سے بڑی تعداد نہایت ہی پاک و صاف نیت والے اور نہایت ہی قابل تعریف بے داغ اخلاق والے بزرگوں کی تھی۔ اور یہ ناممکن ہے کہ اُس کے خلاف واقع نہ ہو کیونکہ وہ لوگ کچھ بدنیت نہیں ہوتے جو یہ چاہتے ہیں کہ جن خیالات کو وہ اچھا سمجھتے ہیں اُنھیں بہرحال پھیلائیں۔ اور اُن سے بھی کم بدنیت یا برے وہ لوگ ہوتے ہیں جو اغراض دنیوی کی مطلق پروا نہیں کرتے اور اپنی تمام قوت و قدرت کے ذرائع اپنے فائدہ کے لیے نہیں بلکہ اُس مذہب کی توسیع و اشاعت میں صرف کر دیتے ہیں جسے وہ سمجھتے ہیں کہ بنی نوع انسان کی آیندہ فلاح کے واسطے ضروری ہے۔ یہ لوگ حقیقتاً برے نہیں ہوتے۔ وہ صرف جاہل ہوتے ہیں۔ حق کی ماہیت سے واقف نہیں ہوتے خود اپنے افعال کے نتائج نہیں جانتے۔ ایسی حالت میں اخلاقی مطمح نظر سے ان کی نیتیں گرفت کے قابل نہیں۔ فی الحقیقت ان کے خلوص کی آگ انھیں خونریزی (سفاکی) کے واسطے گرما دیتی ہے۔ اور ان کا جوش تقدس ہی ایک جانستان مستعدی پیدا کر دیتا ہے۔

اگر تم کسی مذہبی یا اخلاقی اصول کے سراپا محویت عقیدہ کو کسی شخص کے دلنشیں کر سکو اگر تم کسی شخص کو یہ باور کرا سکو کہ جو لوگ اُس عقیدہ کے منکر ہیں وہ دائمی عذاب کے مستوجب ہیں پھر اگر تم اُس شخص کو قوت و اختیار دیدو اور اس کی جہالت کی وجہ سے اُسے اپنے افعال کے نتائج بعید دیکھنے سے اندھا کر دو تو بالیقین وہ شخص اُن لوگوں پر جور و جفا کریگا جو اُس کے اصول کے منکر ہونگے اور اُس کا ظلم اُسی قدر

اسی نسبت سے سنگین وخفیف ہوگا جس قدر اس میں خلوص کا مادہ کم یا بیش ہی۔ اگر تم اُس کے خلوص کو گھٹادوگے تو اُس کی جور وتعدی بھی گھٹ جائے گی۔ یعنی اُس کی نیکی کے کمزور کردینے سے اُس کی جانب مخالف بدی بھی رُک جائے گی۔ یہ ایسی سچی بات ہی کہ اُس کے بارہ میں تاریخ اتنی بیحد وشمار مثالیں پیش کرتی ہی جن کا انکار کرنا نہ صرف نہایت ہی واضح اور نہایت ہی قطعی دلائل کا انکار کرنا ہی بلکہ ہر ایک عہد کی متواتر شہادتوں کا منکر ہونا ہی میں صرف دو حالتیں انتخاب کرونگا جو اپنے اسباب کے کلی تخالف کی وجہ سے از روے تمثیل بالکل ضد یک دگر ہیں کیونکہ ایک تو بت پرستی کی تاریخ سے لی گئی ہی اور دوسری مذہب عیسوی کی تاریخ سے اور یہ دونوں اِس بات کو ثابت کرتی ہیں کہ اخلاقی جذبات میں یہ قابلیت نہیں ہوتی کہ مذہبی خونریزی پر قابو پاسکیں۔

ا۔ جیساکہ بخوبی مشہور ومعروف ہی رومی بادشاہوں نے ابتدائی عیسائیوں پر جور وتعدی کی اور اگرچہ اس کے بیان میں مبالغہ کیا گیا ہی لیکن وہ کثیر الوقوع اور بہت سخت تھی۔ مگر بعض لوگوں کو جو بات بہت عجیب معلوم ہوگی یہ تھی کہ ان مظالم کے اصلی مرتکب اشخاص میں ہم ایسے لوگوں کے نام پاتے ہیں جو بہترین فرمانروا تھے اور بدترین اور نہایت ہی بدنام بادشاہ ٹھیک وہی لوگ تھے جنھوں نے عیسائیوں سے تعرض نہیں کیا اور اُن کے بڑھنے کی کچھ پروا نہ کی۔ تمام بادشاہوں میں دو سب سے بڑھ کے بیہودہ بادشاہ یقیناً کموڈوس اور الاگبلوس تھے۔ اور ان میں سے کسی نے بھی مذہب جدید پر نہ کوئی سفاکی صرف کی نہ اُن کے خلاف کوئی تدبیر عمل میں لائے وہ زمانہ مستقبل کے بارہ میں اتنے بے پروا، ایسے خود غرض اپنے مذموم عیش وعشرت میں اس قدر غرق تھے کہ اُنھیں اس کی فکر ہی نہ تھی کہ سچ کو فروغ ہو یا جھوٹ کو اور اس طور پر چونکہ وہ اپنی رعایا کی سود وبہبود سے غافل تھے لہذا اُنھیں اُس مذہب کی ترقی کی طرف مطلق کوئی التفات نہ تھی جسے بحیثیت بت پرست بادشاہ ہونے کے اُنھیں لازم تھا کہ یہ

سمجھتے کہ وہ ایک مہلک و ملحدانہ ضلالت ہی لہذا انھوں مذہب عیسوی کو اپنی حالت پر چھوڑ دیا اور اُن قوانین تعزیری سے اُس کا تعرض نہ کیا جنھیں زیادہ دیندار لیکن زیادہ برسرِ خطا فرمانروا یقیناً نافذ کرتے۔ اسی بنا پر مذہب عیسوی کا بڑا دشمن مارکس آریلیس تھا جو نیک سرشت، نڈر اور نہایت صداقت شعار شخص تھا مگر اُس کا عہد حکومت ایسی خونریزی سے یادگار ہو گیا کہ اگر وہ اپنی آبائی مذہب میں کم پرجوش ہوتا تو اس سے ضرور باز رہتا۔ اس دلیل کی تکمیل کے واسطے یہ بھی کہا جا سکتا ہی کہ مذہب عیسوی کا سب سے آخری اور سب سے بڑھ کے سرگرم مخالف جو قیاصرۂ روم کے تخت پر متمکن ہوا وہ جولین تھا اور یہ ایک فرمانروا تھا کہ جو عدل و راستی میں ممتاز تھا۔ جس کے خیالات پر تو اکثر اعتراضات کیے جاتے ہیں لیکن جس کی اخلاقی سیرت کے بارہ میں خود افترا پردازی کو بھی بدگمانی کا موقع نہیں مل سکتا۔

۲۔ دوسری مثال اسپین نے مہیا کی ہی۔ یہ ایسا ملک ہی جس کی بابت اس کا اعتراف کرنا چاہیے کہ مذہبی خیالات نے معاملات انسانی پر جیسا وہاں قابو پا لیا تھا ایسا کسی اور ملک میں نہیں پایا۔ یورپ کی کوئی قوم ایسی نہیں ہی جس میں اتنے سرگرم اور بےغرض مشنری (داعی) اتنے پرجوش اور بےنفس شہید ہوئے ہوں جنھوں نے خوشی خوشی اپنی جانیں ان حقایق کے واسطے نذر کر دیں جن کی اشاعت وہ ضرور سمجھتے تھے۔ کسی مقام پر اہل باطن کے گروہ اتنی مدت مدید تک عروج پر اور عوام الناس اس قدر اطاعت گزار، اگرجا گھر ایسے بھرے بھرے اور اہل کلیسا اتنی کثرت سے نہیں ہوے لیکن جس صدق نیت اور خلوص عزیمت کے لیے اہل اسپین ہمیشہ (بحیثیت مجموعی) مشہور رہے ہیں وہ نہ صرف مذہبی خونریزی کو نہ روک سکی بلکہ اور اُس کی مستقل ذریعہ بنی۔ اگر قوم زیادہ جادۂ اعتدال پر ہوتی تو وہ زیادہ متحمل بھی ہوتی۔ مگر چونکہ اُس میں بقاے دنیا کا خیال سب پر مقدم تھا اور ایک ایک مقصد کے لیے وہ ہر شے فدا کر دینے کے لیے تیار تھی لہذا قدرتی طور پر یہ واقع ہوا کہ

نشو و نما پائی - اس وحشیانہ احتساب مذہبی کے حمایتی حضرات کچھ فریبی مکار نہ تھے
بلکہ پرجوش دیندار لوگ تھے - کیونکہ جو فریبی مکار لوگ ہوتے ہیں ان میں اتنا کس بل نہیں
نہیں ہوتا کہ ظلم کرسکیں - ظلم تو ایک سخت اور درشت جذبہ ہے اور مکاری ایک خوشامدانہ
اور لوچدار ہنر ہے کہ جو خود بخود جذبات انسانی کے مطابق ہر رنگ اختیار کر لیتا اور
اپنے اغراض حاصل کرنے کے لیے لوگوں کی کمزوری کی ثنا و صفت کرتا ہے -

اسپین میں چونکہ قوم کی صداقت شعاری صرف ایک معاملہ میں مجتمع ہو گئی تھی اسلیے
ہر چیز اس کے سامنے ہیچ اور پوچ تھی - اور چونکہ کفر و ارتداد سے نفرت کی عادت
پڑ گئی تھی اس لیے کفر و ارتداد کا نیست و نابود کرو نیا ایک فریضہ خیال کر لیا گیا تھا -
جس سچے خوشش اور سرگرمی کے ساتھ یہ فریضہ پورا کیا گیا اُس کا حال کلیسیائے اسپین
کی تاریخ میں معلوم ہو سکتا ہے - اس میں کچھ شک نہیں کہ (عدالت مذہبی کے) تفتیش کنندہ
دیانت، بے لوثی اور بے طمعی میں اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے اور اُن کی صداقت و دیانت
مختلف اور متعدد ذرائع شہادت سے قطعی طور پر ثابت کی جا سکتی ہے - لیکن وہ شہادتیں
ایسی ہیں جن کو ہم قلم انداز نہیں کر سکتا کیونکہ اُن کے گرد و پیش کے حالات ایسے ہیں
کہ اُن کی وجہ سے وہ بے چون و چرا قابل تسلیم ہیں - للارنٹی جو احتساب مذہبی کا بڑا
مورخ اور اُس کا سخت دشمن تھا اُس کی دسترس وہاں کے کاغذات مخفی تک ہو گئے
تھے لیکن باوجودیکہ اُسے واقفیت کا کامل ترین ذریعہ ہاتھ لگ گیا تھا وہ تفتیش کنندوں کی
سیرت اخلاقی پر ایک بھی الزام قائم نہ کر سکا اور گو وہ ان کے ظالمانہ طرز عمل کو سخت
قابل الزام قرار دیتا ہے مگر اُن کی صفائی نیت کا انکار نہیں کرتا - اس سے تیس برس
پیشتر ٹاونسنڈ نے جو کلیسیائے انگلستان کا ایک پادری تھا اسپین پر اپنی گرانبہا
کتاب شائع کی تھی اور اگرچہ بحیثیت ایک پروٹسٹنٹ اور کلیسیائے انگلستان کے

پیرو کے اس امر کی قوی وجہ بھی کہ جس فسیح کارروائی کا اُس نے تذکرہ کیا تھا اُس کے خلاف تعصب اس میں ضرور ہونا چاہیے لیکن اُس نے بھی کوئی الزام اُن لوگوں پر قائم نہیں کیا جو اس کارروائی کو کر رہے تھے بلکہ جس موقع پر اُس نے اس کارروائی کے بمقام برسلونا (جہاں کہ سب سے بڑھ کے اہم شاخ قائم ہوئی تھی) منعقد ہونے کا تذکرہ کیا ہی وہاں اُس نے یہ عجیب اعتراف کیا ہی کہ اُس کے جملہ ارکان ذی لیاقت ہیں اور اُن میں سے اکثر ہمدردی اور انسانیت میں ممتاز ہیں۔

یہ واقعات جو حیرت انگیز ہیں شہادت کے اُس عظیم ذخیرے کا ایک جزو ہیں جو تاریخ میں موجود ہی اور جو قطعی طور پر یہ ثابت کرتی ہی کہ اخلاقی جذبات میں اس کی ذرا صلاحیت نہیں کہ مذہبی خونریزی کو کم کر سکیں۔ البتہ جس طرح صرف عقلی اکتسابات کی ترقی سے واقعی طور پر مذہبی خونریزی کم ہوئی اُسے میں اس جلد کے ایک اور حصہ میں دکھاؤنگا اور وہیں پر ہم یہ دیکھینگے کہ ناروا داری کا بڑا حریف اخلاق نہیں ہی بلکہ علم ہی۔ صرف علم ہی کی نشر و اشاعت کا یہ ظہور ہی کہ وہ سب سے بڑی تباہی جو انسان اپنی بنی نوع پر نازل کرتا ہی نسبتاً کم ہو گئی ہی۔ کیونکہ یہ بات کہ مذہبی خونریزی ہر ایک خرابی و بربادی سے بڑھ کے ہی یہ کچھ اُن مقتولین کی کثیر اور بیشمار تعداد سے زیادہ واضح نہیں ہوتی ہی جن کا حال ہمیں معلوم ہی بلکہ اُن لاتعداد مظلوموں سے اندازہ ہوتا ہی جن کا حال تاریخ میں درج نہیں ہی اور جن کے جسم اس لیے چھوڑ دئے گئے تھے کہ انھیں قلبی اور روحانی صدمات پہنچائے جائیں۔ ہم شہیدوں اور اعتراف کرنے والوں کے بہت سے حالات سنتے ہیں۔ جو یا تلوار سے مارے یا آگ میں جلائے گئے تھے لیکن ہم اُن سے بھی زیادہ تعداد اشخاص کے حالات بہت کم جانتے ہیں جو محض خونریزی کی دھمکی سے اس پر مجبور کئے گئے تھے کہ اپنے اصلی خیالات کو بظاہر ترک کر دیں اور جنھوں نے ایسے ارتداد پر مجبور ہو کے جس سے دل نفرت و کراہت کرتا ہی عمر بھر ایک متواتر اور ذلیل

... شامت و ریاکاری ہی۔ کیونکہ ہر
جو انسان اپنے خیالات پر نقاب ڈالنے (چھپانے) میں مجبور ہوتا ہی تو اُن میں ایک
یہ عادت پیدا ہو جاتی ہی کہ محض کذب و دروغ کے ذریعہ سے حفاظت حاصل کریں اور
محض دھوکے اور فریب سے اپنے تئیں مامون و مصئون بنائیں۔ اسی طرح فریب ایک لازمہ زندگی
ہو جاتا ہی ریاکاری روزمرہ کی عادت بنجاتی ہی۔ خیالات جمہور کی پوری لے بگڑ جاتی ہی
اور بدکاری و غلط کاری کی تعداد اندیشہ ناک طور پر بڑھ جاتی ہی۔ پس یقیناً ہم کو یہ
کہنے کا حق ہی کہ اس کے مقابلہ میں اور کل جرائم و معاصی بے حقیقت ہیں اور ہم کو اُن مشاغل
عقلی کی ترقی کا ممنون ہونا چاہیے جس نے اُس خرابی کا استیصال کیا جسے ہم میں سے
بعض اب بھی بخوشی جاری رکھنا گوارا کریں گے۔

میں جس اصول کی حمایت کر رہا ہوں وہ بطور ایک نظریہ کے اور نیز عملدر آمد کے لحاظ
سے اس درجہ اہم ہی کہ میں اس کی ایک مثال اور بھی دونگا کہ وہ کس جوش کے ساتھ
اپنا عمل کرتا ہی۔ نوع انسانی کے لیے دوسری سب سے بڑھ کے خرابی و بربادی جس سے
(باستثنار مذہبی خونریزی کے) سب سے زیادہ مصائب نازل ہوا کی ہیں بیشک
جنگ و جدل ہی۔ جس شخص نے تاریخ یورپ کا مطالعہ محض سرسری طور سے بھی کیا ہی اُسے
بھی یہ بات صاف طور سے نظر آجائے گی کہ سوسائٹی کی ترقی کی وجہ سے جنگ کا وحشیانہ
فعل بتدریج گھٹ رہا ہی۔ اگر ہم ایک ملک کا مقابلہ دوسرے ملک سے کرینگے تو ہم کو
معلوم ہوگا کہ مدت مدید سے لڑائیاں بہت کم واقع ہوتی ہیں اور اب تو یہ جنگ و جدل
کی کمی کا خیال ایسا روشن و مبرہن ہی کہ ابھی چندروز اُدھر جو بازار جدال و قتال
گرم ہوا تھا اُس سے پیشتر قریب چالیس برس تک ہم لوگ بالکل صلح و آشتی
میں رہے تھے۔ اور یہ ایسا واقعہ ہی جس کی کوئی نظیر نہ صرف ہمارے ملک میں بلکہ کسی
ایسے ملک کی تاریخ میں نہیں جو معاملات عام میں ممتاز طور سے حصہ لیتا ہی۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس بڑے نتیجہ کے پیدا کرنے میں ہمارے اخلاقی خیالات نے کیا حصہ لیا۔ اور اگر اس سوال کا جواب پہلے سے دل میں جمے ہوئے خیالات کے بنا پر نہ دیا جائے بلکہ جو شہادت ہمارے پاس موجود ہے اُس کی رو سے دیا جائے تو یقیناً یہی کہنا پڑیگا کہ ان خیالات کو اس میں کچھ بھی دخل نہ تھا۔ کیونکہ اس کا تو ہرگز دعویٰ نہیں ہو سکتا۔ کہ اب کے زمانہ والوں نے جنگ وجدل کی اخلاقی خرابیوں کی بابتہ جدید انکشافات کیے ہیں۔ اس معاملہ میں بالفعل کوئی ایسی بات معلوم نہیں ہوئی ہے جو کئی سو برسوں سے معلوم نہ تھی۔ اس معاملہ میں اہل اخلاق جو کچھ تلقین کرسکتے ہیں وہ صرف یہ دو اصول ہیں یعنی اپنی تحفظ کی غرض سے جو جنگیں برپا کی جاتی ہیں وہ بجا ہوتی ہیں اور ملک گیری کے واسطے جو لڑائیاں لڑی جاتی ہیں وہ بیجا ہوتی ہیں۔ یہ دو اصول ایسے ہیں جو قرون متوسط میں جبکہ کوئی ہفتہ جنگ و پیکار سے خالی نہیں گزرتا تھا اُتنے ہی صاف صاف بیان کیے گئے اُسی قدر بخوبی سمجھے بوجھے اور اُسی طرح عالمگیر طور سے مسلّم تھے جتنے اور جیسے وہ اب ہیں جبکہ لڑائی کی نوبت اتفاقی اور شاذ طور سے آتی ہے اس وقت سے لڑائی کی بابتہ لوگوں کے افعال بتدریج متغیر ہو رہے ہیں حالانکہ اُن کا اخلاقی علم اُن کی بابتہ متغیر نہیں ہو رہا ہے۔ تو اس سے یہ بالکل بدیہی بات ہے کہ متغیر نتیجہ کسی طرح ایک غیر متغیر سبب سے پیدا نہیں ہوا ہے۔ یہ ایسی قطعی دلیل ہے کہ اس سے بڑھ کے کوئی قطعی دلیل خیال میں آ نہیں سکتی۔ اگر یہ ثابت کیا جاسکے کہ گزشتہ ہزار برس کے اندر اہل اخلاق یا اہل مذاہب نے جنگ و جدل کی کوئی ایک خرابی بھی ایسی دکھائی یا بتائی ہے جس کا وجود اُن کے متقدمین کے علم میں نہ تھا تو میں اُس رائے سے دست بردار ہو جاؤنگا جس کے واسطے میں اتنا اصرار کر رہا ہوں۔ لیکن (جیسا میں نہایت ہی اطمینان سے دعویٰ کر رہا ہوں) اگر یہ بات ثابت نہیں ہوسکتی تو پھر یہ ماننا پڑیگا کہ جب اخلاق کے خزانہ میں اس بحث پر کوئی اضافہ نہیں کیا گیا ہے تو اخلاق سے جو نتیجے پیدا ہوتے ہیں اُن میں بھی کوئی اضافہ نہیں کیا جاسکتا ہوگا۔

یہاں تک تو میں نے اس اثر کا ذکر کیا ہے جو اخلاقی خیالات نے جنگ سے تنفر پیدا کرنے کے متعلق ہمارے دلوں پر کیا ہے لیکن جب ہم اُس کے مقابلہ میں عقل انسانی کی طرف مڑتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ اس کی ہر ترقی جوش جنگ و جدل کے لیے ایک ضرب مہلک ثابت ہوئی ہے اس کا پورا ثبوت میں آگے چلکے اچھی طوالت کے ساتھ بہ تفصیل پیش کرونگا اور اس مقدمۃ الکتاب میں میں صرف اتنا کرونگا کہ اُن نہایت ہی نمایاں امور میں سے چند پیش کرونگا جو تاریخ کے سطح پر ہونے کی وجہ سے فوراً سمجھ میں آجائیں گے۔

ان امور میں سے ایک سب سے کھلا ہوا یہ ہے کہ علم میں ہر ایک مفید اضافہ گروہ عقلا کی قوت اس طور سے بڑھا دیتا ہے کہ جن آلات سے وہ کام لیتے ہیں وہ بڑھ جاتے ہیں۔ اب گروہ عقلا اور فوجی جماعتوں میں جو مخالفت ہے وہ کھلی ہوئی ہے خیال اور عمل کے۔ داخلی اور خارجی کی دلیل اور جبر کی نصیحت اور قوت کی مخالفت ہے یا خلاصہ کلام یہ ہے کہ وہ لوگ جو با امن و فنیات مشاغل میں زندگی بسر کرتے ہیں اور وہ لوگ جو جنگ و جدل کا پیشہ کرتے ہیں ان دونوں کی مخالفت ہے۔ پس جو بات ان میں سے ایک گروہ کے حق میں مفید ہے وہ بداہتاً دوسرے گروہ کے حق میں مُضر ہے۔ اب اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ بقیہ حالات و اسباب یکساں رہیں تو ضرور ہے کہ جس قدر کسی قوم کے عقلی فتوحات بڑھتے رہیں اُسی قدر اُن کا شوق جنگ و پیکار گھٹتا جائے اور اگر اُن کی عقلی فتوحات بہت ہی کم ہوں تو اُن کا شوق جنگ و جدال بہت ہی زیادہ ہو۔ جو ملک پوری طرح وحشی ہیں اُن میں عقلی ترقی ہوتی ہی نہیں اور چونکہ وہاں نفس انسانی بالکل سادہ اور صاف ہوتا ہے لہذا اس کی قوت خارجی جوشش اور اس کی بڑی صفت ذاتی جراُت و شجاعت ہوتی ہے۔ وہاں جس شخص نے اپنے حریف کو مار نہیں ڈالا ہے وہ کسی شمار قطار ہی میں نہیں ہے اور جتنے زیادہ آدمیوں کا وہ خون کرتا ہے اُتنی ہی زیادہ اُس کی ناموری ہوتی ہے۔ یہ بالکل ہی وحشیانہ حالت ہے اور یہ وہ حالت ہے جسمیں فوجی ناموری کی بڑی قدر ہوتی ہے اور جنگی آدمیوں کی بڑی عزت کی جاتی ہے۔ ان خوفناک

ذلت سے تمدن کی اعلیٰ منزل تک ایک سلسلہ طویل تدریجی مراتب کا ہے اور یہ ایسے زینے ہیں کہ ان میں سے ہر درجہ میں قوت کا زور گھٹتا اور عقل کا زور بڑھتا جاتا ہے اور عقلی اور صلح جو گروہ آہستہ آہستہ ایک ایک کرکے بلند ہوتے ہیں۔ پہلے تو جنگجو لوگ اُنھیں نہایت نفرت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں لیکن وہ رفتہ رفتہ قدم جاتے ہیں تعداد اور قوت میں بتدریج بڑھتے جاتے ہیں اور اپنی ہر ترقی میں اُس اگلے جوشِ نبرد آزمائی کو دھیما کرتے جاتے ہیں جس میں بیشتر اور کل رجحانات ڈوبے ہوئے تھے۔ سوداگری، تجارت، صنعت و حرفت قانون حکمت علی ادب دانش علوم تجربیہ، فلسفہ ابتدا میں بالکل نامعلوم تھے جداگانہ علوم میں تربیت دی جاتی ہے۔ ہر ایک مطالعہ کے لیے ایک گروہ قائم ہوتے ہیں اور ہر ایک گروہ اپنے مشغلہ کی سودمندی اور اہمیت کے لام باندھتا ہے۔ بیشک ان گروہوں میں سے بعض بہ نسبت بعض کے کم صلح جو ہیں لیکن جو سب سے کم صلح جو ہیں وہ بھی کچھ شک نہیں کہ اُن لوگوں کی بہ نسبت کہیں زیادہ آشتی پسند ہیں جن کے متعلقات و رجحانات سراسر فوجی ہیں۔ اور جوہر جدید جنگ میں ذاتی عروج و سربلندی کا ایسا موقع دیکھتے ہیں کہ جس سے زمانہ صلح میں وہ بالکل محروم رہ جاتے ہیں۔

اسی طور سے جس قدر تمدن بڑھتا ہے ایک توازن قائم ہوجاتا ہے اور جنگی جوش و خروش اُن خیالات سے معتدل (دھیمی) ہوتے جاتے ہیں جو متمدن لوگوں کے سوا اور کسی کے دل میں بھی نہیں آسکتے۔ لیکن ایسے لوگ جن کی عقل نے نشوونما نہیں پائی ہے ان میں اس قسم کا اعتدال کبھی موجود ہو ہی نہیں سکتا۔ اس کی ایک عمدہ مثال موجودہ جنگ کی تاریخ میں ملتی ہے۔ کیونکہ جس محاربہ عظیم میں ہم لوگ مصروف ہیں اُس کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ متمدن ملکوں کے متعارض اغراض و مقاصد کی وجہ سے پیدا نہیں ہوئی تھی بلکہ روس اور ٹرکی کے درمیان ایک عناد نے اسے پیدا کیا اور یہ سلطنتیں یورپ میں سب سے بڑھ کے وحشی ہیں یہ نہایت قابل لحاظ واقعہ ہے۔ سوسائٹی کی اصلی حالت کی یہ خاص نشان اس لڑائی

... اس طرح سے

زمانہ میں متمدن قوموں کے ہاتوں پڑا کرتا تھا بلکہ یہ اختلال یوں واقع ہوا کہ غیر متمدن روسیوں نے اپنے سے بھی زیادہ غیر متمدن ترکوں پر یورش کی۔ اس سے کچھ پیشتر زمانہ میں عقلی اور (اسی وجہ سے) صلح جو عادتوں کا اثر برابر بڑھ رہا تھا لیکن پھر بھی نہایت ترقی یافتہ ملکوں میں وہ اتنا کمزور تھا کہ اگلے جنگجوئی کی عادت کو قابو میں نہیں لاسکتا تھا یہی وجہ تھی کہ فتوحات کی ایک خواہش پیدا ہوئی جو اکثر اور تمام خیالات پر غالب آجاتی اور فرانس وانگلستان جیسی بڑی قوموں کو چھوٹے چھوٹے حیلوں پر (ذرا ذرا سی بات پر) ایک دوسرے پر حملہ کرنے اور اسباب کے موقع تلاش کرنے پر مائل کرتی تھی کہ اپنے ہمسایہ کی خوشحالی اور فلاح دیکھکے دونوں میں جو نفرت اور ضرر رسانی کا شوق پیدا ہوتا تھا اُس کے بخار اس نکالے۔ بہرکیف معاملات کی ترقی کا یہ حال ہی کہ ان دونوں قوموں نے اپنے رنجدہ اور فساد انگیز رشک وحسد کو بالائے طاق رکھکے ایک غرض مشترک کے واسطے اتحاد کر لیا ہی اور کسی خود غرضی پر نہیں بلکہ متمدن دنیا کو ایک وحشی حریف کے حملہ آوری سے محفوظ رکھنے کے واسطے تلوار میان سے نکال لی ہی۔

یہ ایک نمایاں خصوصیت ہی جو موجودہ جنگ کو گزشتہ جنگوں سے ممتاز کر رہی ہی یہ بات کہ چالیس برس تک امن وامان قائم رہے اور پھر اس میں (مثل سابق) متمدن ملکوں کے مناقشات سے خلل نہ پڑے بلکہ اُسی سلطنت کی حوصلہ مندیوں سے خلل پڑے جو ایک ہی وقت میں زوردار بھی ہی اور غیر متمدن بھی یہ ایک ثبوت منجملہ دیگر شہادتوں کے ہی کہ جنگ وجدل سے نفرت ایک تربیت یافتہ مذاق ہی جو عقلمندوں کے واسطے مخصوص ہی کیونکہ کوئی شخص بھی اس کا مدعی نہ ہوگا کہ روس کی جنگی عزیمتیں اس کی ادنیٰ اخلاقی حالت یا فرائض مذہبی سے غفلت نے پیدا کی ہیں۔ یہ ہرگز نہیں ہی۔ بلکہ ہمارے پاس جو کچھ شہادت ہی وہ ثابت کرتی ہی کہ فرانس یا انگلستان کی بہ نسبت روس میں

بداطواریاں کچھ زیادہ رواج نہیں پاتی ہیں اور یہ یقینی ہو کہ کلیسیا کی تعلیم و تلقین کو روسی لوگ اپنے متمدن حریفوں کی نسبت زیادہ رضا و تسلیم کے ساتھ مانتے ہیں پس۔ یہ واضح ہو کہ روس ایک جنگجو ملک ہو۔ نہ اس لیے کہ اس کے باشندے بداخلاق ہیں بلکہ اسلیے کہ وہ بے عقل ہیں۔ جو کچھ خطا ہو دماغ کی ہو دل کی نہیں اور روس میں چونکہ قومی عقل کی بہت کم نشو و نما ہوئی ہو لہذا عقلی گروہوں کو اثر و اقتدار حاصل نہیں اور اس لیے جنگی گروہ غالب ہو۔ سوسائٹی کی اس ابتدائی حالت میں فی الحال کوئی طبقہ متوسط نہیں ہو اور اس وجہ سے غور و فکر صلح جوئی کی عادتیں جو طبقہ متوسط سے پیدا ہوتی ہیں اُن کا کہیں وجود نہیں ہو۔ نفوس انسانی مشاغل ذہنی سے محروم ہو کے قدرتی طور پر جنگی شغلوں کی طرف متوجہ ہوجاتی ہو کیونکہ اُن کے واسطے ایک یہی سامان باقی رہ جاتا ہو۔ اسی کا یہ نتیجہ ہو کہ روس میں کل قابلیت و لیاقت محض ایک فوجی معیار پر جانچی جاتی ہو۔ ملک کی سب سے بڑھ کے عظمت و شان فوج میں سمجھی جاتی ہو۔ ایک لڑائی کا جیتنا یا ایک غنیم کو شکست دینا زندگی کے سب سے عمدہ فتوحات میں شمار ہوتا ہو اور یہ وحشی لوگ ملکی خدمات والوں (عہدہ داران ملکی) کو چاہے ان میں کیسی کچھ صفات اور خوبیاں کیوں نہ ہوں اس طرح نفرت سے دیکھتے ہیں کہ گویا وہ بالکل ادنیٰ اور پست درجہ کے لوگ ہیں۔

برخلاف اس کے انگلستان میں اس کے مقابل اسباب نے مقابل نتائج پیدا کیے ہیں۔ ہم لوگوں میں عقلی ترقی ایسی سریع (تیز رفتار) اور طبقہ متوسط کا زور اس قدر زیادہ ہو کہ نہ صرف یہ بات ہو کہ ملک کی سلطنت میں فوجی لوگوں کا کچھ دخل نہیں بلکہ ایک وقت میں تو یہ اندیشہ تھا کہ کہیں یہ رجحان انتہا کو نہ پہنچ جائے اور کہیں ہم لوگ جنگ و پیکار سے اپنے تنفر کے سبب سے ان تحفظ کی احتیاطوں سے نہ غافل ہوجائیں جو دوسری قوموں کی عداوت کے سبب عمل میں لانا ضروری ہیں۔ لیکن کم از کم اتنا تو ہم بے خوف کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے ملک میں جنگ و جدل کا شوق ایک مذاق قومی کی حیثیت سے کلیۃً معدوم ہو۔

اور یہ نتیجہ اعظم نہ تو اخلاقی تعلیمات سے حاصل ہوا ہے نہ جذبات اخلاقی کی ہدایت سے بلکہ صرف اس بات سے کہ تمدن کی پیشقدمی میں سوسائٹی کی کچھ جماعتیں ایسی بن گئی ہیں جو صلح و آشتی کے بقا و قیام میں کچھ غرض رکھتی ہیں اور جن کا متحد زور اُن جماعتوں کو قابو میں رکھنے کے واسطے کافی ہے جن کے اغراض جنگ و جدل کے برپا رہنے سے وابستہ ہیں۔

اس دلیل کا آگے بڑھانا اور یہ ثابت کرنا آسان ہے کہ مشاغل عقلی کے بڑھتے ہوئے شوق سے فوجی خدمت نہ صرف ناموری میں بلکہ قابلیت میں بھی ضروری طور سے زوال پذیر ہو جاتی ہے سوسائٹی کی بچھڑی ہوئی حالت میں ممتاز قابلیتوں والے اشخاص فوج کی طرف ٹوٹ پڑتے اور فوجی رشتہ میں نام لکھا کے فخر کرتے ہیں۔ لیکن جیسی جیسی سوسائٹی ترقی کرتی ہے کام کی نئی راہیں نکل سکتی اور نئے نئے کاروبار پیدا ہوتے جاتے ہیں اور چونکہ یہ کاروبار اصل و حقیقت میں ذہنی ہوتی ہیں اس لیے ذکاوت طبعی کے لیے جلد تر کامیابی کے ایسے موقع ملتے ہیں کہ جو پہلے کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھے۔ انجام یہ ہے کہ انگلستان میں جہاں اور ملکوں کی بہ نسبت ایسے مواقع زیادہ ہیں قریب قریب ہمیشہ یہی ہوتا ہے کہ اگر کسی باپ کے گھر میں ایسا بیٹا ہوتا ہے جس کے قوائے ذہنی ممتاز طور کے ہوتے ہیں تو وہ اُسے علمی مشاغل میں سے کسی ایسے شغل میں مصروف کر دیتا ہے جس میں عقل محنت سے مل کر یقینی بہت اچھا ثمرہ پیدا کریگی۔ اب اگر لڑکے کی کم لیاقتی ظاہر ہے تو اُس کے لیے مناسب تدبیر موجود ہے۔ وہ یا تو سپاہی بنا لیا جاتا ہے یا پادری۔ یا وہ فوج میں بھیج دیا جاتا ہے یا کلیسا میں معتکف کر دیا جاتا ہے۔ اور (جیسا ہم آگے چلکے دیکھ لیں گے) یہ منجملہ اُن وجوہ کے ایک وجہ اس کی ہے کہ سوسائٹی ترقی کے ساتھ مذہبی اور فوجی جوش میں زوال آجاتا ہے۔ جب سر برآوردہ لوگ کسی پیشہ میں داخل ہونے سے بیزار (ناراضمند) ہونے لگینگے تو اُس پیشہ کی شان ضرور گھٹے گی۔ پہلے تو اُس کی ناموری کم ہوگی پھر اُس کا زور ٹوٹ جائیگا یہی راستہ ہے جس میں سے یورپ کلیسا اور فوج دونوں کے لحاظ سے واقعی گزر رہا ہے۔

... کی بابت کی شہادت اس تصنیف کے ایک اور
حصہ میں ملے گی۔ اور جہانتک کہ فوجی پیشہ کو علاقہ ہے اس کی شہادت بھی ویسی ہی قطعی ہے کیونکہ اگرچہ زمانہ حال کے یورپ نے ہر پیشہ میں چند اشخاص ایسے پیدا کیے ہیں جن کی ذکاوت طبعی میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے لیکن اُن کی تعداد اتنی کم ہے کہ ہم لوگ اس پر حیرت زدہ ہوتے ہیں کہ اصلی قابلیت کس قدر نایاب ہوگئی ہے۔ اگر ہم زمانہ کی بڑی میعادوں کا مقابلہ کرینگے تو اور بھی واضح طور سے یہ معلوم ہوگا کہ بحیثیت مجموعی فوجی جماعت میں انحطاط پیدا ہو رہا ہے۔ دنیائے قدیم میں جو لوگ سربرآوردہ نبرد آزما ہوتے تھے اُن میں نہ صرف اچھے خاصے کمالات ہوتے تھے بلکہ وہ لوگ سیاست ملکی و فوجی دونوں میں بہت کامل بصیرت رکھنے والے اور ہر حیثیت سے اپنے زمانہ کے اول درجہ کے لوگ ہوتے تھے۔ مثلاً اگر ایک ہی قوم سے کچھ نمونے چھانٹے جائیں تو یونان نے جو تین سب سے بڑھ کے کامیاب مدبران ملک پیدا کیے وہ سولن، تھمسٹاکلیز اور ایپی منڈاس تھے۔ اور یہ تینوں نہایت ممتاز فوجی سپہ سالار تھے۔ سقراط جس کو بعض لوگ اگلوں میں سب سے بڑھ کے عاقل سمجھتے ہیں وہ بھی ایک سپاہی تھا۔ یہی حال افلاطون کا تھا اور یہی حال تھا اینٹی استھنیز کا جو فرقہ سنک کا مشہور بانی تھا۔ ارکیٹاس جس نے فلسفہ فیثاغورث کے لیے نیا راستہ پیدا کیا اور ملیسوس جس نے الیاٹک فلسفہ کو ترقی دی یہ دونوں نامور جنرل تھے اور علوم و فنون اور حرب و جنگ دونوں میں مشہور زمانہ تھے نہایت سربرآوردہ فصحا میں پرکلیز، الکیباڈیز، انڈوسائڈیز ڈماستھنیز اور الیسچالیسر سب صیغہ جنگی کے ارکین تھے اور یہی حال تھا اُن دونوں بڑے طریقو دیا لکھنے والوں (فسانہ نگاران غم) یعنی الیسچالیز اور سافوکلیز کا۔ آرکلیلوکس جس کی بابتہ یہ کہا جاتا ہے کہ فن شعر میں اس نے ایک نئی بحر ایجاد کی اور جسے ہوریس قابل تقلید سمجھتا ہے ایک سپاہی تھا اور اس طرح ہی پیشہ سپہگری طرطوث پر جو شاعری کے صنف مرثیہ گوئی کے موجدوں میں تھا اور الکیوث پر جو نظم نغمہ و سرود کے نہایت عمدہ ناظموں میں تھا فخر کر سکتا ہے۔ یونان کے مورخین میں

... زینوفن اور پولی بیس کے

ساتھ اعلیٰ فوجی خدمت پر سرفراز تھا اور متعدد موقعوں پر جنگ کا پانسہ پلٹ دینے میں کامیاب ہوا باوجود جنگی کشمکشوں اور لڑائی کے مخمصوں کے ان مشاہیر ملک نے اپنے نفوس کی تہذیب و ترقی اُس اعلیٰ مرتبہ تک کی جتنی اُس عصر کے علم سے ممکن تھی۔ اور اُن کے خیالات کا دائرہ اتنا وسیع اور ان کے طرز بیان کا حسن اور شکوہ ایسا عالی ہے کہ ان کی تصانیف کو ایسے ہزاروں آدمی پڑھتے ہیں جن کو اُن جنگوں اور محاصروں سے مطلق بحث نہیں جس میں وہ لوگ مصروف تھے۔

یہی لوگ دنیائے قدیم میں فوجی صیغے کے درخشندہ جوہروں میں تھے اور ان سب نے ایک ہی زبان میں کتابیں لکھیں اور ایک ہی قوم نے اُن کی تصنیفات کو پڑھا۔ لیکن دنیائے حال میں فوجی صیغہ نے جس میں لاکھوں اشخاص ہو گزرے ہیں اور جس میں پورا براعظم یورپ شامل ہے سولہوں صدی سے لیکے ابتک ایسے دس مصنف بھی نہ پیدا کئے جو لکھنے والوں یا غور و فکر کرنے والوں میں اول درجہ پر شمار ہو سکتے۔ ڈیکارٹ ہی صرف یورپ کا ایسا سپاہی گزرا ہے جس میں دونوں کمال جمع تھے۔ وہی ایسا تھا جو اپنے طرز بیان کے نرالے حُسن کے ساتھ اپنی تحقیق کی دقت اور جدت کے لحاظ سے یگانہ تھا۔ بس یہی ایک مثال ہے اور بس میرے نزدیک تو اُس کا اور کوئی ثانی زمانہ حال کا فوجی مصنف ایسا نہیں ہے جو دونوں شعبوں میں اوج کمال پر پہنچا ہو۔ بیشک گزشتہ ڈھائی سو برس کے اندر تاریخ انگلستان میں اس کی کوئی نظیر تو ملتی نہیں اور اُس میں صرف دو مصنف ریلیؔ اور نیپیرؔ البتہ ایسے گزرے ہیں جن کی تصانیف بطور نمونہ کے تسلیم کی جاتی اور اپنی معنوی خوبیوں کی وجہ سے مطالعہ کی جاتی ہیں۔

تاہم یہ تو صرف طرز بیان کے لحاظ سے ہے اور یہ دونوں مورخ باوجود اپنے کمال انشا پردازی کے نہ کبھی مشکل معاملات میں کامل غور و فکر کرنے والے مشہور ہوئے نہ اُنھوں نے

ہمارے خزانہ معلومات میں کوئی قابل قدر اضافہ کیا۔ اسی طرح سے اگلے لوگوں (قدما) میں
جو مشاہیر نبرد آزما ہوتے (سر برآوردہ سپاہی ہوتے) تھے وہ سر برآوردہ واقفکار
امور سیاست بھی ہوتے تھے اور فوج کے بہترین سپہ سالار عام طور سے سلطنت کے
بہترین فرمانروا ہوتے تھے لیکن یہاں پر بھی سوسائٹی کی ترقی نے ایسا تغیر عظیم دکھایا ہے
کہ ایک مدت دراز تک ایسے مواقع بھی بیحد شاذ ہو گئے تھے۔ حتیٰ کہ گسٹاوس اڈالفس
اور فریڈرک اعظم بھی خانگی طرز عمل میں سخت ناکام رہے اور مشاغل صلح وآشتی میں ایسے کوتاہ
نظر ثابت ہوئے جیسے مشاغل جنگ میں وہ بلند نظر تھے۔ زمانہ حال کے نبرد آزما لوگوں میں غالباً
کرامول، واشنگٹن اور نپولین ہی ایسے اعلیٰ درجہ کے لوگ تھے جن کے بارہ میں نہایت
صفائی سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اُن میں یکساں طور سے یہ قابلیت تھی کہ سلطنت کی فرمانروائی
بھی کریں اور فوج کی سپہ سالاری بھی۔ اور اگر ہم انگلستان کو اس لیے ٹٹولیں گے
کہ کچھ معروف مثالیں ملجائیں تو ہمارے اپنے دو بڑے نامی جنرلوں یعنی مارلبارو اور
ولنگٹن پر یہی خیالات چسپاں ہو جائیں گے۔ مارلبارو نہ صرف نہایت نکمی اور اوچھے
مشاغل کا آدمی تھا بلکہ وہ ایسا کندۂ ناتراش اور جاہل تھا کہ اُس کی خامیوں نے اُسے
اپنے معاصرین میں موجب مضحکہ بنا دیا تھا اور سیاست ملکی میں تو اُسے اس سے زیادہ دخل
نہ تھا کہ بادشاہ بیگم کی چاپلوسی کرکے مورد الطاف خسروانہ بنے اسی بادشاہ کے
بھائی کا ساتھ نہایت شدید ضرورت کے وقت چھوڑ دے اور پھر ایک دورخی دغابازی
سے اپنے دوسرے محسن سے منحرف ہو کے ایک مجرمانہ اور نیز احمقانہ خط کتابت اُسی
شخص سے شروع کرے جس کی رفاقت چند ہی سال پیشتر شرمناک طریقہ سے چھوڑ دی تھی
یہ خصوصیات طبیعت تھیں اُس شخص کے جو اپنے زمانہ کا سب سے بڑا کشورستا تھا۔
ایک سو لڑائیوں کا مرد میدان اور بلنہیم و رملیاس کا فاتح تھا۔ اب ہمارے دوسرے
بڑے نبرد آزما کو لیجیے تو اگرچہ اس میں شک نہیں کہ کسی انگریز کو سزاوار نہیں ہے کہ بغیر

خدمات کے سبب سے ہیں جن کی اہمیت کا بھول جانا ہمارے لیے شایاں نہیں ہی۔ تاہم جس شخص نے موجودہ صدی کی ملکی تاریخ انگلستان کا مطالعہ کیا ہی وہ بخوبی جانتا ہی کہ بیشک یہ فوجی سردار جو میدان جنگ میں یگانہ و یکتا نظر آتا تھا اور جو ایسے خلوص عزیمت اور اتنی شدید دیانت اور اعلیٰ درجے کے اخلاق سے متصف تھا جس سے بڑھکے ہونا ممکن نہیں ہی سیاسی زندگی کی پیچیدہ ضرورتوں کے لیے بالکل موزوں نہ تھا۔ یہ مشہور و معروف بات ہی کہ نہایت اہم قانونی مسائل میں اس کی رائیں ہمیشہ برسر خطا ہوتی تھیں۔ یہ مشہور و معروف بات ہی اور اس کے شہادتیں پارلیمنٹ کے مباحثوں میں قلمبند موجود ہیں کہ ہر ایک بڑی تدبیر میں جو منظور کی گئی، ہر ایک بڑی ترقی میں، اصلاح کی ہر ایک بڑی کارروائی میں اور جمہور کی خواہشوں کے بموجب ہر ایک بڑے عطائے حق میں ولنگٹن نے نہایت سختی سے مخالفت کی۔ اور ان امور کی بابتہ جو قانون نافذ ہوا وہ اُس کی مخالفت کے علی الرغم اور اس کے اس قابل افسوس اظہار کے بعد نافذ ہوا کہ ان ذرائع سے انگلستان کا امن و امان سخت مخدوش حالت میں پڑ جائیگا۔ لیکن اب مدرسہ کا کوئی ہونہار اور ہوشیار طالب علم ایسا نہیں ہی جو یہ نہیں جانتا کہ ہمارے ملک کی موجودہ استواری اُنھیں تدابیر کا ثمرہ ہی۔ تجربہ نے جو عقل کی بڑی معیار ہی ثابت کر دیا ہی کہ وہ تدابیر عظیمہ جن کی مخالفت میں ولنگٹن نے اپنی سیاسی زندگی صرف کر دی تھی وہ (میں اُنھیں مناسب موزوں نہ کہونگا بلکہ یہ کہونگا کہ) ایسی لابدی و لازمی تھیں کہ اُن سے قطع نظر نہیں کی جا سکتی تھی۔ جمہور کی خواہش کی مخالفت کی پالیسی جس پر اس نے ہمیشہ اصرار کیا ایسی پالیسی ہی جو ویانا کانفرنس کے بعد سے سوائے ہمارے سلطنت کے ہر سلطنت میں کام میں لائے گئی۔ اس حکمت عملی کا نتیجہ ہماری عبرت کے لیے تاریخوں میں موجود ہی۔ وہ جذبات جمہور کے اُس عظیم الشان آتش فشانی میں تحریر ہی جس نے اپنے غیظ و غضب کی حالت میں مغرور ترین شاہی تختوں کو اُلٹ دیا۔

شاہی خاندان کو تباہ و برباد کر دیا۔ عمائد سلطنت کے گھروں کو مٹا دیا۔ اور خوبصورت و خوشنما شہروں کو ویرانہ بنا دیا۔ اور اگر ہمارے اس بڑے جنرل کی صلاح مانی جاتی۔ اگر رعایا کے واجبی مطالبات سے انکار کر دیا جاتا تو یہی ماجرا ہمارے ملک کی تاریخ میں بھی لکھا جاتا اور یقیناً ہم لوگ اُس خوفناک حادثہ کے مصائب سے نہ بچ سکتے جس میں کہ ابھی چند سال گزرے ہیں کہ حکمرانوں کی جہالت اور خود غرضی نے متمدن دنیا کے ایک بڑے حصہ کو ڈال دیا تھا۔

زمانہ قدیم کی فوجی سیرت اور اب کے زمانہ کے فوجی سیرت یورپ میں اتنا حیرت انگیز فرق ہے۔ اس زوال کے اسباب صاف طور سے اس بات میں تلاش کئے جا سکتے ہیں کہ مشاغل تعلیمی کے بیحد بڑھ جانے کی وجہ سے ذی لیاقت اشخاص میں سے اب بہت کم لوگ اس پیشہ میں داخل ہوتے ہیں حالانکہ اگلے وقتوں کے قابل لوگ اس لئے ٹوٹے پڑتے تھے کہ وہ اسے اپنی اُن قوتوں کے مشق کا عمدہ ذریعہ سمجھتے تھے جن کو زیادہ متمدن ملکوں میں لوگ بہتر طور سے صرف کرتے ہیں۔ حقیقت میں یہ ایک نہایت اہم انقلاب ہے۔ اور اس طور سے اعلیٰ دماغی قابلیت کے لوگوں کا فنون حربیہ سے منحرف ہو کے فنون صلح و آشتی کی طرف مائل ہونا صدیوں میں جا کے آہستہ آہستہ ہوا ہے اور روز افزوں علم کی بتدریج مگر مسلسل فتوحات سے سرانجام پایا ہے۔ اُن فتوحات کی تاریخ لکھنا گویا عقل انسانی کی تاریخ لکھنا ہے۔ اور یہ ایسا کام ہے کہ ناممکن ہے کہ کوئی ایک متنفس اُسے کافی طور سے پورا کر سکے۔ لیکن یہ مبحث ایسی دلچسپی کا ہے اور اس پر اتنا کم لحاظ کیا گیا ہے کہ اگرچہ میں نے اس تحلیل و تجزی کو اپنے مرکوز خاطر تنقید سے آگے بڑھا دیا ہے لیکن پھر بھی میں اسبات کے بیان کرنے سے باز نہیں رہ سکتا کہ میری نزدیک وہ کون سے تین مقدم طریقے (عنوان) ہیں جن سے دنیائے قدیم کا جنگی مذاق علم یورپ کے بڑھنے سے زوال پذیر ہوا۔ ان میں سے پہلا تو بارود کی ایجاد سے ظہور پذیر ہوا۔ اور یہ اگرچہ ایک جنگی ترکیب تھی

لیکن اس نے ایسے ایسے دکھائے جو صلح و امن کے لیئے کار آمد تھے۔ کہا جاتا ہی کہ یہ مفید ایجاد تیرہویں صدی میں ہوئی تھی لیکن چودہویں صدی یا پندرہویں صدی کے آغاز سے پیشتر اُس کا عام رواج نہیں ہوا تھا جوں ہی یہ صرف میں آنے لگی اُس نے لڑائی کے ٹھاٹھ اور اس کے انداز میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا۔ اُس سے پیشتر قریب قریب ہر باشندہ ملک کا یہ فرض سمجھا جاتا تھا کہ فوجی خدمت میں داخل ہونے کے لیے خواہ اپنے ملک کے بچاؤ کے واسطے دوسرے کے ملک پر حملہ آور ہونے کے واسطے تیار رہے۔ اس وقت بنی بنائی فوجیں بالکل کسی کے خیال میں بھی نہ تھیں۔ اور اُن کے عوض ایک وحشیانہ و نامہذب ملیشیا (بے قاعدہ فوج) موجود تھی کہ جو ہمیشہ آمادۂ جنگ اور امن و امان کے اُن مشغلوں سے کنارہ کش رہتی تھی جو اُس وقت تحقیر سے دیکھے جاتے تھے۔ چونکہ قریب قریب ہر شخص سپاہی تھا اس وجہ سے فوجی پیشہ کا کوئی جداگانہ وجود نہ تھا یا ٹھیک یوں کہنا چاہیے کہ تمام یورپ میں صرف ایک بڑی فوج تھی اور اُس میں کل پیشے اور کاروبار ضم ہو گئے تھے۔ البتہ مذہبی پیشہ مستثنیٰ تھا۔ لیکن اس عام رجحان کا اثر اُس پر بھی پڑا تھا۔ اور یہ کوئی عجیب بات نہ تھی کہ بڑی بڑی فوجی جماعتیں میدان جنگ میں رہبان و قسیس لوگوں کے (یعنی پادری صاحبان کی) سپہ سالاری میں دیکھی جاتی تھیں۔ اور ان میں سے اکثر حضرات اُس زمانہ میں فنون حرب سے پوری طرح آشنا ہوتے تھے۔ بہر طور لوگ انھیں دو پیشوں میں ضرورتاً تقسیم تھے۔ اور اُس وقت صرف جنگ یا مذہب بس یہی دو شغل تھے۔ اور اگر تم کلیسا میں داخل ہونے سے گریز کرتے تھے تو تم پر واجب تھا کہ فوج میں داخل ہو اس کا ایک قدرتی نتیجہ یہ تھا کہ اُس وقت ہر سود مند اور اہم شے بالکل کس مپرسی میں پڑی تھی۔ حقیقت میں اس وقت بکثرت عابد و زاہد (پادری) تھے۔ بکثرت سورما تھے بکثرت وعظ و موعظت اور بکثرت جنگ و جدل تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی نہ تو وہاں سوداگری تھی نہ تجارت اور نہ صنعت و حرفت۔ نہ وہاں سائنس تھا نہ ادب و دانش۔

کار آمد علوم و فنون کو وہاں کوئی مطلق جانتا نہ تھی کہ سوسایٹی کے اعلیٰ طبقات والے نہ صرف نہایت معمولی آسائشوں سے بلکہ متمدن زندگی کے بالکل روزمرہ کی سلیقہ و شایستگی کے آداب سے نابلد محض تھے۔

لیکن جیسے ہی بارود کا رواج ہوا ایک انقلاب عظیم کی بنیاد رکھ دی گئی۔ قدیم طریقہ کے بموجب ہر شخص کے مایہ بڑا یا ایک تلوار ہوتی تھی یا ایک تیر و کمان کہ جسے وہ میراث پدری میں پاتا تھا۔ اور یہی چیزیں میراث میں پاکے وہ میدان جنگ کے واسطے لیس ہو جاتا تھا۔ نئے طریقہ کی رو سے جدید چیزوں کی ضرورت پڑی اور اسلحہ حرب سے آراستہ ہونا زیادہ گراں اور دشوار ہو گیا۔ اول تو بارود کی فراہمی ضرور ہوئی پھر بندوقوں کی دستیابی کہ جو قیمتی ہتیار تھے اور جن کا سرانجام دشوار سمجھا جاتا تھا۔ پھر اور بھی آلات تھے جو قدرتی طور پر بارود کی ایجاد سے پیدا ہو گئے تھے۔ جیسے پستولیں، بم کے گولے، کابیلہ، گولیاں، سرنگیں وعلیٰ ہذا القیاس۔ ان سب چیزوں نے فن جنگ کے پیچیدگی بڑھا کے قواعد و مشق کی ضرورت بڑھا دی۔ اور اسی کے ساتھ معمولی ہتیاروں میں جو انقلاب واقع ہو رہا تھا اُس نے اشخاص کی تعداد کثیر کو اُن کی مہیا کر سکنے سے باز رکھا۔ ان تبدیل شدہ حالات کے مطابق ایک جدید نظام قائم کیا گیا اور یہ مناسب معلوم ہوا کہ محض جنگ کی ضرورت سے بڑی بڑی جمعیتیں تیار کی جائیں اور وہ جہاں تک ممکن ہو اُن دیگر مشاغل سے الگ رکھے جائیں جن میں پیشتر کل سپاہی وقتاً فوقتاً مصروف رہتے تھے۔ اس طور پر مستقل اور قائم افواج کا طریقہ رائج ہوا۔ اس طرح کی فوجیں سب سے پہلے پندرہویں صدی کے وسط میں مرتب کی گئی تھیں۔ یعنی قریب قریب ٹھیک اس وقت جبکہ بارود عام طور سے رائج ہو چکی تھی۔ اسی طرح سے تنخواہ دار فوجیں مامور کرنے کی رسم شروع ہوئی کہ جس کی کچھ مثالیں اس سے پیشتر بھی ہم کو ملتی ہیں اگرچہ یہ سلسلہ چودھویں صدی کے آخری حصہ تک پوری طرح سے قائم نہیں ہوا تھا۔

اس تحریک کی اہمیت بہت جلد اس انقلاب سے عیاں ہوگئی جو اُس نے یورپ کی سوسائٹی کی تقسیم میں پیدا کیا۔ چونکہ باقاعدہ فوجیں بوجہ اپنی قواعد دانی کے غنیم کے مقابلہ میں زیادہ کارآمد تھیں نیز براہ راست سلطنت کے قابو میں رہتی تھیں لہذا نتیجہ یہ ہوا کہ جس قدر زیادہ اُس کی خوبیاں لوگوں کو معلوم ہوتی گئیں اسی قدر قدیم بیقاعدہ فوج کو اس طرح زوال ہوتا گیا کہ پہلے تو وہ گمنامی کی حالت میں پڑی رہی پھر کسمپرسی میں اور آخر کار گھٹا دی گئی۔ اسی وقت میں فوج بیقاعدہ کی تعداد میں جو یہ کمی ہوئی تو اُس نے ملک کو ایک طرح کے سامان جنگ سے محروم کرکے یہ ضروری کردیا کہ فوج باقاعدہ پر زیادہ توجہ صرف کی جائے اور یہ خیال پیدا کردیا کہ فوج باقاعدہ والے تمام مشاغل کو چھوڑ کے صرف قومی فرائض میں منہمک رہیں اس طور سے اول اول ایک واضح تفریق سپاہی اور ملکی آدمی کے درمیان قائم ہوگئی۔ اور ایک جداگانہ فوجی پیشہ پیدا ہوگیا جس میں نسبتاً کل باشندگان ملک کے ایک چھوٹے حصہ نے باقیماندہ اشخاص کو چھوڑ دیا کہ وہ دوسرے کام کاج میں لگے رہیں اسی طرح اشخاص کی کثیر تعداد نے رفتہ رفتہ اُس اپنی قدیمی جنگجوئی کی عادتوں کو چھوڑ دیا اور گویا ملکی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوکے اُن کی ساری قوتیں سوسائٹی کے عام اغراض مقاصد اور زمانہ صلح کے اُن علوم و فنون کے نشو و نما میں صرف ہونے لگیں جو اُس سے پیشتر نظرانداز کردیے گئے تھے۔ انجام یہ ہوا کہ اہل یورپ کے نفوس جو اُس سے پیشتر صرف جنگ یا مذہب میں الجھے رہتے تھے اب بجائے اُس کے ایک اعتدال کی راہ پر آگئے اور اُنھوں نے علم کی وہ بڑی بڑی شاخیں پیدا کیں جن پر موجودہ تمدن کا دار مدار ہے۔ ہر ایک نسل مابعد میں یہ رجحان جداگانہ درجہ بندی کا زیادہ نمودار ہوتا گیا۔ تقسیم کار کی سودمندی صاف طور سے سمجھ میں آنے لگی۔ اور اس طبقہ متوسط یا گروہ عقلا کا زور نسبتاً بڑھتا چلا گیا۔ اور جس قدر اُس کی زور و قوت میں اضافہ ہوتا گیا وہ باقی دونوں گروہوں کا

پیکار کا شوق فرد ہوتا رہا جس کا سوسائٹی کے ایک ابتدائی حالت میں بڑا زور ہوتا ہے اس اصول عقلی کے نشو و نما اور نشر و اشاعت کی شہادت ایسی کامل اور قطعی ہے کہ تمام شعبہ ہائے علم کے ملانے سے قریب قریب اُس کے کل مدارج ترتیبی کا سراغ لگ سکے۔ سردست اس قدر کہنا کافی ہے کہ ایک عام نظر ڈالنے سے اس تیسرے یعنی عقلی گروہ نے اول اول چودہویں اور پندرہویں صدی میں آزادانہ اگرچہ مبہم طریقے سے اپنی کارگزاری دکھانا شروع کی پھر سولہویں صدی میں اس کارگزاری نے ایک نمایاں صورت اختیار کر کے مذہبی مجادلوں میں ظہور پکڑا۔ اور سترہویں صدی میں اس کا جوش زیادہ عملی شکل میں ظاہر ہو کے سلطنت کی خرابیوں کی طرف متوجہ ہوا اور اُس نے بغاوتوں کا ایک ایسا سلسلہ قائم کر دیا جس سے شاہد ہی یورپ کا کوئی حصہ محفوظ رہا ہو۔ اور آخر کار اٹھارہویں اور اُنیسویں صدیوں میں اُس نے اپنا دائرہ اثر کل صیغہ جات ملکی و خانگی زندگی تک وسیع کر کے اشاعت علم کی سعی کی واضعان آئین و قوانین کو قانون سازی کی تعلیم دی۔ بادشاہوں کو حد سے بڑھنے نہ دیا۔ اور سب پر بالا یہ کہ عام رائے کے اس غلبہ کو ایک یقینی بنیاد پر قائم کر دیا جس کے سامنے نہ صرف آئینی فرمانروا بلکہ سب سے بڑے جابر اور خود مختار شہنشاہ تک حلقہ اطاعت میں آگئے ہیں۔

درحقیقت یہ وسیع مباحث ہیں اور جب تک اُن کا کچھ علم حاصل نہو کوئی شخص نہ یورپ کی سوسائٹی کی موجودہ حالت کو سمجھ سکتا ہے نہ اُس کے آیندہ توقعات کا خفیف سا بھی تصور کر سکتا ہے۔ البتہ اسی قدر کافی ہے کہ پڑھنے والا اب اُس راہ کو دیکھ سکتا ہے جس سے ایسے خفیف معاملہ یعنی بارود کی ایجاد نے اُن لوگوں کی تعداد گھٹا کے جو شوق جنگ و جدل کے خوگر تھے جنگجوئی کے شوق کو کم کر دیا۔ بیشک اور بھی ایسے حالات و اسباب تھے جو ایک ہی طرف مائل کرنے والے تھے لیکن بارود کا استعمال سب سے بڑھ کے ہوا اسلئے کہ جنگ کی مشکلات اور مصارف کو بڑھا کے اُس نے ایک جداگانہ فوجی پیشہ کا قیام لازمی

کردیا تھا۔ اور اس طور پر فوجی جوشس میں تخفیف کر کے ایک حصہ قوت کا ایسا بے شغل رکھدیا تھا جس نے بہت جلد صلح و امن کے مشغلوں کی طرف راہ نکال لی۔ اُن میں ایک نئی روح پھونک دی اور فتوحات کی اُس ہوس کو فرد کرنا شروع کر دیا جو اگرچہ ایک وحشی قوم میں فطری ہوتی ہے لیکن علم و دانش کی دشمن قاتل اور انسانی تمدن و ترقی کے لئے ایک مہلک آفت ہے۔

دوسرے عقلی تحریک جس سے جنگ و پیکار کا ولولہ کم ہوا ابھی حال ہی کی شے ہے۔ اور اُس نے ہنوز اپنے پورے فطری تاثیرات ظاہر نہیں کئے ہیں۔ میری مراد اُن انکشافات سے ہے جو علم سیاست مدن نے کئے ہیں۔ یہ وہ شاخ علم ہے جس سے قدما کے عاقل ترین اشخاص بھی ناآشنائے محض تھے لیکن اس کی اہمیت اس قدر ہے کہ اُس کے بیان کرنے میں مبالغہ کرنا مشکل ہے اور مزید براں یہ کہ وہ اس وجہ سے اور بھی نمایاں ہے کہ وہ ایسا مبحث ہے کہ جو براہ راست فن سیاست ملک داری سے سروکار رکھتا ہے کہ جو ابتک سائنس کے درجہ تک نہیں پہونچا ہے۔ اس عمدہ مطالعہ کی علمی قدر و قیمت اگرچہ غالباً صرف زیادہ ترقی یافتہ اہل نظر ہی کو بخوبی معلوم ہے لیکن رفتہ رفتہ اُس سے معمولی تعلیم والے لوگ بھی واقف ہونے لگے ہیں۔ تاہم وہ لوگ بھی جو اسے سمجھ گئے ہیں وہ بھی اس امر کو پوری طرح نہیں سمجھے کہ اُس کے اثر سے امن و امان کے اغراض اور امن و امان کے بدولت تمدن کے مقاصد میں کیونکر براہ راست ترقی ہوئی ہے۔ جس طریق سے یہ نتیجہ مترتب ہوا ہے اُس کے بیان کرنے میں کوشش کروں گا کیونکہ اُس سے ایک اور دلیل اُس اصول اعظم کی تائید میں ملے گی جسے میں ثابت کرنا چاہتا ہوں۔

یہ بخوبی واضح ہے کہ جنگ و پیکار کے مختلف اسباب میں تجارتی رقابت گزشتہ زمانہ میں سب سے بڑھ کے نمایاں تھے۔ اور اس کی متعدد مثالیں موجود ہیں کہ کسی خاص نرخ کے اعلان یا کسی خاص مرغوب صنعت و حرفت کے تحفظ سے منازعات و مناقشات برپا ہوگئے

اس قسم کے جھگڑے اس جاہلانہ مگر بالکل فطری تصور سے پیدا ہوئے تھے کہ سوداگری کا منافع تجارت کے توازن پر موقوف ہے اور یہ کہ ایک ملک کا فائدہ دوسرے ملک کا نقصان ہے ان کا یہ عقیدہ تھا کہ دولت صرف روپیہ کا نام ہے۔ اور یہ کہ اسی لیے ہر قوم کا لازمی طور سے یہ مقصد ہونا چاہیے کہ اپنے ملک میں سامان آسایش کم اور روپیہ سونا زیادہ باہر سے لائے جب کبھی یہ حالت ہوتی تو اُس وقت یہ کہا جاتا تھا کہ معاملات کی حالت اچھی اور سُدھری ہوئی ہے لیکن اگر ایسا نہ ہوتا تو لوگ یہ کہتے تھے کہ ہمارے سامان نکلے چلے جاتے ہیں دوسرا ملک ہم سے دولت چھینے لیے جاتا ہے اور ہماری بدولت متمول ہو رہا ہے۔ اس کے واسطے صرف یہی علاج تھا کہ ایک تجارتی عہد و پیمان ہو جائے جس کے ذریعہ سے ہمارا حریف ہم سے سامان آسایش زیادہ لے اور ہم کو سونا زیادہ دے۔ اگر وہ حریف عہدنامہ پر دستخط کرنے سے انکار کرتا تھا تو اس کی ضرورت پڑتی تھی کہ اُس کے ہوش درست کر دیئے جائیں اور اس کے لیے ایسے سامان حرب و ضرب کی درستی کی جاتی تھی جو ایسی قوم پر حملہ کرنے کے شایاں ہو جس نے ہماری دولت گھٹا کے ہم کو روپیہ سے محروم کر دیا معاملہ بیع و شرا کی اصل و حقیقت کے بارہ میں یہ جو غلط فہمی تھی یہ زمانہ سابق میں عالمگیر تھی اور چونکہ قابل ترین واقف کاران سیاست ملکی بھی اسی خیال پر قائم تھے اس وجہ سے نہ صرف وہ فوری سبب جنگ و جدل کا ہوتے تھے بلکہ اُن فطری خیالات منافرت کو بھی اُس نے بڑھا دیا تھا جن کے سبب سے جنگ کی ترغیب ہوتی تھی کیونکہ ہر ملک یہی خیال کرتا تھا کہ اُس کا براہ راست یہ مدعا ہونا چاہیے کہ اپنے ہمسایہ کی دولت گھٹا دے۔ درحقیقت سترہویں یا بلکہ سولھویں صدی کے آخری حصہ تک ا در دو ایک سر برآوردہ مبصرین ایسے تھے جنھوں نے بعض اُن مغالطوں کو کھول دیا تھا جن پر یہ رائے بنی تھی۔ لیکن اُن کے دلائل و براہین ان واقفکارانِ امور سیاست کے یہاں کچھ وقیع نہ تھے جن کے ہاتھ میں معاملات یورپ کا نظم و نسق تھا یہ مدبران ملک

… وہ اپنے معاملات
میں اس قدر منہمک رہتے ہیں کہ ان سے یہ توقع نہیں ہو سکتی کہ جس قدر نئی نئی انکشافات ہوا کریں اُن پر کامل نظر ڈال سکیں اور اسی وجہ سے یہ لوگ مجموعی حیثیت سے ہمیشہ اپنے زمانہ سے پیچھے رہتے ہیں۔ انجام یہ تھا کہ وہ لوگ اپنی پرانی چال پر ٹھوکریں کھاتے چلے گئے، اور یہی مانتے رہے کہ کوئی تجارت بغیر ان کے دست اندازی کے پھل پھول نہیں سکتی بار بار اور پریشان کن ضوابط و آئین سے اُس تجارت میں خلل ڈالتے رہے اور یہی تسلیم کئے رہے کہ ہر سلطنت کا فرض یہی ہے کہ دوسروں کی تجارت کو ضرر پہنچا کے اپنے رعایا کی تجارت کو نفع پہنچائے۔

لیکن اٹھارھویں صدی میں واقعات کے ایک مسلسل سلسلہ نے (جن کا میں بعد چندے پتہ لگاؤنگا) ترقی کی ایک خیال اور ایسے اصلاح کی ایک خواہش کے لئے راستہ ہموار کر دیا کہ جس کی کوئی مثال دنیا نے اُس وقت نہیں دیکھی تھی۔ اس تحریک عظیم نے علم کی ہر شاخ میں اپنا زور دکھایا اور اُس وقت دولت کی پیداوار اور تقسیم کے قوانین دریافت کرکے علم المعیشت (علم الاقتصاد) کو ایک سائنس کے درجہ تک پہنچانے کی کوشش کی گئی اور ۱۷۷۶ء میں آدم اسمتھ نے اپنی کتاب "دولت اقوام" شائع کی یہ ایسی کتاب ہے کہ اگر اس کے فوری نتائج پر لحاظ کیا جائے تو غالباً اُن سب کتابوں سے اہم نکلے گی جو کبھی لکھی گئی ہیں۔ اور یقیناً سب سے بڑھکے گرانمایہ تصنیف ہے جو ایک شخص واحد نے اُن اصول کے ثابت کرنے کے لئے لکھی ہے جن پر سلطنت و حکومت کو مبنی ہونا چاہیئے۔ اس بلند پایہ تصنیف میں اُس قدیم نظریۂ حفاظتِ تجارت کی ہر دلیل کو باطل ثابت کیا گیا ہے اور توازن تجارت کے اصول پر نہ صرف اعتراضات کئے گئے بلکہ اُس کی غلطی ثابت کر دی گئی اور وہ بیشمار بیہودگیاں اور غلطیاں جو مدتہائے مدید سے جمع ہو رہی تھیں ایک دم سے دُور کر دی گئیں۔

اگر یہ کتاب "دولت اقوام" کسی پچھلی صدی میں نکلتی تو اُس کا بھی وہی حشر ہوتا جو

اسٹافورڈ اور ہنری کی کتابوں کا ہوا تھا اور اگرچہ وہ اصول جن کی اُس نے حمایت کی تھی مُبصّرین و متفکرین کی توجہ ضرور مبذول کراتے لیکن ظن غالب یہی ہے کہ وہ مُدبّرین حکومت و حاملان سیاست پر کچھ بھی اثر نہ کرتے۔ اگر کچھ اثر ہوتا بھی تو وہ بے ثبات اور سرسری ہوتا۔ لیکن اُس وقت علم کی نشر و اشاعت ایسی عام ہو چکی تھی کہ معمولی واضعان قوانین بھی ایک حد تک اُن حقایق عظیم کے واسطے تیار ہو گئے تھے جنھیں زمانہ سابق میں وہ فضول نیتجہ سمجھتے یہ ہوا کہ آدم اسمتھ کے اصول نے بہت جلد عوام (ہاؤس آف کامنس) میں بار پایا۔ اور چند مشاہیر اراکین نے جو اُنھیں قبول کر لیا تو اُس مجلس اعظم کے ارکان نے جو لکیر کے فقیر تھے اور جو اس بات کے قایل ہی نہ تھے کہ اس زمانے میں کوئی ایسی بات پیدا ہو سکتی ہے جو متقدمین کو معلوم نہ تھی ان راؤں کو استعجاب کے ساتھ سُنا۔ بڑھتے ہوئے علم کی قوت کا مقابلہ کرنا حماقت ہی۔ کوئی بڑا امر حق ایسا نہیں جو ایک بار دریافت ہو چکا ہو اور پھر کبھی ضایع ہوا ہو۔ اور کوئی اہم انکشاف اب تک ایسا نہیں ہوا جو آخر کار تمام رکاوٹوں پر غالب نہ آگیا ہو۔ اسی طرح سے آزاد تجارت کے اصول سے جس طرح سے کہ اُن کو آدم اسمتھ نے ثابت کیا ہی اور ان تمام نتایج سے جو اُس سے بروی کار ہوتے ہیں پارلیمنٹ کی دونوں مجلسوں نے نہایت شد و مد سے کثرت رائے کے ساتھ اختلاف کیا۔ سال بہ سال یہ امر حق اپنی راہ نکالتا گیا اور ہمیشہ آگے بڑھتا رہا کبھی پیچھے ایک قدم نہ ہٹا۔ اُس کے خلاف جو کثرت رائے تھی اُس کا پہلے تو چند ذی لیاقت اصحاب نے ساتھ چھوڑا پھر معمولی لوگوں نے بھی۔ بعد ازاں گھٹتے گھٹتے تھوڑی سی تعداد رہ گئی اور پھر وہ قلیل تعداد بھی متنزلزل ہونے لگی۔ اور آج کے دن کہ اسمتھ کی کتاب "دولت اقوام" کو شایع ہوئے اسّی برس ہوئے ہیں کوئی شخص جس نے معقول تعلیم پائی ہے ایسا نہیں مل سکتا جو اُن خیالات کے ہم آہنگی پر شرمندہ نہ ہوتا ہو جو آدم اسمتھ کے وقت سے پہلے عام طور سے مقبول تھے۔

ہر عہد کے بڑے بڑے اہل نظر معاملات انسانی کا انصرام اور اپنے انکشافات کے
ذریعہ سے قوموں کی رفتار درست کرتے ہیں۔ اور سچ یہ ہے کہ صرف اسی ایک فتحیابی کی
تاریخ اُن مُدبّرین اور واضعان قوانین کے زعم و پندار مٹانے کے واسطے کافی ہے جو
اپنے کاروبار کی اہمیت میں اتنا مبالغہ کرتے ہیں کہ اپنے عارضی اور متبدّل تدبیروں سے
بڑے بڑے نتائج وابستہ بتاتے ہیں۔ کیونکہ آخر اُنھوں نے وہ علم کہاں سے حاصل کیا
جس کی خوبیوں کی مدعی بننے کے واسطے وہ ہر وقت تیار رہتے ہیں؟ اُنھوں نے اپنی
رائیں کیونکر پائیں؟ وہ اپنے اصول پر کس طرح پہنچے؟ یہی اجزائے ترکیبی ہیں اُن کی
کامیابی کی اور انھیں کو وہ اپنے مُعلّموں سے سیکھ سکتے ہیں یعنی وہ بڑے معلّم جنھوں نے
اپنی ذکاوت طبعی کی تحریک سے مستعد ہو کے دنیا کو اپنے انکشافات سے مالا مال کر دیا۔
آدم اسمتھ کی بابت یہ بہت اچھی طرح کہا جا سکتا ہے اور اس کہنے میں تردید کا کوئی خوف
نہیں ہو سکتا کہ اس منفرد باشندۂ اسکاٹ لینڈ نے صرف ایک کتاب شایع کر کے نوع انسانی
کے لئے اُس سے زیادہ کام کیا جتنا کہ اُن کل مدبّرین اور واضعان قوانین کے متفقہ
قابلیتوں نے کیا تھا جن کے معتبر حالات تاریخ میں مدوّن ہو چکے ہیں۔

ان انکشافات عظیمہ کے نتائج پر بحث کرنے سے مجھے کچھ سروکار نہیں ہے۔ البتہ مجھے
صرف اتنے سے واسطہ ہے کہ اُنھوں نے مذاق جنگ و جدل کے زور توڑنے میں کس قدر
مدد کی۔ جس وقت تک یہ اعتقاد تھا کہ ایک ملک کی دولت اُس کے سونے میں ہے اُس وقت تک
بیشک یہ بھی اعتقاد تھا کہ تجارت کی اصلی غرض و غایت یہ ہے کہ قیمتی دھاتوں کی درآمد
بڑھائیں۔ اور اُس وقت یہ بالکل فطری بات تھی کہ سلطنت سے یہ توقع رکھی جائے کہ وہ
ایسی تدبیر پر عمل کرے گی جن سے اس طرح کے درآمد کا انتظام ہو جائے گا۔ اور یہ صرف
اسی صورت سے ہو سکتا تھا کہ اور ملکوں سے اُن کا سونا چھین لیا جائے۔ اور یہ نتیجہ وہ تھا
جس کے حاصل ہونے میں ٹھیک انھیں وجوہ سے دوسرے ملک والے سختی سے مزاحم ہوتے تھے

انجام یہ تھا کہ اصلی مبادلہ کا کوئی تصور بھی ناممکن تھا۔ ہر تجارتی عہدنامہ کی غایت یہ ہوتی کہ ایک قوم دوسرے پر سبقت لے جائے۔ اور ہر ایک جدید نرخ ایک طرح کا اعلان جنگ ہوتا تھا۔ حتیٰ کہ وہ کاروبار جیسے اور سب کاروباروں سے بڑھکے مصالحت آمیز ہونا چاہیئے تھا وہ ایک سبب واقع ہو گیا تھا اُن قومی چشمکوں اور قومی عداوتوں کا جن کی وجہ سے خاص کر جنگ و جدل کے شعلے بھڑکتے تھے۔ لیکن جب ایک بار واضح طور سے یہ سمجھ لیا گیا کہ سونا چاندی دولت نہیں ہیں بلکہ صرف دولت کے نائب مُناب ہیں جب لوگ یہ سمجھنے لگے کہ دولت صرف اُس قیمت میں منحصر ہے جو محنت اور ہنرمندی خام پیداوار میں بڑھا دیتی ہے اور یہ کہ روپیہ ایک قوم کے لئے سوا اس کے اور کچھ بھی کارآمد نہیں ہوسکتا کہ اُس کی دولتمندی کا اندازہ کرے اور چلن چلائے۔ جب یہ بڑے بڑے حقایق تسلیم کر لئے جا چکے اُس وقت توازن تجارت اور قیمتی دھاتوں کی فضیلت کے کُل خیالات ہوا ہو گئے۔ جب ان فاش غلطیوں کی قلعی کھُل گئی تب بیع و شرا کا سچّا نظریہ آسانی سے عمل میں آگیا۔ اور یہ تصور کیا گیا کہ اگر تجارت آزاد رکھی جائے گی تو اُس کے فوائد سے ملک بہرہ اندوز ہوگا۔ نیز یہ کہ اگر مختصر حقوق تجارتی ہوں گے تو سوداگری کے تمتعات لازمی طور سے فریقین کے لئے نفع بخش ہوں گے اور یہ کہ بجائے اس کے کہ سونے کی اُس مقدار پر تکیہ کیا جائے جو ہاتھ آتا ہے یہ فوائد نہایت آسانی کے ساتھ اس طرح حاصل ہو سکتے ہیں کہ جو اشیا ایک قوم نہایت ارزاں طور سے پیدا کرتی ہے انھیں وہ دوسرے ملک میں بھیجے اور اُس ملک سے ایسی اشیا لے جو یہاں تو بہت صرفہ اور قیمت سے پیدا ہوتیں مگر اس ملک سے لانے میں سستی پڑتی ہیں کیونکہ وہاں کے ایک حرفہ کی ہنرمندی یا فطرت کی فیاضی کے سبب کم خرچ مہیا ہو جاتی ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ ایک تجارتی حیثیت سے یہ امر کہ ایک قوم کو جس سے ہم بیج بیوہار کرتے ہیں مفلس بنانے کی کوشش کرنا ویسی ہی بیہودہ اور لغو بات ہے جیسے کوئی سوداگر اپنے کسی ایک دولتمند اور

کل تاجر کے دیوالیہ بنانے کی کوشش کرے۔ انجام یہ ہی کہ تجارتی خیال جو زمانہ
سابق میں جنگجوئی کا خیال تھا اب یکساں طور سے مصالحت آمیز خیال ہو گیا ہی۔ اور اگرچہ
یہ بالکل سچ ہے کہ سو میں سے ایک بھی سوداگر ایسا نہیں ہے جو اُن دلیلوں سے واقف ہو
جن پر یہ مالی انکشافات مبنی ہیں لیکن اس سے اُس اثر میں خلل نہیں پڑتا جو یہ انکشافات
از خود اُس کی طبیعت پر ڈالتے ہیں۔ اور جماعتوں کی طرح تجارتی جماعت پر بھی وہی اسباب
اپنا عمل کرتے ہیں جن کو کہ اُس جماعت کے چند ہی رُکن دیکھ سکتے ہیں۔ مثلاً "حفاظت"
کے بیشمار مخالفین میں سے درحقیقت چند ہی ایسے نکلیں گے جو اپنے مخالفت کے بابت صحیح اور
عُمدہ دلیلیں دے سکیں گے۔ لیکن اس بات سے مخالفت کے واقع ہونے میں فتور نہیں پڑتا۔
کیونکہ انسانوں کی ایک نہایت کثیر تعداد نہایت مطیعانہ طور سے زمانہ کے رنگ پر چلا
کرتی ہے اور زمانہ کی ہوا محض اُس زمانہ کا علم ہے اور وہ سمت ہی جس طرف وہ علم
چلتا ہی۔ جس طرح زندگی کے معمولی کاروبار میں ہر شخص اُن آسایشوں کے بیشی اور عام
امن و امان کے افزونی سے متمتع ہوتا ہی جو ایسے بہت سے علوم و فنون اور حکومت کی
ترقی کے سبب سے حاصل ہوتی ہیں جن کے غالباً اُسے نام تک معلوم نہیں ہوتے ٹھیک
اسی طرح تجارتی گروہ اُن مالی انکشافات سے متمتع ہوتا ہے جنھوں نے دو نسلوں کی
مدت میں اس ملک کی تجارتی قانون سازی میں کامل انقلاب پیدا کر دیا ہی اور جو اب
آہستہ آہستہ لیکن استقلال کے ساتھ اُن دیگر سلطنتہائے یورپ پر عمل کر رہے ہیں جہاں
عام رائے کی کم زور ہونے کے وجہ سے یہ زیادہ مشکل ہی کہ نئے حقایق مرکوز (دلنشین)
کئے جائیں اور پُرانی خرابیوں کا استیصال کیا جائے۔ پس جبکہ یہ بالکل صحیح ہی کہ سوداگروں
میں سے نسبتاً ایک بہت قلیل حصہ علم المعیشت (اقتصادیات) سے واقف ہوتا ہے تو یہ
اُس سے کم صحیح نہیں ہی کہ اُن کی دولت کا بڑا حصہ اُن ماہرین معاشیات (اقتصادیات)
کے بدولت حاصل ہوتا ہے جنھوں نے اُن مزاحمتوں کو (جنھیں متواتر سلطنتوں کی جہالت نے

اُن کی تجارت کا سدِّ راہ بنا دیا تھا) دُور کر کے ایک مضبوط بنیاد پر تجارتی خوشحالی و فلاح کو قایم کر دیا ہے اور یہی وہ فلاح ہے جو ہمارے قومی جاہ و جلال میں کسی سے گھٹی ہوئی نہیں ہے۔ بالیقین یہ بھی سچ ہے کہ اسی عقلی تحریک نے اُن اصول کو تحقیق کر کے جن کو ممالک خارجہ سے ہماری تعلقات کی رہبری کرنا چاہیئے۔ اور اُن میں مداخلت کرنے نہ صرف فضولی بلکہ اُس کے سبب سے جو واقعی نقصان پہنچتا ہے اُسے ثابت کر کے اور بالآخر زمانۂ دراز کی اُن مسلمہ غلطیوں کو فاش و برملا کر دکھائے جن کی وجہ سے لوگ یہ باور کرتے تھے کہ قومیں فطرتاً ایک دوسرے کے عدو اور رقیب ہیں اور جو ان سے خیالات فاسد پیدا کراتی اور قومی رشک و رقابت کے اُبھارنے کا باعث تھیں جن کی قوت کی بدولت فوجی اقتدار بہت کچھ قایم تھا۔ لڑائی کا وقوع میں آنا کم کر دیا۔

تیسرا بڑا سبب جن سے جنگ وجدل کا شوق گھٹ گیا وہ انکشافات ہیں جو اسٹیم (بخار) کی بدولت وقوع میں آئے اور جن کے باعث مختلف ملکوں میں آمد و رفت آسان ہو گئی اور آمد و رفت کی اس سہولت نے اُس جاہلانہ منافرت کے مٹانے میں اعانت کی جو قوموں میں باہم ہوتی ہے۔ مثلاً اگلے زمانہ میں انگریزی مصنّفین کے ایک بڑے گروہ نے جیسی رکیک اور سفیہانہ بہتان اہل فرانس کے اخلاق اور خانگی سیرت و خصلت اور فرانسیسی عورتوں کی عصمت کے بارہ میں باندھے ہیں اُنھوں نے یورپ کے دو اوّل درجہ کے ملکوں میں اپنے خشمناک خیالات کو اور چمکا دیا جو اُس وقت موجود تھے۔ یعنی فرانسیسیوں کو انگریزوں کے خلاف اور انگریزوں کو فرانسیسیوں کے خلاف برانگیختہ کیا۔ اسی طرح ایک وقت وہ تھا جبکہ ہر ایک ایماندار انگریز کا یہ مستحکم عقیدہ تھا کہ وہ بیس فرانسیسیوں سے سر بر ہو سکتا ہے کیونکہ فرانسیسی ایسی مخلوق تھی جسے وہ بہت ہی تحقیر سے دیکھتا تھا اور یہ سمجھتا تھا کہ وہ ایک نحیف و زار اور روگی قوم ہے جو برانڈی کے عوض کلارٹ پیتے ہیں مینڈک پر تمامتر گزارادقات کرتے ہیں۔ ذلیل کافر ہیں کہ ہر اتوار کو وعظ سُنتے ہیں۔ بتوں کے

سامنے جھکتے ہیں بلکہ پوپ کو بھی پوجتے ہیں۔ اسی کے ساتھ فرانسیسی لوگوں کو یہ تعلیم ہوتی تھی کہ وہ ہم سے نفرت کریں اور یہ سمجھیں کہ یہ لوگ محض جاہل وحشی ہیں۔ نہ کوئی ذوق رکھتے ہیں نہ انسانیت۔ تیز مزاج و تند خو ہیں۔ بدحال ہیں۔ ایسی ناخوشگوار آب وہوا میں رہتے ہیں جہاں ہمیشہ کہر اچھائے رہنے سے آفتاب تو کبھی کاہے کو نظر آتا ہی اور ایسے غم وغصہ اور حزن ملال میں مبتلا رہتے ہیں کہ حکیموں نے اُس کا نام ہی انگریزی مراق رکھ دیا تھا۔ اور اسی سفاک آزار کے اثر سے علی التواتر اقدام خودکشی علی الخصوص نومبر کے مہینے میں کیا کرتے ہیں جبکہ یہ بخوبی مشہور تھا کہ ہم میں سے ہزار ہا اشخاص اپنے آپ کو پھانسی دے کر یا گولی مار کر دنیا سے ناپید ہو جاتے ہیں۔

جس شخص نے فرانس اور انگلستان کے قدیم ادب وانشا کو زیادہ پڑھا ہی وہ جانتا ہے کہ یہ خیالات تھے جو یورپ کے دو اوّل درجہ کی قومیں جہالت اور اپنی سادگی طبیعت کی وجہ سے ایک دوسرے کی بابتہ رکھتی تھیں۔ لیکن دونوں قوموں کو ایک دوسرے سے قریب اور واقف کر دینے سے جو ترقی میں زیادتی ہوئی اُس نے ان احمقانہ تعصبات کو رفع دفع کر دیا اور ہر قوم کو ایک دوسرے کا قدرشناس بنا دیا بلکہ اس سے بھی بالاتر یہ کہ ایک کو دوسرے کی عزت کرنا سکھا دیا۔ اور جتنا زیادہ وہ ایک دوسرے سے ملتے جاتے ہیں اُسی قدر یہ توقیر بڑھتی جاتی ہی۔ کیونکہ اہلِ مذہب چاہے جو کچھ کہیں یہ یقینی ہے کہ نوع انسانی علی العموم معائب کی بہ نسبت محاسن زیادہ رکھتی ہے اور یہ کہ ہر ملک میں نیک کام بہ نسبت بُرے کاموں کے اکثر واقع ہوتے ہیں۔ درحقیقت اگر یہ بات یوں نہ ہوتی تو بدی کے غلبہ نے نسل انسانی اب تک کبھی کی مٹا دی ہوتی اور شاید ایک متنفس بھی اپنے نوع کی بربادی پر چار آنسو گرانے والا نہ چھوڑا ہوتا۔ اس کا ایک مزید ثبوت یہ امر ہے کہ جتنا زیادہ قومیں ملتی جلتی ہیں اور جس قدر زیادہ اپنے ابنائے جنس کو دیکھتے اور جانتے پہچانتے ہیں اُسی قدر زیادہ سُرعت کے ساتھ اُن کی قدیمی عداوتیں دُور

ہوتی ہیں۔ یہ اس وجہ سے ہوتا ہے کہ زیادہ وسیع تجربہ یہ ثابت کرتا ہے کہ نوع انسانی
ایسی سرتاپا بد نہیں ہے جیسی ہم کو اپنے بچپنے سے یہ تعلیم دیگئی ہے کہ ہم اُسے سمجھیں لیکن
اگر نیکی کے مقابلہ میں بدی کثیر الوقوع ہوتی تو اُس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ دوسروں کی
نسبت جو خراب رائے ہماری ہے اُسے سوسائٹی کا بڑھتا ہوا اختلاط کچھ اور زیادہ کردیتا
کیونکہ ہم اگرچہ اپنے عیبوں کو عزیز رکھتے ہیں لیکن عام طور سے اپنے ہمسایوں کے عیوب
کو عزیز نہیں رکھتے۔ بہرکیف بجائے اس کے کہ اصلی نتیجہ یہ ہوتا ہمیشہ یہی ہوا ہے کہ وہ
لوگ جو بوجہ وسیع معلومات کے افعال وحرکات انسانی کے علم رفتار سے زیادہ واقف
ہوتے ہیں وہی لوگ اُن افعال وحرکات کو زیادہ تر بھلائی کی نظر سے دیکھتے ہیں
سب سے بڑا حکیم منش اور سب سے بڑھکے کامل مُبصّر ہمیشہ نہایت ہی نرم دل اور منصف مزاج
ہوتا ہے۔ وہ گوشہ نشین آدم بیزار ہوتے ہیں اپنے خیالی غلطیوں کے فکر میں ڈوبے
رہتے ہیں اور ہماری فطرت کے محاسن کی مذمت اور معائب میں مبالغہ کرنے پر مائل
رہتے ہیں۔ یا وہ کوئی احمق اور جاہل درویش ہوتا ہے کہ گوشہ خلوت میں بیکار بیٹھا ہوا
اپنی ہستی کو خواب وخیال ہی میں گزار دیتا ہے اور دوسروں کے عیوب پر لعن وطعن
کرکے اپنی خودپسندی کی خواہش بجھاتا ہے اور اس طور پر زندگی کی لذّتوں اور
مزوں کے جرح قدح کرکے اُس سوسائٹی سے انتقام لیتا ہے جس سے اپنی توہم پرستی
کے سبب خارج ہوچکا ہے اسی قسم کے لوگ ہیں جو نہایت شد ومد سے ہماری فطرت کے
تنزل اور اخلاقی انحطاط پر واویلا مچاتے رہتے ہیں۔ اس قسم کے خیالات نے جیسے
بیحد نقصانات پہنچائے ہیں اُنھیں وہ لوگ بخوبی سمجھتے ہیں جنھوں نے اُن ملکوں کی
تاریخ پڑھی ہے جن میں ایسے خیالات سب سے زیادہ شایع رہے اور ہیں۔ اسی سبب سے
یہ بات ہے کہ منجملہ اُن بیشمار فوائد کے جو بڑھتے ہوئے علم اور رسل رسایل کی آسانیوں سے
حاصل ہوئے ہیں سب سے بڑھکے اہم ہیں۔ کیونکہ قوموں اور منفرد شخصوں کے اختلاط اور

اور باہمی میل جول کے مواقع بڑھا کے اُنھوں نے غیر معمولی حد تک اُن کے تعصّبات کی اصلاح کر دی ہے۔ اور ہماری رایوں کو دوسروں کے بارے میں بہتر کر دیا ہے۔ باہمی عداوت گھٹا دی ہے اور اس طور سے ہمارے مشترک فطرت کی بابتہ ایک پسندیدہ خیال شایع کر کے ہم کو اس پر آمادہ کر دیا ہے کہ ہم فہم انسانی کے اُن بیحد و بے نہایت اسباب کے نشو و نما کریں جن کے نفس وجود کا مدعی ہونا بھی ایک زمانہ میں کفر و زندقہ سمجھا جاتا تھا

ٹھیک یہی حالت وہ ہے جو زمانہ حال کے یورپ میں گزری ہے۔ اہل فرانس اور اہل انگلستان محض باہمی اختلاط کے بڑھ جانے کی وجہ سے ایک دوسرے کی نسبت زیادہ اچھا خیال رکھنے لگے اور اُس احمقانہ تحقیر کو دُور کرنا سیکھا جس سے وہ پہلے ایک دوسرے کو دیکھتے تھے۔ دیگر حالات کی طرح اس میں بھی جس قدر زیادہ کوئی متمدن ملک دوسرے سے واقف ہوتا ہے اسی قدر زیادہ وہ اُس کی قدر کرے گا اور اُس کی تقلید پر مائل ہوگا قومی منافرت کے جملہ اسباب میں جہالت سب سے بڑھکے زبردست ہے۔ جب تم میل جول بڑھا دیتے ہو تم جہالت کو دور اور نفرت کو کم کر دیتے ہو۔ نیک نفسی کا حقیقی رابطہ یہی ہے ایک چیز اور یہ قیمت میں اُن تمام سبقوں کے برابر ہے جو اہل اخلاق اور اہل دین پڑھا سکتے ہیں۔ اُن لوگوں نے سیکڑوں برس سے اپنے پیشہ کو جاری رکھا ہے لیکن جنگ وجدل کے وقوع میں اُن کی وجہ سے ذرہ برابر کمی نہ ہونا تھی نہ ہوئی۔ لیکن بغیر کسی قسم کے ادنیٰ مبالغہ کے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہر ایک ریل کی پٹری جو نئی بچھائی جاتی ہے اور ہر نیا اسٹیمر جو چینل کے پار ہوتا ہے وہ اُس طویل اور بے خلل صلح و آشتی میں اور اضافہ کرتا ہے جس کے باعث دنیا کی دو بڑی متمدن قومیں چالیس سال سے اپنے اغراض و فوائد میں متحد ہیں۔

جہاں تک کہ میری حد معلومات میں تھا وہاں تک اُن اسباب کے دکھانے کی کوشش کی ہے جنھوں نے مذہبی خونریزی اور جنگ وجدل کو کم کیا ہے۔ اور یہی وہ دو بدترین مصائب تھے جن سے اب تک انسان نے اپنے بنی نوع کو دکھ دینے کی کوشش کی ہے۔ مذہبی خونریزی کے

زوال کی بحث کو میں نے سرسری طور سے دیکھا ہے کیونکہ اسی جلد کے دوسرے حصّہ میں یہ بحث تکمل کے ساتھ بیان کرنا پڑے گی۔لیکن بہر نوع اس بات کے ثابت کرنے کے واسطے کافی طور سے بیان کیا جاچکا ہے کہ وہ اصل وحقیقت میں ایک عقلی کارروائی ہے اور یہ کہ اخلاقی خیالات کے عمل سے اس معاملہ میں کتنا کم فائدہ مترتّب ہوتا ہے۔ذوق جنگجوئی کے زوال کے اسباب میں نے کسی قدر طوالت سے (جو غالباً اکثر ناظرین کو ناگوار معلوم ہوتی ہوگی) دیکھے بھالے ہیں اور اس تحقیق کا یہ نتیجہ نکلا کہ یہ زوال اہل عقول کی قوّت کی وجہ سے ہوا ہے کہ جن سے فوجی جماعتیں لازمی طور پر مخالف ہوتی ہیں۔اس پر اور گہری نظر ڈالنے سے ہم نے تین ضمنی اسباب بھی دریافت کئے ہیں جن سے اس عام تحریک میں اور سہولت پیدا ہوئی ہے۔یہ تین اسباب یہ ہیں۔بارود کی ایجاد۔علم المعیشت (اقتصاد) کے انکشافات۔اور اعلیٰ وسایل آمدورفت کی دریافت۔یہی تین بڑے طریقے یا ذریعے ہیں جن سے علم کی ترقی نے جنگجوئی کے مذاق کو کمزور کیا ہے اور جس طور سے ان اسبابنے یہ نتیجہ پیدا کیا ہے وہ (مجھے یقین ہے کہ) وضاحت سے بتایا گیا ہے۔اور میں باطمینان وآگہی یہ کہہ سکتا ہوں کہ جو واقعات اور جن دلایل کو میں نے پیش کیا ہے اُن کی بہت باریکی سے اور متواتر جانچ پڑتال کرلی گئی ہے اور مجھے تو کسی طرح یہ معلوم نہیں ہوتا کہ کس ممکن دلیل سے اُن کی صحت وواقعیت پر حرف رکھا جاسکتا ہے۔میں بخوبی جانتا ہوں کہ بعض گروہوں میں وہ دلائل نامطبوع ہوں گے لیکن کسی بیان کا نامطبوع ہونا کوئی ثبوت اُس کے غلط ہونے کا نہیں ہوسکتا۔جن وسائل سے شہادت مہیا کی گئی ہے وہ اور اُن کے دلائل صفائی سے بیان کردیئے گئے ہیں۔اور انھیں سے ایک نہایت اہم نتیجہ نکلا ہے۔اور انھیں دلائل سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ دنیا کی سب سے قدیم، عظیم، شدید اور عالمگیر دو خرابیاں رفتہ رفتہ مگر مسلسل کم ہورہی ہیں اور یہ کہ اُن کی یہ کمی نہ تو اخلاقی خیالات سے کچھ ہوئی ہے نہ اخلاقی تعلیمات سے بلکہ صرف عقل انسانی کی تحریک اور اُن

ایجادات و انکشافات کی بدولت ہوئی ہے۔ جو مدتہائے دراز کی محنت کے بعد انسان سے ظہور میں آئی ہیں۔

پس جبکہ انسانی ترقی کے دو نہایت قوی ارکان میں قوانین اخلاقی یکساں اور مستقل طور سے قوانین عقلی کے تابع رہے ہیں تو یہ نہایت قوی قیاس پیدا ہوتا ہے کہ ادنیٰ درجہ کے معاملات میں بھی یہی کارروائی جاری رہتی ہے۔ اس بات کو پوری پوری طرح سے ثابت کرنا اور اس طور سے اُس قیاس کو مرتبہ یقین پر پہنچانا تاریخ کا مقدمہ کتاب لکھنا ہوگا بلکہ خود تاریخ ہی کا لکھنا ہو جائے گا۔ لہذا سر دست پڑھنے والے کو اسی پر قناعت کرنا چاہئے جو میرے خیال میں اثبات کے قریب قریب ہے اور اثبات کامل کو اس کتاب کے آیندہ جلدوں کے واسطے رکھ چھوڑنا چاہیئے جس میں اس امر کے ظاہر کرنے کا حتمی وعدہ کرتا ہوں کہ یورپ نے حالت وحشت سے جو ترقی حالت تمدن میں کی ہے وہ کلیۃً اُس کی عقلی کارگزاری پر مبنی ہے۔ اور یہ کہ سر برآوردہ ممالک اب کئی سو برس سے کافی طور پر اتنا آگے بڑھ گئے ہیں کہ اُن کارکنان طبعی کے اثر سے اپنے کو خلاص کرلیں جو سوسائٹی کے ابتدائی حالت میں ضرور مزاحم ہوتے اور گو کار پردازان اخلاقی ہنوز بہت زبردست ہیں اور اب تک وقتاً فوقتاً مخل ہو جایا کرتے ہیں لیکن یہ صرف ایسے اختلال ہوتے ہیں کہ اگر زمانے کی بڑی بڑی مدتیں لی جائیں اور ان کا مقابلہ کیا جائے تو ایک قسم کا توازن نظر آئے گا اور مجموعی حالت میں ان اختلالات کا اثر بالکل زائل ہو جائے گا۔ حتیٰ کہ ایک بڑی اور جامع حیثیت سے نظر کرنے پر ہر متمدن قوم کے انقلابات بحیثیت مجموعی صرف تین امور پر مبنی ہوتے ہیں اولاً علم کی اُس مقدار پر جو اُس قوم کے قابل ترین اشخاص کو حاصل ہوتی ہے۔ ثانیاً اس بات پر کہ علم وہاں کیا رنگ اختیار کرتا ہے یعنی وہ کس قسم کے مضامین و مباحث سے متعلق ہے اور ثالثاً سب سے بڑھکر یہ کہ کس حد تک علم کی اشاعت ہوتی ہے اور سوسائٹی کے ہر طبقہ میں شائع ہونے کی کہاں تک آزادی حاصل ہے بالآخر

یہ تین محرک اعظم ہر متمدن ملک کے ہیں اور اگرچہ زبردست اشخاص کے معائب یا محاسن سے اُن کی کارروائی میں اکثر خلل پڑجایا کرتا ہے لیکن ایسے اخلاقی خیالات ایک دوسرے کی اصلاح و درستی کردیا کرتے ہیں اور اگر زمانے کی بڑی بڑی مدتوں کا خیال کیا جائے تو اس کا کچھ زیادہ اثر نہیں پڑتا۔ بیشک ایسے اسباب ہیں جن کا ہم کو علم نہیں ہے صفات اخلاقی برابر ادلتے بدلتے رہتے ہیں۔ حتیٰ کہ ایک انسان میں یا غالباً ایک نسل میں بھی نیک ارادے غالب ہوتے ہیں اور دوسرے میں بدنیتی بڑھ جاتی ہے لیکن ہمارے پاس یہ خیال کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ کوئی مستقل انقلاب اُس تناسب میں واقع ہوا ہے جو فیمابین اُن اشخاص کے جو فطرتاً نیک ارادے رکھتے ہیں اور اُن اشخاص کے جن میں بالخلقت بدنیتیں ہوتی ہیں ہوتا ہے۔ جہاں تک ہم واقف ہیں نوع انسانی کے طبعی اور جبلّی اخلاق میں کوئی ترقی نہیں ہوئی ہے۔ وہ متعدد جذبات جنھیں لے کے ہم پیدا ہوئے ہیں اُن میں بعض ایک زمانہ میں زیادہ رائج پائے جاتے ہیں اور بعض دوسرے زمانے میں۔ لیکن تجربہ ہم کو یہ سکھاتا ہے کہ چونکہ وہ ہمیشہ ضدیک دگر ہوتے ہیں لہذا بوجہ تخالف باہمی اُن کا تناسب اور توازن قایم رہتا ہے۔ اور ایک تحریک کی کارگزاری دوسرے کی کارگزاری کے سبب درست ہوتی رہتی اور اصلاح پاتی رہتی ہے۔ کیونکہ ہر بُرائی کے لئے اُس کا جواب بھلائی ہے۔ ظلم کا تدارک فیضرسانی سے ہوتا ہے۔ ہمدردی کی تحریک مصیبت کرتی ہے۔ بعض اشخاص کی ناانصافی دوسروں کی فیاضی کو مشتعل کرتی ہے۔ نئی خرابیوں کا انسداد نئے علاجوں سے کیا جاتا ہے حتیٰ کہ سب سے بھاری جرایم نے بھی اپنے بعد کوئی مستقل نشان نہیں چھوڑا ہے۔ ملکوں کی تباہی و بربادی اور انسانوں کی قتل و خونریزی و نقصانات ہیں جن کی تلافی میں کبھی ناکامی نہیں ہوتی اور چند ہی صدیوں کے بعد اُن کا ہر نشان مٹ جاتا ہے۔ سکندر اور نپولین کے سنگین گناہ چند ہی مدّت کے بعد بے نشان ہوجاتے ہیں اور معاملات دنیا

پے طرح تعاقب پر آرہے ہیں۔ یہ تاریخ کا مد و جزر ہے اور وہ دائمی بے تابی ہے جس کی ہم لوگ اپنے فطرت کی رو سے محکوم ہیں۔ اس سب پر بالاتر اور کہیں زیادہ بلند ایک اور تحریک ہی اور جیسا جیسا طوفان کا زور ہوتا ہے کبھی آگے بڑھتا اور کبھی پیچھے ہٹتا ہے اُس کے بیشمار عروج و زوال میں ایک اور صرف ایک ہی شے ایسی ہوتی ہے جو ہمیشہ باقی رہتی ہے بُرے آدمیوں کے افعال عارضی بُرائی اور نیک آدمیوں کے افعال عارضی نیکی پیدا کرتے ہیں بالآخر نیک اور بد دونوں بالکل پست پڑجاتے ہیں۔ مابعد کی نسلیں اُن میں معادلہ کرتی ہیں اور قرون مستقبلہ کے پیاپے تحریکات انھیں جذب کرلیتی ہیں۔ لیکن بڑے لوگوں کے انکشافات کبھی ہمارا ساتھ نہیں چھوڑتے۔ وہ غیر فانی ہوتی ہیں۔ اُن میں وہ حقایق ازلی بھرے ہوتے ہیں جو سلطنتوں کے ٹکرا جانے پر بھی باقی رہتی ہیں۔ مختلف عقاید و ملل کے کشاکشوں میں زندہ بچتے اور مذاہب کے زوال ان کے سامنے سے گزرجاتے ہیں۔ ان سب کی جُداگانہ پیمانہ اور جداگانہ معیار ہوتے ہیں ایک زمانہ کے واسطے ایک مجموعۂ آرا خیالات اور دوسرے عہد کے لئے دوسرا۔ وہ خواب کی طرح گزرجاتے ہیں اور تار و پود خیال کی طرح ہوتے ہیں جو اپنے بعد کوئی نشان نہیں چھوڑتے۔ مگر صرف ذکاوت طبعی کے انکشافات باقی و قایم رہتے ہیں۔ اور یہ جو کچھ آج ہمارے پاس ہی یہ سب اُنھیں کی بدولت ہی۔ وہ ہر عہد کے لئے اور ہر زمانہ کے واسطے ہوتے ہیں نہ کبھی نئے ہوتے ہیں نہ کبھی پُرانے۔ وہ اپنی زندگی کے آپ ہی پھل پھول لاتے ہیں۔ وہ ایک لازوال چشمۂ جاری میں بہتے ہیں۔ وہ گزشتہ محنتوں کا مجموعہ ہیں جسمیں آیندہ اضافے ہوتے رہتے ہیں۔ اس طور سے وہ نہایت بعید زمانہ مستقبل پر موثر ہوتے ہیں اور صدہا برس گزرجانے پر اُس سے زیادہ اثر دکھاتے ہیں جتنا وہ اُس وقت دکھا سکتے تھے جبکہ وہ ظہور میں آئے اور شایع ہوئے تھے۔

باب پنجم

مذہب علوم وفنون اور حکومت کے

اثر کی تحقیق

تاریخ انسان پر تحقیقات کے اُن طریقوں کی چسپاں کرنے سے جو علم کے دوسرے شعبوں میں کامیاب ثابت ہوئی ہیں اور اُن تمام خیالات کو دُور کرنے سے جو اُن طریقوں کے معیار پر ٹھیک نہیں اُتر سکتے ہم چند نتائج پر پہنچتے ہیں۔ اور ان نتائج کے عنوان کا اعادہ کرنا اس وقت مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ ہمارے افعال چونکہ کلیتہً نتیجہ ہوتے ہیں کارکنان داخلی وخارجی کے اس لئے اُن افعال کی توجیہ اور تشریح انھیں کارکنوں کی قواعد وقوانین سے ہوسکے گی یعنی ذہنی (عقلی) اور طبیعی قوانین ہی اُن کی توجیہ کرسکیں گے۔ ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ یورپ میں قوانین عقلی بہ نسبت قوانین طبعی کے زیادہ زوردار ہیں اور تمدن کی رفتار ترقی میں اُن کا تفوق برابر بڑھ رہا ہے۔ کیونکہ روزافزوں علم ذہنی ترقی کے ذرائع تو اضعافاً مضاعفاً بڑھا رہا ہے لیکن فطرت کے کُہنہ ذرائع جہاں کے تہاں قایم ہیں۔ اسی بنیاد پر ہم نے قوانین عقلی کو ترقی کا بڑا رہنا خیال کیا ہے اور قوانین طبعی کی نسبت ہمارا خیال ہے کہ ان کا درجہ کمتر ہے اور ان کا ظہور بھی کبھی کبھی ہوتا ہے اور ایک مدّت سے ان کا زور گھٹ رہا ہے اور اب وہ قریب قریب بے اثر ہوتے جاتے ہیں اس طور سے سوسائٹی کی قوام وترکیب کو قوانین نفس انسانی کے مطالعہ میں سمیٹ لیا اور اس کے بعد قوانین نفس انسانی کی تحلیل کی تو

ان دونوں اجزا کے مقابلہ سے ہم کو یہ بات تحقیق ہو گئی کہ قوانین عقل بہت غالب اور
فایق ہیں اور ہم نے یہ دیکھ لیا کہ جس طرح تمدن کی ترقی قوانین طبعی پر قوانین عقلی کی
فتحیابی سے وابستہ ہی ٹھیک اُسی طرح وہ قوانین تہذیب اخلاق پر قوانین عقل کی فتح
سے مُنضم ہی۔ یہ اہم قیاس دو بالکل واضح دلایل پر مبنی ہے۔ اوّل یہ کہ چونکہ حقایق
اخلاقی بحال خود قایم رہتے ہیں اور حقایق عقل ترقی کرتے رہتے ہیں اس لئے ظن غالب
یہ نہیں ہے کہ سوسائٹی کی ترقی اخلاقی معلومات پر مبنی ہو کہ جو کئی صدیوں سے یکساں
چلی آتی ہے بلکہ وہ عقلی معلومات پر مبنی ہو گی کہ جو کئی صدیوں سے برابر بڑھ رہی ہے
دوسری دلیل اس واقعہ سے پیدا ہوتی ہے کہ اخلاق کی ترقی سے دو بدترین
ذمایم میں بھی کمی نہ ہوئی۔ البتہ عقلی انکشافات کے اثر سے وہ ہمیشہ دبتی رہیں اور
اب تک دب رہی ہیں۔ ان امور سے بداہتاً یہ نتیجہ نکلتا ہی کہ اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ
اُن حالات کو یقین کے ساتھ معلوم کریں جو موجودہ تمدن کی ترقی کی رہنمائی کرتے
ہیں تو ہم کو لازم ہے کہ ہم انھیں عقلی معلومات کی مقدار اور نشر و اشاعت کی تاریخ
میں تلاش کریں اور ہم کو آثار طبیعی اور اصول اخلاقی کے بارے میں بس یہ سمجھ لینا
چاہیئے کہ بےشک اُن کے سبب سے قلیل زمانوں میں تو بڑے بڑے تغیرات ہوتے ہیں
لیکن طویل زمانوں میں ان کا اثر بہت کم ہو جاتا ہے۔ اور اس طور سے وہ قوانین عقلی
ادنیٰ اور ماتحت کارکنوں کے اثر سے آزاد ہو کے اپنا عمل کرتے رہتے ہیں۔

صحت کے ساتھ غور و فکر کرنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں اور اسی پر ہم اب قایم
ہیں کہ منفرداً اشخاص کے افعال و حرکات زیادہ تر اُن کے اخلاقی خیالات اور اُنکے
ذاتی جذبات سے متاثر ہوتے ہیں۔ لیکن چونکہ وہ دوسرے لوگوں کے خیالات و جذبات
سے مخالف و متعارض ہوتے ہیں۔ لہذا اُن کے سبب سے اعتدال پاتے رہتے ہیں۔ حتیٰ کہ

معاملات انسانی کے بڑے مجموعہ کے لحاظ سے ان اخلاقی خیالات اور ذاتی جذبات کا اثر کہیں بھی معلوم نہیں ہوتا۔ اور نسل انسانی کے جمیع افعال و حرکات کی رہبری بحیثیت مجموعی اس مقدار علم سے ہوتی ہے جو بنی نوع انسان کی قدرت میں ہوتا ہے۔ اب رہی یہ بات کہ منفرداً اشخاص کے خیالات اور اُن کے ذاتی خواہشات کیونکر فنا ہوتے یا جذب ہوجاتے ہیں اس کی واضح تشریح اُن واقعات سے ہوتی ہے جو ہم نے جرائم و معاصی کی تاریخ میں بیان کئے ہیں۔ کیونکہ اُن واقعات سے قطعی طور پر یہ ثابت ہوچکا ہے کہ کسی ملک میں جس قدر جُرم ہوتے ہیں اُن کی تعداد سال بسال نہایت حیرت انگیز طور سے یکساں رہتی ہے۔ اور جن متلوں اور شخصی خیالات سے اکثر واقعات انسان کے افعال و حرکات منسوب کئے جاتے ہیں اُن کا کچھ بھی اثر اُس پر نہیں پڑتا لیکن اگر بجائے اس کے کہ ہم سال بسال جرایم و معاصی کی تاریخ کا مطالعہ کریں اُسی ماہ بماہ مطالعہ کرتے ہیں تو ہم اُس میں بہت ہی کم باقاعدگی پاتے ہیں اور اگر ہم اُسے ساعت بساعت مطالعہ کرتے ہیں تو اُس میں کوئی باقاعدگی پاتے ہی نہیں۔ پھر اگر ہم کسی پورے ملک کے جرایم کی روئداد کے عوض کسی ایک گلی کوچہ یا ایک خاندان کی روئداد پر غور کرتے ہیں تو وہاں بھی اُس میں کوئی باقاعدگی نظر نہیں آتی۔ یہ اس سبب سے ہے کہ وہ بڑے بڑے قوانین معاشرت جن کے جرایم تابع ہیں اُن کا پتہ بڑی تعدادوں اور بڑی مدتوں ہی پر غور کرنے سے چل سکتا ہے۔ لیکن ایک چھوٹی سی تعداد یا قلیل میعاد میں شخص واحد کے اصول اخلاقی غالب رہتے اور اپنے سے بڑے اور عقلی قانون کے عمل میں خلل انداز ہوتے ہیں۔ پس درآنحالیکہ وہ اخلاقی خیالات جن سے ایک انسان کسی جُرم کے ارتکاب یا اُس سے احتراز پر مجبور رہتا ہے اُن کا بہت بڑا اثر اُس کے اپنے جرموں کی تعداد پر ہوگا اُن کا کوئی بھی اثر جرایم کی اُس تعداد پر نہ پڑے گا جو اُس سوسائٹی میں واقع ہوں گے جس میں وہ شخص شامل ہے۔ کیونکہ

افعال کا باعث ہوتے ہیں اُن میں تعدیل پیدا ہو جاتی ہے۔ ٹھیک اسی طور سے ہم لوگ واقف ہیں کہ اگرچہ قریب قریب ہمارے کُل افعال و حرکات پر اخلاقی اصول اثر ڈالتے ہیں لیکن ہمارے پاس اِس کے لاجواب ثبوت موجود ہیں کہ اُن کا کوئی اثر عمومی حیثیت سے نوعِ انسانی پر یا عوام الناس کے بڑے گروہ پر نہیں پڑتا بشرطیکہ ہم اتنی احتیاط کریں کہ آثارِ معاشرتی کو ایسی مدّت میں جو کافی طور سے اس قدر طویل ہو اور ایسے پیمانہ پر جو کافی طور سے اتنا وسیع ہو کہ غالب اور برتر قوانین بے روک ٹوک عمل کر سکیں مطالعہ کریں۔

پس جب اس طور سے افعالِ انسانی کا کل مجموعہ (اعلیٰ نقطۂ نظر سے) علمِ انسانی کے کل مقدار کا مطیع ہے تو یہ نہایت آسان بات معلوم ہوگی کہ ہم علم کے متعلق شہادت جمع کریں اور از روئے استقرا اُن کُل قوانین کو دریافت کریں جو ترقی تمدن کی رہنمائی کرتے ہیں۔ اب یہ امر کہ ایسا ہو بھی سکے گا مجھے اس کی بابت کچھ بھی شک و شبہ نہیں ہے۔ لیکن بدقسمتی سے تاریخ کو ایسے آدمیوں نے لکھا ہے کہ جن میں اُس مہم کے سر کرنے کی لیاقت ہی نہ تھی جو اُنھوں نے اپنے سر لی تھی اور اس وجہ سے ضروری جو سامان تھا وہ ہنوز بہت کم یکجا کیا گیا ہے۔ بجائے اس کے کہ مؤرخین ہم سے ایسی باتیں کہتے جو کہنے کے قابل تھیں اور بجائے اس کے کہ وہ ہم سے معلومات کی ترقی اور جس طور سے علم کی اشاعت سے نوعِ انسانی متاثر ہوئی تھی اُس کے بابتہ وہ ہم کو اطلاع دیتے اُن کے ایک بڑے گروہ نے اپنی تصانیف کو بہت ہی خفیف اور رکیک جزئیات سے بھر دیا ہے مثلاً بادشاہوں کے ذاتی قصص و حکایات اور اُن کے درباروں کے واقعات ایک وزیر نے کیا کہا اور دوسرے وزیر نے کیا خیال کیا اس کی بابتہ بیشمار روایات بھری پڑی ہیں اور اس سے بھی بدتر یہ کہ جنگ و جدل، حملوں اور محاصروں کی طولانی داستانیں کہ جو اُن لوگوں کے واسطے تو دلچسپ ہوں گی جو اُن معرکوں میں شریک تھے

لیکن ہمارے لئے محض بیکار ہیں کیونکہ نہ تو ہمارے واسطے وہ کوئی نئے حقایق مہیّا کرتے ہیں نہ ایسے وسایل جمع کرتے ہیں جن سے جدید حقایق منکشف ہوسکیں ۔ یہ وہ اصلی رکاوٹ ہے جو ہماری پیشقدمی میں حائل ہے۔ یہی قوت فیصلہ کا معدوم ہونا اور یہ نہ جاننا کہ کون شے سب سے بڑھکے انتخاب کے قابل ہے ہم کو اُن ذرائع سے محروم کئے ہوئے ہے کہ جیسے اب سے بہت پیشتر جمع ہو جانا، ورمرتب کر رکھنا اور آیندہ ضروریات کے واسطے محفوظ کر دینا چاہیئے تھا۔ علم کی دوسری بڑی شاخوں میں پہلے دیکھ بھال کی جاتی ہے پھر انکشافات کی نوبت آتی ہے۔ یعنی پہلے واقعات قلمبند کئے گئے پھر اُن کے قوانین دریافت ہوئے لیکن تاریخ انسان کے مطالعہ میں اہم واقعات نظرانداز کئے گئے، اور بیکار باتیں محفوظ رکھی گئیں۔ انجام یہ ہے کہ اب جو کوئی شخص آثار تاریخ پر استقراء کرنا چاہتا ہے اُسے لازم ہوتا ہے کہ وہ خود ہی واقعات بھی جمع کرے اور استقراء کی کارروائی کی سربراہی بھی کرے۔ اُسے کوئی شے لیس نہیں ملتی۔ اُسے خود ہی پہلی عمارت کا نقشہ کھینچنا پھر اُسے بنانا پڑتا ہے۔ اُسے تعمیر کا صرف منصوبہ بنانا نہیں ہوتا بلکہ اُس کے لئے کان سے پتھر نکالنا بھی پڑتا ہے۔ اس دوہری محنت کی ضرورت ایک فلسفی کے سر پر اتنی ذلیل خدمت کا بار ڈالتی ہے کہ ایک پوری مدّت حیات اس کام کے واسطے کافی ہو نہیں سکتی اور تاریخ بجائے اس کے کہ کامل اور جامع استقراء کے واسطے لیس ہو (جیسا اُسے ہونا چاہیئے تھا) اب تک ایسی اَن گھڑ اور بے ترتیب حالت میں ہے کہ سخت متواتر محنت اور مسلسل کوشش سے بھی کوئی شخص انسانوں کے حقیقی اہم افعال و حرکات پر دو صدیوں کی قلیل مدت میں حاوی نہ ہوسکے گا۔

انھیں امور کے لحاظ سے عرصہ ہوا میں نے اپنے اصلی منصوبہ کو ترک کر دیا ہے اور اکراہ کے ساتھ یہ قصد کر لیا ہے کہ عام تمدن کی تاریخ نہ لکھوں بلکہ صرف ایک قوم کی تاریخ لکھوں۔ اس ذریعہ سے درآنحالیکہ ہم میدان تحقیق کو تنگ کر رہے ہیں بدقسمتی سے

یہ بالکل سچ ہے کہ افعال وحرکات انسانی کا مجموعہ (اگر مُدتہائے مدید میں خیال کیا جائے تو) منحصر وموقوف ہوتا ہے علم انسانی کے مجموعہ پر لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ یہ بڑا اصول جب کسی ایک ہی ملک پر چسپاں کیا جاتا ہے تو اپنی اصلی قدر وقیمت کھو دیتا ہے جس قدر ہم اپنے مشاہدات کو گھٹائیں گے اُسی قدر اوسط حالت کی بابتہ تیقن کم ہو جائے گا۔ اسے یوں سمجھنا چاہیئے کہ اُسی قدر زیادہ احتمال اس کا ہو سکے گا کہ بڑے بڑے قوانین کے عمل میں چھوٹے چھوٹے قوانین خلل انداز ہوں۔ مثلاً اوّل خارجہ کی مداخلت ایک بیرونی قوم کے آرا وخیالات علوم وفنون اور رسم ورواج کا اثر۔ اُن کی حملہ آوریاں بلکہ غالباً اُن کے فتوحات۔ اُن کا جدید مذہب، جدید قوانین، جدید ادب آداب کو زبردستی ٹھونس دینا یہ سب باتیں وہ فتور برپا کرتی ہیں جو اُس وقت کہ جب تاریخ عالم پر عام حیثیت سے نظر ڈالی جاتی ہے معادلتہ قایم رکھتی رہتی ہیں لیکن جس وقت ایک ہی ملک کی تاریخ دیکھی جاتی ہے تو فطرتی رفتار میں رخنہ انداز ہوتی اور تمدن کے حرکات کا حساب لگانا مشکل کر دیتی ہیں۔ میں نے جس صورت سے اس مشکل کو سر کرنا چاہا ہے وہ آگے چل کے بیان ہوگی۔ لیکن جو بات میں پہلے جتانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ کن وجوہ سے میں اس پر مائل ہوا ہوں کہ تاریخ انگلستان کو اوروں سے زیادہ مفید اور اہم سمجھکے منتخب کروں اور اُسی کو ایک کامل اور فلسفیانہ تحقیقات کے واسطے سب سے زیادہ موزوں سمجھوں۔

اب یہ کھُلی ہوئی بات ہے کہ جب واقعات پارینہ کے مطالعہ میں سب سے بڑھکے یہ فائدہ مضمر ہے کہ اس کا امکان ہوتا ہے کہ شاید وہ قوانین تحقیق ہو جائیں جن سے وہ واقعات وابستہ تھے تو کسی قوم کی تاریخ کا مطالعہ اُسی تناسب سے زیادہ قابل قدر وقیمت ہے جس تناسب سے اُس قوم کے افعال وحرکات میں ایسے کارکنوں کی وجہ سے خلل نہیں

پڑا جو خود اُس قوم سے پیدا نہیں ہوئے تھے۔ کیونکہ ہر ایک خارجی اثر جو کسی قوم پر ڈالا جاتا ہے وہ اُس قوم کی فطری نشو ونما میں دخل درمعقولات کرنے والا ہوتا ہے اور اُس کے سبب سے اُن حالات میں پیچیدگی پیدا ہو جاتی ہے جن کی تحقیق کی ہم کوشش کر رہے ہیں۔ تمام اقسام علوم میں اصل شرط کامیابی یہ ہے کہ پیچیدگیوں کو سلجھا کر صاف کر دیا جائے یہ بات اُن لوگوں کو بخوبی معلوم ہے جنھیں علوم طبیعی میں شغف رہتا ہے کیونکہ وہ لوگ اکثر اوقات صرف ایک ہی تجربہ سے ایسے امر حق کو دریافت کر لیتے ہیں جس کی تلاش بیشمار مشاہدات نے محض فضول کی تھی۔ اس کی علت یہ ہے کہ مظاہر پر تجربہ کرنے سے ہم اُن کو پیچیدگیوں کے اُلجھاوے سے نکال لیتے ہیں اور اس طور پر اُنھیں نامعلوم کارکنوں کے مداخلت سے الگ کر دیتے ہیں کہ وہ اپنی راہ آپ چلائیں اور اپنے قانون کے عمل کو آپ ہی دکھلائیں۔

پس یہ ایک سچا معیار ہے جس پر ہم کو کسی قوم کی تاریخ کی قدر و قیمت پرکھنا چاہیے۔ کسی ملک کی تاریخ کی اہمیت اور فضیلت اُس کی فتوحات کی شان و شکوہ پر موقوف نہیں ہے بلکہ اس بات پر موقوف ہے کہ کس حد تک اُس کے کارنامے خود اُس قوم کے اپنے پیدا کیے ہوئے اسباب سے ظہور پذیر ہوئے۔ لہذا اگر ہم کو کوئی ایسی قوم نظر آئے جس نے اپنے تمدن کی راہ آپ ہی نکالی ہو، جس نے کل خارجی اثروں سے اپنے آپ کو آزاد کر لیا ہو اور جس کو خود اپنے حکمرانوں کی ذاتی مخصوصات سے نہ فیض پہنچا ہو نہ نقصان تو ایسی قوم کی تاریخ بیحد اہم ہوگی۔ کیونکہ وہ ہمارے سامنے ایک بالقوہ اور متوسط درجہ کی ترقی کی حالت پیش کرے گی۔ وہ ترقی کے ایسے قوانین ظاہر کرے گی جو تنہا عمل کرتے ہیں حقیقت میں وہ ایک تیار بنا بنایا تجربہ ہوگا اور مصنوعی ترکیب و قوام کے وہ کل خواص اُس میں موجود ہوں گے جن کے علوم طبیعی اس درجہ ممنون ہیں۔ ایسی قوم کا پا لینا بظاہر ناممکن ہے۔ لیکن ایک فلسفی مؤرخ کا فرض یہ ہے کہ وہ اپنے

ہوئی ہے۔ اب یہ بات نہ صرف ہم لوگ بلکہ بیرونی ذی لیاقت اشخاص بھی تسلیم
کرلیں گے کہ کم از کم گزشتہ تین صدیوں میں یہ بات اور ملکوں کی بہ نسبت انگلستان میں
کہیں زیادہ مسلسل طور سے اور کامیابی کے ساتھ کی گئی ہے۔ میں اپنے یہاں کے
انکشافات کی تعداد، اپنے علوم وفنون کی درخشانی یا اپنے یہاں کے اسلحہ کی
ظفرمندی کی بابتہ کچھ نہیں کہتا۔ یہ بہت فضول مباحث ہیں اور غالباً دوسری قومیں
اُن برتر صفات کے منکر ہوں گے جنھیں ممکن ہے کہ ہم بہ مبالغہ بیان کرتے ہوں
لیکن میں صرف ایک ہی امر کو لیتا ہوں کہ یورپ کی کُل ملکوں میں انگلستان ہی
ایک ایسا ملک ہے جس میں ایک مدّت مدید تک نہایت متحمل اور رعایا بہت ہی کارگزار
رہی ہے۔ جس میں جمہور کی آزادی وسیع ترین بنیاد پر قایم رہی ہے۔ جہاں ہر انسان کو
اپنے خیال کے ظاہر کر دینے پر اور جو وہ چاہتا ہے اُس کے کر گزرنے پر کامل آزادی
حاصل رہی ہے۔ جہاں ہر شخص اپنی مرضی کے مطابق مشغلہ جاری رکھ سکتا اور اپنی رائیں
شائع کرسکتا ہے۔ جہاں (چونکہ مذہبی سفّاکیوں سے کوئی آشنا ہی نہ تھا اس لیے) طبیعت
انسانی کا ایسے رُکاوٹوں سے جو اور مقامات پر اُسے حایل تھیں آزاد ہو کے پھولنا
پھلنا صاف نظر آسکتا ہے۔ جہاں کفر و ارتداد کا پیشہ بہت کم خطرناک اور اظہار نارضامندی
کا عمل بہت زیادہ رواج پذیر رہا ہے۔ جہاں مُتضاد عقاید پہلو بہ پہلو نشو و نما پاتے اور
بغیر خلل کے بلکہ رعایا کی حاجتوں کے مطابق کلیسیا کی خواہشوں سے غیر متاثر اور حکومت
کے جبروت سے بے مزاحمت بڑھتے اور ہٹتے رہے ہیں۔ جہاں ہر غرض اور ہر مقصد
کے لوگ ہر طبقہ و فرقہ والے (خواہ وہ دینی ہوں یا دنیاوی) اپنے آپ ذمہ دار
ہیں۔ جہاں اُس خانہ برانداز اصول کی بھی سب سے پہلے دھجیاں اُڑائی گئیں جسے "حفاظت"

سے جو باعث مداخلت ہوئے ہیں استبداد و سرکشی دونوں شاذ ہو گئے۔ اور نظام عمل کی بنیاد عطائے حقوق و مراعات پر تسلیم کر لینے سے قومی ترقی میں مخصوص و ممتاز طبقہ والوں کی قوت خاص خاص جماعتوں کے اثر و اقتدار یا خود سر فرماں رواؤں کی تعدّی نے بہت ہی کم خلل ڈالا ہے۔

یہ امر کہ تاریخ انگلستان کے یہی مخصوصات ہیں ایک مشہور و معروف بات ہے بعضوں کے نزدیک سرمایۂ افتخار اور بعضوں کے نزدیک قابل حسرت و افسوس اور جب ہم ان حالات میں یہ بات اضافہ کرتے ہیں کہ چونکہ انگلستان ایک جزیرے کی قطع پر واقع تھا اس وجہ سے گزشتہ صدی کے وسط تک بہت ہی شاذ و نادر کسی سیّاح کا وہاں گزر ہوا لہٰذا یہ بدیہی بات ہے کہ بحیثیت ایک قوم کے ہم بہ نسبت اوروں کے اپنی ترقی میں ان دو اسباب مداخلت سے بہت ہی کم متاثر ہوئے یعنی حکومت کے اختیار اور باہر والوں کے اقتدار نے ہم پر کچھ اثر نہیں ڈالا۔ سولھویں صدی میں انگریزی عماید و روسا کا یہ ایک فیشن ہو گیا تھا کہ وہ براعظم (یورپ) کی سیر و سیاحت کیا کرتے تھے لیکن باہر والے رؤسا و عماید کو انگلستان کی سیر کا شوق پیدا نہیں ہوا تھا ہمارے یہاں سولھویں صدی میں تفریح کی غرض سے سیر و سفر کرنے کا رواج اتنا پھیل گیا تھا کہ دولتمند اور سست طبقہ والوں میں چند ہی انگریز ایسے تھے جنھوں نے عمر بھر میں کم سے کم ایک بار بھی چینل (نہر انگلستان) کو عبور نہ کیا ہو۔ حالانکہ دوسرے ملکوں کے اسی طبقہ والے کچھ اس وجہ سے کہ وہ دولتمند کم تھے اور کچھ اس وجہ سے کہ اُنھیں سمندر سے بشدت نفرت تھی بمشکل کبھی ہمارے جزیرے میں قدم رکھتے تھے۔ البتہ کسی خاص کاروبار کی وجہ سے اگر ایسے ہی مجبور ہو جاتے تھے تو ادھر کا رُخ کرتے تھے۔ انجام یہ تھا کہ دوسرے ملکوں میں اور علی الخصوص فرانس واطالیہ میں بڑے بڑے شہروں کے آدمی رفتہ رفتہ باہر والوں سے مانوس

ہوتے تھے اور جیسا کہ عام قاعدہ ہے جو کچھ وہ بار بار دیکھتے تھے اس سے غیر محسوس طور پر متاثر ہوتے تھے۔ برعکس اس کے ہمارے بہتیرے شہر ایسے تھے جن میں انگریزوں کے سوا اور کسی کے کبھی قدم بھی نہ آئے تھے۔ اور دارالسلطنت تک کے باشندے ایسے تھے کہ بوڑھے ہوجاتے تھے اور کسی باہر والے کی صورت تک سے آشنا نہ ہوتے تھے باستثنار کسی مجہول اور شوکت پسند سفیر کے جو ٹیمس کے کنارے ہوا کھانے نکل آتا ہوگا۔ اور اگرچہ یہ اکثر کہا جاتا ہے کہ چارلس ثانی کی مراجعت کے بعد ہماری قومی سیرت بہت زیادہ فرانس کی تقلید کرنے لگے تھے لیکن (جیسا میں آگے چل کے کامل طور سے ثابت کروں گا) یہ بات سوسائٹی کی اُسی چھوٹی سی بے حقیقت حصہ تک محدود تھی جو دربار شاہی میں منڈلایا کرتا تھا اور اُس نے کوئی نمایاں اثر اہل علم اور اہل مشقت کے اہم ترین جماعتوں پر نہیں ڈالا تھا۔ بیشک اس تحریک کا کھوج ہمارے ادب وانشا کے نہایت مہمل وخرافات حصص میں مثلاً بکنگھم، ڈارسٹ، اتھرج کلیگریو، ملگریو، راچسٹر اور سڈلی کے بے حجاب (حیاسوز) طبع زادوں میں مل سکتا ہے۔ لیکن نہ اُس وقت نہ بہت دنوں بعد تک ہمارے اعلیٰ درجہ کی اہل تخیل و فکر سے کوئی شخص بھی فرانس کی ذکاوت سے متاثر ہوا۔ برخلاف اس کے اُن کے خیالات اور نیز اُن کے طرز بیان میں ہم ایک قسم کی ناملائم اور مخصوص قوت پاتے ہیں جو اگرچہ ہمارے زیادہ شائستہ ہمسایوں کے واسطے موجب ناگواری طبع ہو لیکن کم از کم اُس میں یہ خوبی ہے کہ وہ خاص ہمارے اپنے ملک کی پیداوار ہے۔ فرانس اور انگلستان کی عقل و فراست میں جو علاقہ بعد کو پیدا ہوا اُس کی ابتدا اور اُس کی حد و نہایت کی بحث نہایت اہم اور نتیجہ خیز ہے لیکن اسی قبیل کے دیگر مباحث کی طرح (جو اصلی قدر و قیمت رکھتے تھے) یہ بحث بھی مؤرخین نے قاطبۃً نظر انداز کردی ہے۔ میں اس تصنیف میں اس کمی کے پورا کرنے کی کوشش کروں گا لیکن سر دست مجھے

یہ کہنا ہے کہ اگرچہ ہم لوگ بربنائے ذوق و شایستگی اور اوضاع و اطوار بلکہ سچ تو یہ ہے کہ زندگی کی ساری لطافتوں کی ترقی کے اہل فرانس کے نہایت ممنون تھے اور اب بھی ہیں مگر ہم نے اُن سے کوئی ایسی شے مستعار نہیں لی ہے جو بالکل ضروری واجب الادعائی ہو نہ ایسی کوئی شے جس کی بدولت قوموں کی قسمتیں مستقلاً تبدیل ہو جایا کرتی ہیں۔ برعکس اس کے اہل فرانس نے نہ صرف ہم سے نہایت ہی قابل قدر سیاسی نظام مستعار لئے ہیں بلکہ فرانس کی تاریخ میں جو سب سے اہم واقعہ ہوا ہے وہ ہمارے اثر و اقتدار پر کچھ کم مبنی نہ تھا۔ جیسا کہ مشہور و معروف ہے اُن کا ۱۷۸۹ء کا انقلاب عظیم اُن چند بزرگوں کا برپا کیا ہوا تھا جن کی تصانیف اور تقریروں نے رعایا کو سرکشی پر اُبھار دیا تھا لیکن جو بات کم معلوم و معروف مگر حقیقت میں سچی ہے یہ ہے کہ ان سربرآوردہ سرگروہوں نے انگلستان ہی میں وہ فلسفہ پڑھا اور اُن اصول کو سیکھا تھا کہ جو اُن کے ملک میں جا کے ایسے خوفناک لیکن سودمند پھل پھول لائے۔

مجھے اُمید ہے کہ یہ نہ خیال کیا جائے گا کہ ان بیانات سے میرا یہ مطلب ہے کہ میں اہل فرانس کا کچھ خاکہ اُڑاتا ہوں۔ وہ بھی ایک بڑی اور قابل تعریف قوم ہے اور ایسی قوم ہے کہ جو بہت سی حیثیتوں سے ہم سے بڑھ کے ہے۔ ابھی ہم کو بہت کچھ اُن سے سیکھنا ہے اور اُن میں جو جو کچھ نقص یا خامی بھی ہے گو وہ کیسی ہی ہو لیکن اُس کی ابتداء خود سر فرماں رواؤں کے ایک طولانی سلسلہ کے دائمی دخل در معقولات سے ہوئی ہے لیکن اگر اس معاملہ پر مؤرخانہ نظر ڈالی جائے تو یہ بات بےچون و چرا صحیح ہے کہ ہم نے اپنے تمدن کی مہم سر کرنے میں بہت کم اُن سے مدد لی ہے مگر اُنھوں نے جو یہ مہم سر کی تو ہم سے بہت زیادہ مدد لے کے کی ہے۔ پھر اسی کے ساتھ یہ بھی تسلیم کرنا چاہئے کہ اُن کے یہاں اُن کی حکومت نے اُن کے کام میں جتنا دخل در معقولات کیا اُس سے کمتر ہمارے یہاں ہماری حکومت نے کیا۔ اور بغیر کسی طرفداری کے کہ کون ملک درجہ

یں بر عکس پر مقابلہ ہے یں کے کثرت و وجوہات بالا کے یہ خیال کیا ہے کہ ہمارا ملک اُن کے
ملک سے زیادہ اہم ہے اور میں جو انگریزی تمدن کی ترقی کو بطور ایک مخصوص مطالعہ کے منتخب کرتا ہوں تو محض اس وجہ سے کہ چونکہ وہ ایسے کارکنوں سے کم متاثر ہوا ہے جو خود اُس سے پیدا نہ ہوئے تھے اس لئے ہم اُس میں سوسائٹی کے معمولی رفتار اور اُن قوانین کے بے خلل کارروائی کو زیادہ صاف دیکھ سکتے ہیں کہ جن پر انجام کار قوموں کی قسمتوں کا انحصار ہوتا ہے۔

فرانس اور انگلستان کی تاریخ کی اعتباری قدر و منزلت میں اس قدر تقابل کرنیکے بعد مشکل سے اس کی ضرورت معلوم ہوتی ہے کہ اُن دعاوی کی جانچ پرتال کی جائے جو دوسرے ملکوں کی تاریخ کی طرف سے پیش کئے جا سکتے ہیں حقیقت میں صرف دو ملک ایسے ہیں جن کے حق میں کچھ بھی کہا جا سکتا ہے۔ میری مراد بحیثیت مجموعی جرمنی اور شمالی امریکہ کے ممالک متحدہ سے ہے۔ جرمنی کی بابتہ بیشک و شبہ یہ صحیح ہے کہ اٹھارھویں صدی کے وسط سے اُنھوں نے باکمال متفکرین اتنے زیادہ پیدا کئے ہیں جتنے کسی ملک نے بلکہ غالباً میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اور کل ملکوں نے مل کے بھی پیدا نہیں کئے لیکن اہل فرانس کی بابتہ جو خدشات وارد کئے گئے ہیں وہی اہل جرمنی کے بارہ میں بھی پیش کئے جا سکتے ہیں۔ کیونکہ جرمنی میں فرانس سے زیادہ "حفاظتی" اصول زور پکڑے رہا اور ہے۔ جرمنی کی بہترین حکومتیں بھی رعایا کے کام میں متواتر دخل دیا کرتی ہیں اور کبھی اُسے اپنے حال پر نہیں چھوڑتیں بلکہ ہمیشہ اُس کے اغراض و مقاصد کی جستجو کرتی اور روزانہ زندگی کی بالکل معمولی باتوں تک میں دخل دیتی رہتی ہیں۔ ماورا اس کے جرمنی کے علوم و فنون اگرچہ اب یورپ میں اوّل درجہ پر ہیں لیکن اُن کا مبدء و منشا وہی عظیم تحریک تشکیک تھی جو فرانس میں انقلاب سے پہلے پائی گئی تھی۔ اٹھارھویں صدی کے وسط سے پیشتر باوجود کیپلر۔ اور لبنز جیسے بعض ممتاز و سر برآوردہ

اشخاص کے پیدا ہو چلنے کے اہل جرمنی کے یہاں کوئی علوم اصلی قدر و قیمت کے نہ تھے اور سب سے پہلی تحریک جس نے اُبھار ادہ یوں پیدا ہوئی تھی کہ اُن لوگوں کا میل جول عقلائے فرانس سے ہوا اور اُن سر برآوردہ اہل فرانس کے اثر و اقتدار نے اُن پر اپنا پرتو ڈالا جن کا فریڈرک اعظم کے عہد میں بمقام برلن جمگھٹا ہو گیا تھا۔ اور یہی برلن وہ شہر ہے جو اُس وقت سے اب تک فلسفہ اور حکمت تجربہ (سائنس) کا مرکز اور مستقر رہا ہے۔ اس سے بعض نہایت اہم امور پیدا ہوئے کہ جنھیں میں اس مقام پر باختصار بیان کروں گا۔ اہلِ جرمنی کے عقل و فراست نے اہلِ فرانس سے تحریک پا کے دفعۃً جو نشو و نما پائی تو وہ بے قاعدہ طور سے بڑھی اور اس تیز رفتاری سے بڑھی کہ جو اُس سے زیادہ تھی جتنے کہ ملک کے اوسط تمدنی حالت کا تقاضا تھی۔ انجام یہ ہے کہ یورپ میں کوئی ملک ایسا نہیں ہے جہاں اعلیٰ ترین طبائع اور ادنیٰ ترین طبائع میں ایسا عظیم تفرقہ پڑا ہو۔ فلسفۂ جرمنی کو وہ علم حاصل ہے اور اُن کے خیالات کی پرواز اس قدر بلند ہے کہ اُس نے اُن کو متمدن دنیا کا سرخیل اور سر منشا ر بنا دیا ہے۔ مگر اسی کے ساتھ ہی انگلستان یا فرانس کے باشندوں کے مقابلہ میں جرمنی والے کہیں زیادہ توہّم پرست۔ کہیں زیادہ متعصب اور باوجود اُس خبر گیری کے جو حکومت اُن کی تعلیم کی بابتہ کرتی رہتی ہے کہیں زیادہ دراصل جاہل اور کہیں زیادہ اپنے آپ رہنمائی کرنے میں ناقابل ہیں۔ اور یہ افتراق و بیگانگت جو ملک کے دونوں (یعنی اعلیٰ اور ادنیٰ) طبقوں میں ہے فطری نتیجہ ہے اُس مصنوعی تحریک کا جو سو برس اُدھر ایک طبقہ کو دی گئی تھی اور اُسی نے اس طور پر اجزائے سوسائٹی کے معمولی موازنہ میں فتور ڈال دیا۔ اسی کی وجہ سے جرمنی میں اعلیٰ درجہ کی عقل و فراست والے قوم کی عام ترقی سے اتنا آگے بڑھ گئے ہیں کہ اُن میں اور جمہور میں باہم کوئی مناسبت نہیں ہے اور نہ فی الحال ایسے وسائل موجود ہیں جن کے ذریعہ سے دونوں میں ربط و اتصال پیدا ہو سکے۔ اُن کے بڑے بڑے مصنّفین اپنے

آپ ہی کو مخاطب بناتے ہیں۔ وہ ملک سے خطاب نہیں کرتے بلکہ صرف ایک دوسرے سے۔ اُنھیں یقین ہے کہ منتخب روزگار اور اہلِ علم سامعین اُنھیں مل جائیں گے اور وہ ایسی زبان میں بات چیت کرتے ہیں جو حقیقت میں علمی زبان ہے۔ وہ اپنی مادری زبان کو ایسے طرزِ کلام میں تبدیل کرتے ہیں جو فصیح و بلیغ اور پرزور تو بیشک ہی مگر ایسی مشکل اتنی دقیق اور اس قدر پیچ در پیچ پیچیدگیوں سے بھری ہوئی ہی کہ خود اُن کے یہاں کے ادنیٰ طبقہ والوں کی سمجھ سے باہر ہے۔ اسی کے سبب سے علوم و فنون جرمنی کی بعض نہایت نمایاں مخصوصات پیدا ہوئے ہیں کیونکہ معمولی ناظرین سے محروم ہو کے وہ معمولی تعصب سے الگ تھلگ رہے ہیں اور اسی وجہ سے تحقیقات کی وہ جرأت۔ احقاقِ حق میں وہ جرأت انگیز دلیری اور مروجہ اور موروثی خیالات سے وہ بے پروائی اُنھوں نے ظاہر کی ہی جو اعلیٰ درجہ توصیف کی مستحق ہے۔ لیکن باوجود اس کے اسی کیفیت نے وہ عملی ناواقفیت پیدا کی ہے اور مادی و طبیعی اغراض و مقاصد سے وہ بے رُخی دکھائی ہے کہ علوم و فنون جرمنی صحیح طور مورد الزام ہو گئے ہیں بطور ایک واقعۂ نفس الامری کے اس سبب نے اصلی تفرقہ باہمی کو اور وسعت دیدی ہی اور اُس فاصلہ کو اور بڑھا دیا ہے جس نے جرمنی کے بڑے بڑے اہل فکر کو اُس بلید مشقت کرنے والے گروہ سے علیٰحدہ کر رکھا ہی جو اگرچہ بالکل اُن کے نیچے ہی ہے لیکن اب بھی اُن کے پرتو علم سے غیر مستفیض اور اُن کی عقل و فراست کی نور اور حرارت سے بے بہرہ ہے۔

اسی کے مقابلہ میں ہم امریکہ میں ایسا تمدن دیکھتے ہیں جو بالکل اس کے برعکس ہے۔ ہم اُسے ایسا ملک پاتے ہیں جس کے بارہ میں یہ سچ کہا گیا ہے کہ کوئی اور ملک ایسا نہیں ہے جہاں بڑی استعداد اور معلومات یا بڑی جہالت اور لاعلمی والے لوگ اس قدر کم ہوں جرمنی میں اہلِ نظر اور اہلِ عمل بالکل ہی جدا جدا ہیں اور امریکہ میں وہ دونوں بالکل مخلوط ہیں۔ جرمنی میں قریب قریب ہر سال نئے نئے انکشافات ہوتے رہتے اور نئے نئے

فلسفے نکلتے رہتے ہیں اور آئے دن ایسے ذرائع پیدا ہوا کرتے ہیں جن سے علم کے حدود وسیع تر ہو جاتے ہیں۔ امریکہ میں اس قسم کی تحقیقاتیں قریب قریب بالکل نظر انداز کر دی گئی ہیں اور جوناتھن ایڈورڈس کے عہد سے لے کر اب تک کوئی بڑا ماہر علم مابعد الطبیعیات کا پیدا نہیں ہوا ہے۔ وہاں حکمت طبیعی پر بھی بہت کم توجہ کی گئی ہے اور صرف ایک اصول قانون کے سوا اُن بڑے بڑے مباحث پر کچھ بھی تو نہیں کیا گیا ہے جن پر جرمنی والے پیاپے زور لگا رہے ہیں۔ امریکہ کے علم کا خزانہ بہت چھوٹا ہے لیکن وہ سب طبقوں میں پھیلا ہوا ہے۔ جرمنی والوں کا خزانہ علم بڑا ہے لیکن وہ ایک ہی طبقہ میں محدود ہے۔ اب یہ سوال کہ تمدن کی ان دو شکلوں میں کون زیادہ فیض رساں ہے ایسا ہے جس کا تصفیہ اس وقت ہم کو کرنا نہیں ہے ہمارے موجودہ مقصد کے لئے اس قدر کافی ہے کہ جرمنی میں علم کی نشر و اشاعت میں سخت کوتاہی ہو رہی ہے اور امریکہ میں علم کے جمع کرنے میں۔ اور چونکہ تمدن کی رہبری علم کے جمع کرنے اور اشاعت دینے سے ہوتی ہے اس وجہ سے یہ بدیہی بات ہے کہ اگر کسی ملک میں ان حالات میں سے ایک کے نشو و نما کرتے وقت دوسرے سے بالکل چشم پوشی کی جاتی ہو گی تو وہ ملک کبھی درجۂ کمال پر نہ پہنچ سکے گا۔ درحقیقت ان دو اجزائے تمدن کے درمیان موازنہ اور تناسب نہ ہونے سے امریکہ اور جرمنی میں وہ بڑی بڑی خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں جن کی بابت یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ بآسانی اُن کی تلافی نہ ہو سکے گی اور جب تک اُن کی تلافی نہ کی جائے گی اُس وقت تک ضرور وہ دونوں ملکوں کی رفتار ترقی میں سدِ راہ رہیں گی اگرچہ اس قسم کی یک طرفہ مصروفیت سے ایسے غیر مستقل فوائد بھی حاصل ہوں جو ہمیشہ ایسی صورتوں میں عارضی طور سے حاصل ہو جایا کرتے ہیں۔

میں نے اختصار کے ساتھ (اور مجھے امید ہے کہ) صفائی سے اور درحقیقت بغیر کسی دانستہ طرفداری کے دنیا کے چار سربلند ملکوں کی تاریخ کی اعتباری قدر و منزلت

کے اندازہ کرنے کی کوشش کی ہے اور اُن ملکوں کی اصلی قسمت کی بابت میں اس لئے کوئی رائے ظاہر نہیں کرتا کہ ہر ملک اپنے آپ کو پیشرو سمجھتا ہے۔ لیکن جبتک کہ وہ واقعات جو میں نے بیان کئے ہیں رَد نہ کردیئے جائیں یقیناً یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ایک فلسفی کے لئے تاریخ انگلستان اوروں سے زیادہ گرانقدر ہے اس لئے وہ اسی تاریخ میں واضح طور سے علم کے جمع اور شایع کرنے کو ساتھ ساتھ چلتا دیکھ سکتا ہے اس لئے کہ وہ علم خارجی اور غیر کارکنوں کے اثر اقتدار سے کم تر متاثر ہوا ہے اور اس لئے کہ اچھائی یا بُرائی کے واسطے اُس میں بہت کم مداخلت اُن مقتدر مگر (اکثر اوقات) نالایق لوگوں نے کی ہے جن کو معاملات رعایا کا نظم ونسق تفویض کیا جاتا ہے۔

صرف انھیں خیالات پر (اور اُن اغراض سے بالکل نہیں جو حُبّ وطن کے نام سے تعبیر کئے جاتے ہیں) میں نے یہ تہیّہ کرلیا ہے کہ میں خود اپنے ملک کی تاریخ کو اور ملکوں پر مرجح سمجھکے لکھوں اور یہ کہ اُسے اس قدر جامعیّت اور تکمیل کے ساتھ ضبط تحریر میں لاؤں جس قدر کہ اُس مواد و مصالح کی بنیاد پر لکھنا ممکن ہو جو فی الحال مُیسّر ہے لیکن چونکہ حالات مندرجۂ بالا سے یہ ناممکن ہوگیا ہے کہ سوسائٹی کے قوانین محض ایک ہی قوم کی تاریخ کے مطالعہ سے دریافت ہوسکیں اس لئے میں نے یہ مقدمہ کتاب اس غرض سے تحریر کرنا چاہا ہے کہ بعض وہ مشکلات حل ہوجائیں جو اس مبحث کو گھیرے ہوئے ہیں۔ شروع کی گزشتہ باتوں میں میں نے یہ کوشش کی ہے کہ بحالت مجموعی اس مبحث کے جو حدود ہیں وہ بتادوں۔ اور جس وسیع ترین بنیاد پر وہ قایم ہوسکتا ہے اُسے مُتعیّن کردوں۔ اس غرض سے میں نے تمدن پر اس طرح نظر ڈالی ہے گویا وہ دو بڑی قسموں پر تقسیم ہوسکتا ہے یعنی یورپی حصہ جس میں انسان بہ نسبت فطرت کے زیادہ زوردار ہوتا ہے اور غیر یورپی حصہ جس میں فطرت بہ نسبت انسان کے زیادہ زوردار ہوتی ہے۔ اسی نے ہم کو اس نتیجہ پر پہنچایا ہے کہ قومی

ترقی (جمہور کی آزادی سے متعلق) یورپ کے سوا دنیا کے کسی دوسرے حصّہ میں پیدا ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ اور اسی سبب سے صرف یورپ ہی میں اصلی تمدن کے عروج اور قوائے فطری پر طبیعت انسانی کے فتوحات کو مطالعہ کر سکتے ہیں۔ اس طور پر جب قوانین عقلی کی فوقیت اور فضیلت قوانین طبیعی پر (اس حیثیت سے کہ تاریخ یورپ کا تار و پود وہی ہے) تسلیم کر لی جاتی ہے تو اس کے بعد دوسرا زینہ یہ ہے کہ قوانین عقلی کو اخلاقی اور ذہنی میں تقسیم کر کے یہ ثابت کریں کہ ترقی انسانی کی اعانت اور سربراہی کرنے میں قوانین ذہنی کا اثر بڑھا چڑھا رہتا ہے۔ میں یہ جانتا ہوں کہ جب تاریخ پر بحیثیت ایک سائنس (حکمت تجربہ) کے نظر ڈالی جاتی ہے تو اُس کے اصلی لوازم یہی استقراء نکلتے ہیں۔ اور اس غرض سے کہ ہم اُن کو انگلستان کی خاص تاریخ سے متعلق کریں ہم کو صرف یہ بات تحقیق کرنا ہے کہ عقل و فراست کی ترقی کے لئے اوّل اوّل کیا بات ہونا ضروری ہے کیونکہ جب تک یہ نہ ہوگا اُس وقت تک کسی قوم کی سرگزشت پارینہ محض ایک بے سروپا (بے سلسلہ) تواتر واقعات پیش کرے گی۔ وہ واقعات صرف ایسے جداگانہ اور اتفاقی کڑیوں سے مربوط ہوں گے جو مختلف مصنّفین نے اپنے گوناگوں اصول کے مطابق بنائی ہوں گی۔ اسی نظر سے اس مقدمۂ کتاب کا بقیہ حصّہ زیادہ تر اُس منصوبہ کی تکمیل میں صرف ہوگا جو میں نے باندھا ہے۔ یعنی یہ کہ جن خصوصیات عقل و فراست کے بارہ میں ہمارے اپنے ملک کی تاریخ کوئی ٹھیک علم ہم نہیں پہنچاتی اُس کے متعلق متعدد ملکوں کی تاریخ میں چھان بین کروں مثلاً چونکہ جرمنی میں انگلستان کے بہ نسبت سرمایۂ علمی کا فراہم کرنا کہیں زیادہ سرعت کے ساتھ ہوا ہے لہذا سرمایۂ علمی کی فراہمی کے قوانین انگلستان کے بہ نسبت جرمنی میں زیادہ سہولیت کے ساتھ مطالعہ کئے جا سکتے اور پھر بذریعہ استقراء تاریخ انگلستان پر چسپاں ہو سکتے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس چونکہ امریکہ والوں نے اپنے علم کی اشاعت ہمارے بہ نسبت کہیں

... میری غایت یہ ہی کہ انگلستان کے بعض آثار تمدن
کی توجیہ و تشریح اُن قوانین اشاعت کے ذریعہ سے کروں جن کی کارروائی امریکہ کے
تمدن میں واضح ترین صورت سے نظر آسکتی ہی اور اسی وجہ سے وہاں اُن کا انکشاف
بھی آسان ترین شکل سے ممکن ہی۔ پھر چونکہ فرانس ایسا متمدن ترین ملک ہی جس میں
"حفاظتی" رجحان بہت زور دار ہے لہٰذا اس رجحان کی نمایاں کرامات کا سُراغ
اپنے ہمسایوں میں اُس کے بدیہی نشانیوں کے مطالعہ کرنے سے لگ سکتا ہی۔ اس نظر
سے میں تاریخ فرانس کا ایک خاکہ کھینچوں گا تاکہ حفاظتی اصول واضح ہو جائے اور
یہ دکھلاؤں گا کہ اُس نے ایک نہایت ہی فرزانہ اور روشن خیال قوم کو کیا گزند
پہنچایا ہے اور انقلاب فرانس کی تفصیل بیان کرنے میں یہ جتا دوں گا کہ وہ واقعہ
عظیم کس طور پر حفاظتی رُجحان کے خلاف ایک ردعمل تھا دراں حالیکہ اس ردعمل کا
مصالح انگلستان سے لیا گیا تھا تو ہم کو یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ ایک ملک کی عقل و
فراست دوسرے ملک کی عقل و فراست پر کیا عمل کرتی ہے۔ نیز ہم اُس باہمی تبادلۂ
خیالات کے بابت چند عمدہ نتیجوں پر پہنچ جائیں گے جو غالباً معاملات یورپ کا نہایت
اہم رہنما ہونے والا ہی۔ پھر اسی سے اُن خیالات پر بھی روشنی پڑے گی۔ جو مختلف
قوموں کے خلط ملط ہونے سے پیدا ہوتے ہیں اور اسی سلسلہ میں دو جُداگانہ باب
حفاظتی رُجحان کی تاریخ اور انگلستان و فرانس میں اُس کے اعتباری تشدد اور انتہا
کی جانچ پرتال میں صرف کئے جائیں گے۔ لیکن بحیثیت ایک قوم کے اہل فرانس
سترھویں صدی کے آغاز یا وسط سے ممتاز طور پر توہم پرستی سے آزاد رہے ہیں اور
باوجود وہاں کی حکومت کی کوششوں کے وہ لوگ اہل کلیسا کے اقتدار کے بہت
مخالف رہے ہیں حتیٰ کہ اُن کی تاریخ اگرچہ حفاظتی اصول کو ایک پولیٹکل شکل میں
دکھا رہی ہے لیکن وہ اُس کی مذہبی شکل کے بارہ میں بہت کم شہادت مہیا کر رہی ہے۔

اور خود ہمارے ملک میں بھی اس کی شہادت بہت ہی کمیاب ہے۔ اس وجہ سے
میرا ارادہ یہ ہے کہ میں تاریخ اسپین کی بھی ایک جھلک دکھا دوں کیونکہ ہم وہاں کی
تاریخ میں یہ پتہ لگا سکتے ہیں کہ روحانی گروہ والے جن غلطیوں کے ارتکاب میں
بیباک ہوتے ہیں اُن کی حفاظت سے کیا کیا نتیجے پیدا ہوئے۔ بہ نسبت کسی اور ملک
کے اسپین میں بہت شروع زمانہ سے کلیسیا کو زیادہ زور اور اہل کلیسیا کو زیادہ اقتدار
رعایا اور حکومت دونوں میں حاصل رہا۔ اور اس لئے یہ زیادہ آسان ہوگا کہ اسپین
میں اہل کلیسیا کی ترقی کے قوانین کو اور جس طور سے وہ ترقی قومی اغراض پر اثر
ڈالتی ہے اُس کو مطالعہ کریں۔ دوسری بات جو ایک قوم کی عقل و فراست کی
ترقی پر عمل کرتی ہے وہ طریقہ تحقیقات ہے جس سے اُس قوم کے قابل ترین آدمی
عادۃً کام لیتے ہیں۔ یہ طریقہ دو قسموں میں سے صرف ایک قسم کا ہو سکتا ہے یعنی
یا قیاسی ہوگا یا استقرائی۔ ہر ایک ان میں سے تمدن کی مختلف صورتوں سے تعلق
رکھتا اور ہمیشہ ایک نئے طرز خیال سے علی الخصوص مذہب اور سائنس کے بارہ میں
وابستہ ہوتا ہے۔ یہ اختلافات اس قدر بیحد اہم ہیں کہ جب تک اُن کے قوانین کا
علم نہو ہم واقعات گزشتہ کی اصلی تاریخ کے سمجھنے والے نہیں کہے جا سکتے۔ اب اس میں
شک نہیں کہ اس اختلاف کے دونوں سرے جرمنی اور ممالک متحدہ ہیں۔ اہل جرمن
کھُلے کھُلے قیاسی ہیں اور اہل امریکہ استقرائی۔ لیکن اور متعدد حیثیتوں سے جرمنی اور
امریکہ اس قدر ضد یک دگر ہیں کہ میں نے یہ بہتر سمجھا ہے کہ اس قیاسی اور استقرائی
رُجحان کے عمل کو اُن ملکوں میں مطالعہ کروں جن میں بہت قریبی مشابہت موجود ہے
کیونکہ جس قدر زیادہ دو قوموں میں مشابہت ہوگی اُسی قدر زیادہ سہولت سے ہر ایک
اختلاف کے نتائج کا سُراغ لگ سکے گا اور اُسی قدر زیادہ اُس اختلاف کے قوانین
واضح اور روشن ہوں گے۔ اس قسم کا ایک موقع انگلستان کی تاریخ کے مقابلہ میں

اسکاٹلینڈ کی تاریخ میں ملتا ہے۔ یہاں ہم دو قوموں کو دیکھتے ہیں جو ہم سرحد ہیں، ایک ہی زبان بولتے ہیں، ایک ہی علوم و فنون پڑھتے ہیں اور ایک ہی اغراض و مقاصد سے وابستہ ہیں۔ باوجود ان سب باتوں کے یہ ایک امر حق ہے (جس کی بابت اگرچہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُس پر توجہ کی ہی نہیں گئی ہے لیکن اُس کے ثبوت کو میں تکمیل اور تفصیل کے ساتھ پیش کروں گا) کہ گزشتہ تیس چالیس برس اُدھر جس قدر انگلستان کی عقل و فراست میں استقراء غالب تھا اُس سے زیادہ اہل اسکاٹلینڈ کی عقل و فراست کُلیتہً قیاس کا پہلو لئے ہوئے تھی۔ انگریزی طبائع میں جو استقرار کی طرف رجحان ہے اور جس توہم پرستی کے ادا سے ہم اُسے واجب التسلیم مانتے ہیں (ہمارے دل میں جو توہم پرستی کی ادا سے اُس کی عمدگی اور عظمت کا نقش بیٹھا ہوا ہے) اُسے ہمارے قابل ترین اشخاص میں سے کم اور بہت ہی کم لوگوں نے افسوس کی نگاہ سے دیکھا ہے اس کے مقابلہ میں اسکاٹلینڈ میں علی الخصوص اٹھارھویں صدی میں بڑے بڑے اہل نظر بلا کسی استثنار کے قیاسی طریقہ پر کاربند تھے۔ اب قیاس کا خاصہ یہ ہے کہ جب اُسے اُن صیغہ جات علوم میں چلاتے ہیں جو ہنوز اُس کے لئے تیار نہیں ہیں تو وہ اُن مقدمات کی تعداد بڑھا دیتا ہے جن کی وجہ سے ہم برہان کا سلسلہ نیچے سے شروع کرتے ہیں اور وہ اُس دھیمے، صبر آزما صعود کو نظر سے گرا دیتا ہے جو تحقیقات استقرائی کیلئے مخصوص ہے۔ یہ جو خواہش ہے کہ ہم حقایق کو غور و فکر بلکہ بیش از بیش مسلمہ نتائج کے ذریعہ سے پا جائیں یہ اکثر اوقات بڑے بڑے انکشافات کا سبب ہوئی ہے اور کوئی شخص جس نے مناسب طور سے تعلیم پائے ہوئے اُس کے بیحد گرانمایہ ہونے سے انکار نہ کرے گا۔ لیکن جب عالمگیر طور سے اُس کا تتبع کیا جاتا ہے تو اُس میں کھلا کھلا یہ خدشہ موجود ہے کہ کہیں مبنی بر تجربہ اصول کا مطالعہ نظر انداز نہ ہو جائے۔ یا کہیں غور کرنے والے لوگ اُن چھوٹے چھوٹے اور قریبی کلیات سے بے صبر نہ ہو جائیں جو استقرائی

طریقہ کے بموجب بڑے اور اعلیٰ درجہ کی کلیات سے ضرور ہی مقدم ہوتے ہیں در حقیقت
جب کبھی یہ بے صبری واقع ہوتی ہے تو اس وقت سخت گزند پہنچتا ہے کیونکہ یہ ادنیٰ
درجہ کی کلیات اہلِ نظر اور اہلِ عمل دونوں کی مشترکہ زمین بن جاتے ہیں اگر یہ زمین
قطع کردی جاتی ہے تو اُن کا ملنا ناممکن ہوجاتا ہے۔ ایسی حالت میں اہلِ حکمت گروہ
میں اُن قیاسات سے ناواجب نفرت پیدا ہوتی ہے جنھیں گنواروں کے تجربہ نے
نکالا ہے اور جن کے قوانین کچھ سمجھ میں آنے والے معلوم نہیں ہوتے اور عملی گروہ میں
ایسے بلند اور وسیع تخیلات سے ایک بے اعتنائی پیدا ہوتی ہے جن کے درمیانی اور
ابتدائی مدارج اُن کی نگاہوں سے پوشیدہ ہوتے ہیں۔ اسکاٹلینڈ میں اس کے نتائج
نہایت ہی عجیب اور متعدد حیثیتوں سے اُن نتائج کے مشابہ ہیں جو ہم کو جرمنی میں نظر آتے
ہیں کیونکہ دونوں ملکوں میں عقل و فراست والے لوگ تحقیقات میں جری اور دلیر اور
تعصبات سے پاک و صاف ہونے کے سبب سے اور کافۂ انام اپنی توہم پرستی اور اپنے
تعصّبات میں سخت ہونے کی وجہ سے ممتاز رہے ہیں۔ اسکاٹلینڈ میں یہ حالت جرمنی
سے بھی زیادہ حیرت انگیز رہی ہے۔ کیونکہ اسکاٹلینڈ والے اُن اسباب سے جو بہت کم
مطالعہ کئے گئے ہیں کاروباری معاملات میں نہ صرف جفاکش اور عاقبت اندیش تھے
بلکہ نمایاں طور سے تیز نظر بھی تھے۔ لیکن پھر بھی زندگی کے بلند ترین مدارج میں اُنھیں
اس سے کچھ فائدہ نہ حاصل ہوا اور درانحالیکہ کوئی ملک ایسا نہیں ہے جس میں وہاں سے
زیادہ انوکھے اور جدت طراز علوم و فنون ہوں۔ اُسی طرح کوئی ملک اُس کے مساوی
تمدن کا ایسا نہیں ہے جس میں قرون متوسطہ کا رنگ اب تک چھایا ہوا ہو جہاں اتنے
ناممکنات اب بھی عقیدہ میں داخل ہوں اور جہاں مذہبی ناروا داری کے قدیمی خیالات
کا مشتعل کرنا اس قدر سہل ہو۔

یہ اختلاف بلکہ درحقیقت یہ تناقض جو عملی اور غور و فکر کرنے والی جماعتوں میں اس

طور پر قایم ہو چکا ہے۔ اسکاٹلینڈ کی تاریخ میں نہایت ہی اہم واقعہ ہے اور کچھ تو وہ قیاسی طریقہ کا سبب ہے، اور کچھ اس کا نتیجہ۔ کیونکہ یہ نزول کرنے والا طریقہ چونکہ صعود کرنے والے یا استقرائی طریقہ کے خلاف ہے لہذا وہ اُن ادنیٰ درجہ کے کلیات (استقراؤں) کو نظر انداز کر دیتا ہے جنھیں دونوں گروہ والے سمجھ سکتے ہیں۔ اور یہی کلیات ایسے ہوتے ہیں جن کے بارہ میں دونوں گروہ والے متحد الخیال ہو سکتے ہیں۔ استقرائی طریقہ جس کو بیکن نے مقبول و دلپسند بنایا ہے اُن ادنیٰ تر اور قریبی حقایق کو بہت نمایاں کر دیا ہے اور اگرچہ اس نے انگلستان کے اہل عقل کو بہت زیادہ سودمندی پسند بنا دیا لیکن اُنھیں اُس حالت کس مپرسی سے محفوظ رکھا جس میں وہ پڑے رہتے۔ مگر اسکاٹلینڈ میں یہ حالت قریب قریب مکمل ہو گئی تھی کیونکہ وہاں قیاسی طریقہ قریب قریب عالمگیر تھا۔ اس کی پوری شہادت تیسری جلد میں جمع کی جائے گی۔ لیکن اس غرض سے کہ میں یہاں اس بات کو اچھوتا نہ چھوڑوں بہت اختصار کے ساتھ تمثیلاً میں وہ خاص مواقع بیان کروں گا جو ان تین نسلوں میں پیش آئے ہیں اور جن میں اسکاٹلینڈ کے علوم و فنون اعلیٰ ترین عروج پر پہنچتے تھے۔

اس عرصہ میں جو تقریباً ایک صدی کی رت تھی یہ رُجحان ایسا قطعی تھا کہ نفس انسانی کی تاریخ میں ایک عجیب واقعہ ہے۔ سب سے پہلے علامت جو ظاہر ہوئی وہ ایک تحریک تھی جسے گلاسگو یونیورسٹی کے پروفیسر سمسن نے شروع کیا اور جس کا سلسلہ اڈنبرا یونیورسٹی کے پروفیسر اسٹوارٹ نے قایم رکھا ان قابل حضرات نے جاں فشان کوششیں اس بارہ میں کیں کہ خالص یونانی اقلیدس (جامیٹری) کو از سر نو زندہ کریں اور الجبرائی یا علاماتی تحلیل کو مردود ٹھہرائیں۔ اس سبب سے اُن میں اور اُن کے تابعین میں یہ شوق پیدا ہوا کہ مشکلات کو عمدہ ترین طریقوں سے حل کریں اور الجبرے نے جو نہایت ہی آسان اور سادے طریقے بتائے ہیں اُن سے نفرت کا اظہار ہونے لگا۔ اس مقام پر ہم کو اس

فلسفیانہ طریقہ کی خاص شان نظر آتی ہے۔ یہ اُن امور سے نفرت کرتا ہے جنھیں معمولی فہم والے آدمی جلدی سے سمجھ سکتے ہیں اور جو بجائے اس کے محسوس سے غیر محسوس کی طرف جائے غیر محسوس سے محسوس کی جانب بڑھتا ہے ٹھیک اسی زمانے میں تحقیقات کی ایک دوسری شاخ میں یہی رُجحان ہچیسن نے ظاہر کیا۔ یہ شخص اگرچہ مولد کے لحاظ سے آئرش تھا لیکن اُس نے گلاسگو یونیورسٹی میں تعلیم پائی تھی اور وہیں پروفیسر تھا اُس نے اپنے اخلاقی اور حُسن و قبح کی تحقیقاتوں میں بجائے اس کے کہ مسلمہ اصول پر استقرائی برہان چلاتا غیر مسلمہ اصول پر قیاسی برہان سے کام لیا اور حواس کے فوری اور عملی مدرکات سے قطع نظر کرکے بعض قوانین کے بے دلیل مفروضات کو مان لیا۔ اور بجائے اس کے کہ واقعات سے ترقی کرکے قوانین کے مرتبہ میں پہنچتا قوانین کو تسلیم کرکے واقعات میں اُتر آیا۔ اُس کے فلسفہ نے مابعد الطبیعات والوں کو اپنا بہت ہی گرویدہ بنا لیا اور اُس نے جو طریقہ قیاسی نظریہ سے مادی اشیا کی طرف نزول کرنے کا اختیار کیا تھا اُسے اُس سے بھی ایک اور بلند مرتبہ باشندۂ اسکاٹلینڈ یعنی مشہور و معروف آدم اسمتھ نے بھی اختیار کر لیا۔ آدم اسمتھ نے جس طرح قیاسی طریقۂ تحقیقات کو قبول کیا اُس کی تصنیف ”نظریۂ جذبات اخلاقی“ اور نیز اُس کے مضمون لسان“ اور اُس سے بھی زیادہ اس کے مضمون تاریخ علم نجوم سے وضح ہوتا ہے جس میں اُس نے بجائے اس کے کہ پہلے اس بات کو تحقیق کرتا کہ انکشافات علم نجوم کی رفتار کیا رہی ہے عام تخیلات سے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ وہ کیا ہونا چاہیے تھی۔ پھر ”دولت اقوام“ کے نام سے جو تصنیف اُس کی ہے وہ بالکل ہی قیاسی ہے کیونکہ اُس میں آدم اسمتھ نے قوانین دولت کے کلیات جو قایم کیے ہیں وہ نہ تو آثار دولت سے نہ اعداد و شمار کے فردوں سے بلکہ واقعات خودغرضی سے ماخوذ ہیں اور اس طور پر ذہنی اصول کو اقتصادی اصول پر منطبق کیا ہے اُس کی کتاب اعظم میں جو بکثرت

تمثیلات بھری ہوئی ہیں وہ اصلی دلیل کے کوئی رُکن نہیں ہیں بلکہ وہ سب تصوّر کے توابع و لواحق ہیں اور اگر وہ سب ترک کردی جائیں تو گو وہ کل تصنیف کم دلچسپ اور غالباً کم موثر ہوگی لیکن از روئے اصول سائنس وہ ویسی ہی قدر کے قابل ہوگی دوسری مثال لیجئے۔ ہیوم کی تصنیفات (باستثناء اُن مضامین کے جو اُس نے علم مابعد الطبیعات پر لکھے ہیں) کل کے کل قیاسی ہیں اور اُس کی اقتصادی تحقیقاتیں اصل اصول ہیں مقدرات و مفروضات ہیں اور ایسے ہیں کہ جو تجارت اور فنانس (مالی) معاملات کی اُس تفصیلی واقفیت کے بغیر ضبط تحریر میں آسکتی تھیں کہ جن پر استدلال استقرائی قایم ہونا چاہئیے تھا۔ اسی طرح سے اُس نے اپنی کتاب "مذہب کی تاریخ فطری" میں یہ کوشش کی ہے کہ شہادت و ثبوت سے آزاد ہو کے محض غور و فکر سے قیاسی تحقیقات خیالات مذہبی کی ابتدا پر کی جائے۔ اُسی طرح اُس نے اپنی کتاب تاریخ انگلستان میں بجائے اس کے کہ پہلے شہادت مہیا کرتا اور پھر اُن سے نتائج استخراج کرتا اُس نے یہ فرض کر لیا کہ رعایا اور سلطنت کے درمیان جو تعلقات تھے اُن میں ایک خاص ترتیب ہوگی اور جن واقعات سے اس امر مفروضہ کی تردید و تغلیط ہوتی ہے اُن کو یا تو نظرانداز ہی کیا یا اُن میں تاویل کی۔ یہ مختلف مصنفین اگرچہ اپنے اصول میں اور اُن مباحث میں جن کا اُنھوں نے مطالعہ کیا تھا اختلاف رکھتے ہی تھے لیکن اپنے طرز استدلال میں یکساں تھے یعنی یہ کہ یہ سب اس بارہ میں متحد تھے کہ احقاق بجائے صعود کے ہبوط کے ذریعہ سے کیا جائے۔ اس خصوصیت کی جو کچھ اہمیت آزادی معاشرت ہائے پر ہیں اس کتاب کی تیسری جلد میں نظر ڈالوں گا کیونکہ اُسی جلد میں میں اس امر کی تحقیق کرنے کی کوشش کروں گا کہ اُس نے قومی تمدن پر کیا اثر ڈالا ہے۔ اور انگریزی علوم و فنون کی جو استقرائی استدلال پر مبنی ہیں بالکل ضد ہیں پیش کیا ہے۔ اس اثناء میں اور صرف اس بات کے بیان کرنے کے واسطے کہ

آگے چل کے کیا ثابت ہوگا میں اتنا اور کہنا چاہتا ہوں کہ قیاسی طریقہ کو نہ صرف اُن سر برآوردہ اہل اسکاٹلینڈ نے برتا تھا جن کا میں ذکر کر چکا ہوں بلکہ فرگسن نے تاریخ جماعت تمدنی" جیسی پر فکر کتاب میں بھی وہی ڈھرا اختیار کیا۔ رِل نے وضع قانون کے مسئلہ میں بھی چال چلے۔ میکنٹاش نے اصول قانون کا مطالعہ اسی طرح کیا۔ ہٹن نے طبقات الارض۔ بلیک نے تھرماٹکس ...... ہنٹر اور الگزینڈر واکر اور چارلس بل نے علم موجودات۔ کلن نے علم طب اور براؤن اور گری نے تھراپیوٹکس (علم شفاء امراض) میں یہی مسلک اختیار کیا۔

اس مقدمہ میں جس منصوبہ پر میں چلنا چاہتا ہوں اس کا خاکہ یہی ہے اور اسی کے ذریعہ سے مجھے یہ اُمید ہے کہ میں بعض ایسے نتائج پر پہنچوں گا جو مستقل قدر و قیمت رکھتے ہیں۔ کیونکہ مختلف اصول کا مطالعہ جب اُن ممالک میں کیا جائے گا جہاں اُن کے بہترین نشو و نما ہوئی ہے تو اُن اصول کے قوانین زیادہ آسانی سے واضح ہو جائیں بہ نسبت اس کے کہ ہم اُنھیں ایسے ملکوں میں مطالعہ کریں جہاں وہ بالکل گوشہ تاریکی میں پڑے ہوئے ہیں۔ اور چونکہ بہ نسبت اور کسی ملک کے انگلستان میں تمدن ایک ضابطہ سے بڑھا ہے اور اُس کی رفتار میں خلل بہت کم پڑا ہے اسی وجہ سے جب اُس کی تاریخ لکھی جاتی ہے تو یہ اور زیادہ ضروری ہو جاتا ہے کہ کچھ ایسے وسایل سے کام لیا جائے جو میں نے ذکر کیے ہیں۔ انگلستان کی تاریخ کو جس چیز نے ممتاز طور سے گرانمایہ کر دیا ہے وہ یہ ہے کہ کسی دوسرے مقام پر قومی ترقی میں وہاں سے کم خلل اندازی نہیں ہوئی ہے۔ خواہ وہ خلل اندازی بُرائی کے واسطے ہوئی ہو یا بھلائی کے واسطے۔ لیکن صرف یہی امر کہ اس ذریعہ سے ہمارا تمدن زیادہ تر فطری اور صحیح حالت میں محفوظ رہا ہم پر یہ واجب کر دیتا ہے کہ ہم اُن خرابیوں پر غور کریں جو اُس میں پیدا ہو سکتے ہیں اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ ہم اُن دوسرے ملکوں پر غور کریں جن میں معاشرت کی خرابی زیادہ

کثرت سے پائی جاتی ہے۔ کسی تمدن کی حفاظت اور بقا اُس با قاعدگی پر منحصر ہونا چاہیے جس سے اُس کے اجزا ترکیبی متحد کیے گئے ہوں اور نیز اُس موافقت پر جو اُن میں باہم پائی جاتی ہے اگر اس کا ایک جزو بھی ضرورت سے زیادہ کارگزار ہوگا پورا مجموعہ مرکب خطرے میں پڑ جائے گا۔ انجام یہ ہے کہ اگرچہ ترکیب اجزا کے قوانین اُنھیں مقامات پر بہترین صورت سے تحقیق کیے جا سکتے ہیں جہاں وہ ترکیب کامل ترین ہو گی لیکن ہم کو ہر جزو ترکیبی کے قوانین کی تلاش ایسے مقامات پر بھی کرنا چاہیئے جہاں کہیں ہم خود اُسی جزو ترکیبی کو زیادہ کارگزار پائیں اگرچہ اسی وجہ سے میں نے تاریخ انگلستان کو یہ سمجھکے منتخب کیا ہے کہ اُس میں مختلف اصول کی سازگاری مدت مدید تک قایم رہی ہے تاہم میں نے اسی بنا پر یہ بھی مناسب سمجھا ہے کہ ہر ایک اصول کو جداگانہ طور سے اُسی ملک میں مطالعہ کروں جہاں وہ سب سے زیادہ زور پکڑے رہا ہے اور جہاں اُس کے غیر معمولی نشو و نما کی وجہ سے کل مجموعۂ مرکب کے اعتدال اور توازن میں اختلال واقع ہوتا رہا ہے۔

ان احتیاطوں کے عمل میں لانے سے ہم اکثر ایسی مشکلات کو طے کر سکیں گے جو ہنوز مطالعۂ تاریخ کی راہ میں حائل ہیں۔ بہر طور قبل اس کے کہ ہم میدان وسیع میں داخل ہوں جو ہمارے سامنے ہے یہ بہتر ہو گا اگر ہم بعض ایسے مراتب ابتدائی کو صاف کر دیں جنھیں ہم نے اب تک آنکھ اُٹھا کے بھی نہیں دیکھا ہے اور جن کے دوران بحث میں بعض وہ اعتراضات رفع ہو جائیں گے جو شاید دوسری صورت میں پیش کیے جاتے۔ جن مباحث کی طرف میں اشارہ کر رہا ہوں وہ مذہب، لٹریچر (علوم و فنون) اور حکومت ہیں۔ یہ تینوں معرکۃ الآرا مسائل ہیں اور بہتیرے آدمیوں کی رائے میں معاملات انسانی کے بڑے محرک یہی ہیں۔ یہ خیال کہ یہ رائے سرتا پا غلط ہے یہ اس تصنیف میں بہت اچھی طرح ثابت ہو جائے گی۔ لیکن چونکہ یہ خیال عام طور پر پھیلا ہوا ہے

بظاہر قرین قیاس ہے لہذا یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم فی الفور اُس کے بابت کچھ تصفیہ کریں اور یہ تحقیق کرلیں کہ اُس اثر کی اصلی حقیقت کیا ہے جو یہ تینوں بڑی قوتیں فی الحقیقت تمدن کی ترقی پر ڈالتی ہیں -

اب سب سے پہلے یہ بدیہی بات ہے کہ اگر کوئی قوم بالکل اپنے حال پر چھوڑ دی جائے تو اُس کا مذہب - اُس کے علوم وفنون اور اُس کی حکومت یہ سب چیزیں اُس قوم کی تمدن کے اسباب نہیں ہوں گے بلکہ اُس تمدن کے نتایج ہوں گے - سوسائٹی کے بعض حالات سے قدرتی طور پر بعض نتایج پیدا ہوتے ہیں اور اگرچہ اس میں کچھ شک نہیں کہ وہ نتایج بعض کارکنان خارجی کے سبب متزلزل ہوسکتے ہیں لیکن اگر ایسا نہ ہو تو یہ غیر ممکن ہے کہ کوئی اعلیٰ درجہ کی متمدن قوم جو دلیل و برہان اور تشکیک کے عادی ہو کبھی کسی ایسے مذہب کو قبول کرے جس کی کہیں کہیں بیہودگیاں عقل اور شک کے دشمن ہوں - چنانچہ ایسے واقعات بکثرت ملتے ہیں جن میں قوموں نے اپنے مذہب تبدیل کردیئے لیکن ایسا کوئی واقعہ نہیں ہے جس میں کسی ترقی کن قوم نے بطوع خاطر ایک زوال پذیر مذہب کو قبول کیا ہو - اور نہ اس کی کوئی مثال ملتی ہے کہ ایک روبہ تنزل ملک نے اپنے مذہب کو سنبھالا ہو - بیشک یہ سچ ہے کہ ایک عمدہ مذہب تمدن کا ممد ہے اور ایک بڑا مذہب اُس کے لئے ناسازگار - بہر نوع جب تک خارج سے کوئی اثر نہ پڑے اُس وقت تک کوئی قوم اس بات کو کبھی نہ دریافت کرسکے گی کہ اُس کا مذہب بُرا ہے بغیر اس کے کہ خود اُس کی عقل یہ نہ بتلائے - لیکن اگر اُس کی عقل بیکار رہی اور اُس کا علم غیر ترقی پذیر ہے تو یہ انکشاف کبھی ہو ہی گا نہیں - جو ملک اپنے قدیمی جہالت میں پڑا رہے گا وہ ہمیشہ اپنے قدیمی مذہب پر بھی قایم رہے گا - سچ یہ ہے کہ اس سے زیادہ واضح کوئی بات ہو نہیں سکتی - ایک نہایت جاہل قوم اپنے لاعلمی کے سبب ایسے مذہب کی طرف متوجہ ہوگی جس میں بڑے اعجاز و کرامات بھرے ہوں گے - جو بجد

وبیشمار دیوتاؤں پر نثار کرتا ہے اور جو ہر ایک واقعہ کو براہ راست اپنے دیوتاؤں سے منسوب کرتا ہے۔ برعکس اس کے جس قوم کا علم شہادت کے پرکھنے اور اچھے بُرے کا امتیاز سکھاتا ہے اور جس قوم میں تشکیک کی قوت غالب ہے وہ ایسے ہی مذہب پر راغب ہوگی جو دخل در معقولات کم کرتا ہو اور جو اُس کے خوش اعتقادی پر زیادہ بار نہ ڈالتا ہو۔ لیکن کیا تم اس لحاظ سے یہ کہو گے کہ اول الذکر مذہب کی بُرائی جہالت پیدا کرتی ہے اور آخر الذکر کی خوبیٔ علم پیدا کرتی ہے۔ کیا تم یہ کہو گے کہ جب ایک واقعہ دوسرے سے مقدم ہوتا ہے تو پہلا واقعہ جو مقدم ہوتا ہے وہ نتیجہ ہوتا ہے اور دوسرا واقعہ جو موخر ہوتا ہے وہی سبب ہوتا ہے۔ یہ طریقہ وہ نہیں ہے جس سے انسان زندگی کے معمولی کاروبار میں استدلال کرتے ہیں۔ اور اس بات کا سمجھنا مشکل ہے کہ ایسی صورت میں واقعات گزشتہ کی تاریخ کے بارہ میں کیوں اس طرح استدلال کیا جائے

سچ یہ ہے کہ جو مذہبی خیالات کسی زمانہ میں پھیلے ہوتے ہیں وہ علامات ہوتے ہیں اور اُنھیں علامتوں سے وہ دَور نمودار ہوتا ہے۔ اور اس میں کچھ شک نہیں کہ جب وہی خیالات مضبوطی سے جڑ پکڑ لیتے ہیں تو وہ انسانوں کے افعال پر موثر ہوتے ہیں لیکن قبل اس کے کہ وہ گہری جڑ پکڑیں کچھ ذہنی انقلاب پیشتر واقع ہو جانا چاہیئے ایک فلسفیانہ مذہب کی اشاعت کسی وحشی قوم میں ایسی ہی ہے جیسے کسی سخت چٹان پر بیج کا جمنا اور اُگنا اس بارہ میں بیشمار آزمائشیں کی گئی ہیں اور سب کا ایک ہی نتیجہ نکلا ہے۔ اچھی نیتوں والے لوگ جن میں مستعدانہ (اگرچہ برسرِ غلط) جوش بھرا ہوتا ہے ہمیشہ یہی کوشش کرتے رہے اور اب تک کر رہے ہیں کہ اپنے مذہب کی اشاعت وحشی ممالک کے باشندوں میں کریں۔ اُنھوں نے اپنی لگاتار اور انتھک کوشش سے اور اکثر اوقات اُمید دِل اور وعدوں بلکہ واقعی تحفہ تحائف سے بھی بہت سی حالتوں میں وحشی جرگوں سے مذہب عیسائی کا اعتراف واقرار کرا لیا ہے۔ لیکن جو شخص مشنری لوگوں کی فتوحات اور

کامیابیوں کی رپورٹوں کا مقابلہ شہادت کے اُس طول طویل سلسلہ سے کرے گا جس کو قابل سیاحوں نے فراہم کر دیا ہے اُسے بہت جلد یہ معلوم ہو جائے گا کہ اس طرح کا اقرار و اعتراف محض برائے نام تھا۔ اور یہ ثابت ہو گا کہ اُن جاہل جرگوں نے درحقیقت نئے مذہب کے صرف شعائر اختیار کر لئے ہیں لیکن کسی طرح سے بھی مذہب کو اختیار نہیں کیا ہے۔ اُنھوں نے اوپری اوپری باتیں لے لی ہیں اور اسی پر اکتفا کی ہے۔ وہ اپنے بچوں کو اصطباغ دیدیتے ہیں۔ کتاب مقدّس کو لے لیتے ہیں۔ گرجا میں جمع ہو جاتے ہیں۔ یہ سب کچھ کرتے ہیں لیکن باوجود ان سب امور کے وہ مذہب عیسائی کے روح وروال سے اس قدر دُور رہتے ہیں جتنے وہ اس وقت تھے جبکہ وہ اپنے اگلے بتوں کے سامنے سر جُھکاتے تھے۔ کسی مذہب کے مراسم و شعائر اُس کے بالائی سطح پر رہتے ہیں وہ فوراً نظر آجاتے ہیں۔ جلدی سے سیکھ لئے جاتے ہیں اور وہ لوگ جو تہ کی بات نہیں پا سکتے اُن کی نقل بآسانی اُتار لیتے ہیں لیکن صرف تہ کی بات اور مغز شریعت سے جو انقلاب ہوتا ہے وہی ہمیشہ قایم رہنے والا ہوتا ہے اور اُس کا تجربہ ایک وحشی کو اُس وقت ہو نہیں سکتا جبکہ وہ جہالت میں ڈوبا ہوا ہو اور اُس میں اور درندوں میں کوئی فرق نہ ہو جب یہ جہالت دُور ہو گی تب جا کے مذہب آئے گا۔ یہی ایک طریقہ ایسا ہے جس سے انجام کار میں کچھ مطلب نکل سکتا ہے۔ وحشی قوموں کی تاریخ اور اُن کی حالت نہایت ہوشیاری سے مطالعہ کرنے کے بعد میں نہایت وثوق کے ساتھ یہ اعتراف کرتا ہوں کہ کوئی معتبر مثال اس کی نہیں ملی ہے کہ کسی قوم نے مستقل طور سے اپنا دین بدل کے عیسائی مذہب قبول کر لیا ہو باستثناء اُن چند مثالوں کے جن میں مشنری لوگ اہل علم ہونے کے ساتھ ہی تقویٰ طہارت والے لوگ بھی تھے اور اُنھوں نے وحشیوں کو ایسے طرز خیال سے مانوس کیا اور اُن کے اذہان کو اس طرح تحریک دیدی کہ اپنے اصول مذہبی کے قبول کرنے کے واسطے تیار کیا اور اگر یہ تحریک نہ ہوتی

تو کبھی کسی کی سمجھ میں بھی نہ آئے۔

اس طور سے جب ہم عام اور وسیع نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے۔ نوع انسانی کا مذہب اُس کی ترقی کا نتیجہ ہے نہ کہ سبب۔ لیکن (اشیاء کو ایک چھوٹے پیمانہ پر دیکھتے یا کسی قلیل اور مخصوص میعاد کی عملی صورت حال پر نظر کرتے ہوئے) ایسے واقعات گاہ بگاہ پیش آجائیں گے جو اس عام نظام میں خلل ڈال دیں گے اور فطری رفتار کو بگاڑ دیں گے یہ بات (اُسی طرح ہے جیسے اور سب امور میں واقع ہوتی ہے) اشخاص منفرد کی مخصوصات سے پیدا ہوتی ہے کیونکہ وہ لوگ ایسے چھوٹے قوانین سے جو افراد کے افعال و حرکات کی رہنمائی کرتے ہیں تحریک پا کے اس قابل ہوتے ہیں کہ اپنی طبیعی ذکاوت اور اولوالعزمی و ہمت سے اُن بڑے قوانین کے عمل میں انقلاب پیدا کریں جو بڑی بڑی جماعتوں کے رہنما ہوتے ہیں۔ ایسے اسباب سے جو ہنوز معلوم ہیں وقتاً فوقتاً بڑے بڑے خوش فکر لوگ پیدا ہوئے ہیں جنھوں نے اپنی عمر میں ایک ہی مقصد کے حاصل کرنے کی فکر میں صرف کر کے یہ قابلیت پیدا کی کہ نوع انسانی کی ترقی کی صحیح راہ پہلے سے سمجھ لیتے ہیں اور ایسے مذہب یا فلسفہ کو ایجاد کرتے ہیں جس کے سبب سے آخر کار نہایت اہم نتائج پیدا ہوتے ہیں لیکن اگر ہم صفحات تاریخ پر نظر ڈالیں گے تو صاف نظر آئے گا کہ اگرچہ کسی نئی رائے کا ماخذ صرف ایک شخص واحد کی ذات ہوتی ہے لیکن یہ نئی رائے جو نتیجہ پیدا کرتی ہے وہ موقوف و منحصر ہوتا ہے اُس قوم کی حالت پر جس میں وہ رائے شائع کی جاتی ہے۔ اگر کوئی مذہب یا کوئی فلسفہ کسی قوم کی حالت کے اعتبار سے آگے بڑھا ہوا ہے تو وہ اُسے فوری فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ بلکہ اُس قوم کو ایام گزاری کرنا ہوگی حتیٰ کہ افراد قوم کے نفوس میں اُس کے قبول کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔ اس کی بیشمار مثالیں اکثر ناظرین کو معلوم ہوں گی۔ ہر ایک سائنس اور ہر ایک عقیدۂ مذہبی کے ساتھ ایک فہرست شہدا لگی ہوئی ہے۔ لوگوں کو اُس کے سبب سختیاں اور ایذائیں پہنچائی گئیں اور محض

اس وجہ سے کہ وہ اپنے معاصرین (زمانہ) سے زیادہ علم و واقفیت رکھتے تھے اور صرف اس سبب سے کہ سوسائٹی اتنی آگے نہیں بڑھی ہوئی تھی کہ وہ اُن حقایق کو قبول کر سکے اُن لوگوں کی جانیں لی گئیں۔ البتہ جب معمولی رفتار زمانہ کے بموجب چند نسلیں گزر جاتی ہیں تب ایک زمانہ ایسا آتا ہے کہ لوگ اُنھیں حقایق کو معمولی باتوں کی طرح دیکھتے ہیں پھر کچھ عرصہ بعد ایک زمانہ ایسا بھی آجاتا ہے جب لوگ اُنھیں کو نہایت ضروری و بدیہی سمجھنے لگتے ہیں اور اُس وقت نہایت ہی کُند ذہن لوگ بھی اس پر متحیر ہوتے ہیں کہ پہلے زمانہ میں ان کا انکار کیوں کیا گیا تھا۔ یہی ماجرا اُس وقت پیش آتا ہے جب نفس انسانی پوری طرح اپنی جولانی دکھاتا ہے اور جب وہ خاصی آزادی کے ساتھ علم کی فراہمی اور اشاعت میں مصروف ہوتا ہے۔ اگر کسی طور سے زبردستی اور مصنوعی ذریعوں سے بھی سوسائٹی اپنے طبّاعی دکھانے سے باز رکھی جاتی ہے تو اُس وقت وہ حقایق اگرچہ کتنے ہی سودمند کیوں نہ ہوں کبھی قبول نہیں کیے جاتے۔ ورنہ اس کی کیا وجہ ہے کہ بعض حقایق ایک زمانہ میں نظر انداز اور دوسرے زمانہ میں بسر وچشم قبول کر لیے جاتے ہیں۔ حقایق تو بجال خود قایم رہتے ہیں اور لازمی بات یہی ہے کہ آخر کار جو وہ قبول کیے جاتے ہیں تو اُس کا سبب اُس سوسائٹی کا کوئی انقلاب ہوتا ہوگا جو بالآخر اُنھیں حقایق کو قبول کرتی ہے جنھیں ایک بار نظر انداز کیا تھا۔ حقیقت میں تاریخ اس امر کے شہادت سے لبریز ہے کہ جب نہایت ہی عمدہ اصول کسی بالکل جاہل سوسائٹی میں شایع کیے گئے اُس وقت وہ بالکل بیکار اور بے مصرف سمجھے گئے۔ اسی سے یہ تھا کہ خدائے واحد کی وحدانیت کا مسئلہ جب اگلے زمانہ کے یہودیوں کو تعلیم کیا گیا تو اُنھوں نے کئی سو برس تک اُس پر کچھ عمل نہ کیا اور وہ بیکار رہا جن لوگوں کو اُس کی تلقین کی گئی تھی اُنھوں نے ہنوز جہالت اور وحشت سے سر نہیں اُبھارا تھا اور اس وجہ سے اُن میں یہ اہلیت وصلاحیت نہ تھی کہ وہ اپنے نفوس کو ایسے اعلیٰ خیال تک بلند

کرسکتے اور نسل دوسرے وحشیوں کے وہ ایسے ہی مذہب کو دل سے لگائے رہے
جو اُن کی خوش اعتقادی کی پرورش کے واسطے علی التواتر عجائبات و خوارق عادات
دکھاتا ہے اور جو بجائے اس کے کہ معبودیت کے خیال کو ایک ہی مرکز پر سمیٹ لانے
اُن کے معبودوں کی تعداد اتنی بڑھاتا رہا کہ ہر ہر کھیت اور جنگل اُن سے بھرا پڑا تھا
یہی وہ بُت پرستی تھی جو جہالت اور مُعلّمی کا فطری غمزہ تھی اور یہی وہ بُت پرستی تھی جس کی
طرف ہمیشہ یہودی لوگ رجوع کرتے رہے۔ باوجودیکہ اُنھیں سخت سی سخت اور بے
پناہ عقوبتیں پہنچتی رہیں مگر اُنھوں نے ہر موقعہ پر اُس پاک وصاف توحید سے مُنہ موڑا
جس کے قبول کرنے کے واسطے اُن کے نفوس بہت بچھڑے ہوئے تھے۔ اور وہ اپنے
اُنھیں توہّم پرستیوں پر ہمیشہ قایم رہے جنھیں وہ بآسانی سمجھ سکتے تھے۔ جیسے مثلاً
طلائی گوسالہ کی پرستش اور برنجی سانپ کی عبادت۔ اب جا کے دنیا کے اس عہد
میں اُنھوں نے مدت سے یہ باتیں چھوڑ دی ہیں۔ اور یہ کیوں؟ نہ اس سبب سے کہ اُن کے
مذہبی خیالات زیادہ آسانی سے بیدار و خبردار ہو گئے ہیں۔ یا یہ کہ اُن کے مذہبی ہم
و ہراس اکثر برانگیختہ ہوتے ہیں۔ نہیں بلکہ اب وہ اپنے پُرانے جوار و دیار سے بالکل
الگ تھلگ ہو گئے ہیں۔ اب وہ اُن اسباب سے متاثر ہی نہیں ہوتے جو کبھی تو ہول
اور دہشت کے جذبات اور کبھی شکریہ اور امتنان کے خیالات کو مشتعل کیا کرتے تھے۔ اب
دن کے وقت نہ کبھی بادل کے ٹکڑے دیکھتے ہیں نہ رات کو آگ کے ستون۔ اب نہ
اُن پر کوہ سینا سے شریعت نازل ہوتی نظر آتی ہے نہ کوہ طور سے رعد کی کڑک اُنھیں
سُنائی دیتی ہے۔ جب تک اُن کے پیش نظر یہ چونکانے والے مناظر تھے وہ باطن میں بُت پرست
رہے اور جہاں ذرا موقع مل جاتا تھا وہ بتوں کو پوجنے لگتے تھے۔ اُن کے ایسا کرنے کا
سبب یہ تھا کہ اُس وقت وہ ایسی وحشت اور جہالت میں پڑے ہوئے تھے کہ جن کا فطری
ثمرہ بُت پرستی تھی۔ اب بعد کو جو انقلاب اُن میں ہوا۔ اُسے سوا اس سادہ واقعہ کے اور

کس ممکن حالت پر محول کر سکتے ہیں کہ دوسری قوموں کی طرح یہودی لوگ جس قدر تمدن میں ترقی کرتے گئے اپنے مذہب کو پاک وصاف بناتے اور بے غل وغش کرتے گئے اور بہت سے معبودوں کی پرستش سے گریز کر کے اپنے نفوس کو بتدریج ایک ایسے علت العلل کے مستقل خیال تک بلند کر لے گئے کہ جس خیال کو اُن کے دلنشین بنانے کی کوشش ابتدائی زمانہ میں لاحاصل اور بے سُود ٹھیری تھی۔

کسی قوم کے خیالات اور اُس کے علم میں ایسا قریبی تعلق ہے اور وہ اس قدر ضروری ہے کہ جہاں تک اقوام سے واسطہ ہے ذہنی تحریکات کو مذہبی ترقی پر مقدم ہی ہونا چاہیئے۔ اگر ہم اس کارآمد امر حق کی مزید توضیح وتشریح چاہتے ہیں تو ہم کو اُسے اُن واقعات میں دیکھنا چاہیئے جو یورپ میں اشاعت دین عیسوی کے بالکل بعد ہی ظہور پذیر ہوئے۔ مستثنیات شاذہ کے ساتھ رومی لوگ ایک جاہل اور وحشی قوم تھی خونخوار، شہوت پرست اور ظالم تھے۔ ایسے لوگوں کے واسطے شرک وبُت پرستی ہی فطری مذہب تھا۔ چنانچہ برطبق اس کے ہم کتابوں میں یہ پڑھتے ہیں کہ اُن میں ایسی بُت پرستی رواج پائے ہوئے تھی جس سے چند اور صرف چند ہی اعلیٰ درجہ کے اہل نظر نفرت کی جرأت کر سکتے تھے۔ ایسے لوگوں میں پڑ کے مذہب عیسوی کی یہ گت ہوئی کہ اُس کے اعلیٰ اور قابل تعریف اصول کی کسی نے بھی قدر نہ پہچانی۔ پھر کچھ دن بعد جب یورپ پر نئے جلا وطنوں کی یورش ہوئی تو حملہ آور لوگ جو رومیوں سے زیادہ وحشی تھے اپنے ساتھ ایسے توہمات لائے جو اُن کے اصلی حالت کے لحاظ سے موزوں اور شایاں تھے ان دو ذریعوں سے جو مواد پیدا ہوا اُس کے سبب سے اب مذہب عیسوی کی طلبی ہوئی کہ آئے اور اپنا کام کرے۔ اور اُس کا جو حشر ہوا وہ حیرت انگیز ہے۔ یعنی جس وقت نیا مذہب اپنا راستہ صاف کر چکا اور جب یورپ کے بہترین حصہ میں وہ اپنا سکہ جما چکا اُس کے بعد جو دیکھا گیا تو یہ عقدہ حل ہوا کہ حقیقت میں ہُوا گیا کچھ بھی نہیں۔ اُس وقت جا کے

یہ معلوم ہوا کہ سوسائٹی ایسے طفولیت کے عالم میں تھی جس میں توہم پرستی لازمی ہے اور جس میں اگر انسان توہم پرستی کو ایک شکل میں مقبول نہیں کرتے تو دوسری صورت میں اختیار کر لیتے ہیں۔ پس یہ بالکل لاحاصل بات تھی کہ مذہب عیسوی نے ایک سادہ اصول کی تلقین کی اور ایک سادہ عبادت فرض ٹھیرائی کیونکہ انسانوں کے نفوس ایسے بڑے زینے کی طے کرنے کے لئے بالکل بچھڑے ہوئے تھے اور وہ زیادہ پیچدار طریقے اور زیادہ پیچدار عقیدے چاہتے تھے۔ چنانچہ اس کا جو کچھ نتیجہ ہوا وہ دینیات کی تاریخ کے مطالعہ کرنے والوں کو بخوبی معلوم ہے۔ بجائے اس کے کہ یورپ کی توہم پرستی گھٹ جاتی وہ صرف ایک نئی راہ لگ گئی اور نیا مذہب پرانی حماقتوں سے ستیاناس ہو گیا۔ بتوں کی تقدیس و تعظیم کی عوض پیروں کی تعظیم و تکریم شروع ہوئی اور سیبل کی پرستش کے عوض حضرت مریم کی پرستش قایم ہوئی۔ عیسائی گرجاؤں میں زمانۂ جاہلیت کی تقریبات منعقد ہونے لگیں اور نہ صرف صنم پرستی کی بذلہ سنجیاں بلکہ اُس کے اصول بھی فی الفور نئے مذہب کے جوش میں اضافہ اور خلط ملط کر دیے گئے۔ اور عمل میں آنے لگے۔ حتیٰ کہ چند نسلوں کے گزرتے ہی عیسائیت نے ایسی بچمیل اور کریہ شکل اختیار کی کہ اُس کی بہترین شانیں مٹ گئیں اور اُس کے ابتدائی حسن و جمال کے خط و خال بالکل فنا ہو گئے۔

چند صدیاں گزر چکنے کے بعد عیسائیت نے آہستہ آہستہ ان بیہودگیوں سے سر اُبھارا کہ جن میں سے اکثر ایسی تھیں جن کے دفع کرنے پر انتہا درجہ کے متمدن ملک اب تک قادر نہیں ہوئے ہیں۔ درحقیقت جب تک اذہان یورپ کسی حد تک اپنے خواب غفلت سے بیدار نہیں ہو چکے ہیں اُس وقت تک یہ ناممکن تھا کہ اصلاح کی شروعات بھی عمل میں آئے۔ جوں جوں علم انسانی بتدریج بڑھتا گیا وہ اُن توہم پرستوں سے نفرت دلاتا گیا جن پر وہ لوگ پہلے دلدادہ اور فریفتہ تھے۔ جس طور سے اُن کی نفرت اور بیزاری

بڑھی (اور اتنی بڑھی کہ سترھویں صدی میں وہ واقعہ عظیم پیش آیا جسے ریفارمیشن سے تعبیر کرتے ہیں) وہ زمانہ حال کی تاریخ میں ایک بیانِ دلچسپ ہے لیکن ہمارے موجودہ مطلب کے لئے ہم کو یہ اہم اور یادگار واقعہ دلنشین کرلینا چاہیئے کہ جب مذہب عیسوی یورپ کا مسلمہ مذہب بن چکا ہے اُس کے بعد بھی کئی سو برس تک اُس کے فطری ثمرات مترتب نہ ہوسکے کیونکہ اُس کا ایسے لوگوں سے پالا پڑا تھا جن کی جہالت اُنھیں توہم پرستی پر مجبور کئے ہوئے تھی۔ اور اُن لوگوں نے اپنی توہم پرستی کے سبب سے اُس مذہب کو بگاڑ رکھا تھا اور اسے صاف و پاکیزہ حالت میں اختیار کرنے کی اہلیت و قابلیت اُن میں نہ تھی

درحقیقت تاریخ کے ہر صفحہ میں ہم کو ایک تازہ شہادت اس امر کی ملتی ہے کہ جب تک ذہن کا نشو و نما مقدم نہیں ہو لیتا اُس وقت تک کسی قوم پر مذہبی اصول بہت تھوڑا اثر دکھاتے ہیں۔ مذہب کیتھولک کے مقابلہ میں پروٹسٹنٹ مذہب نے جو اقتدار پیدا کیا وہ اس کی ایک دلچسپ مثال ہے۔ مذہب کیتھولک کو پروٹسٹنٹ مذہب سے وہی نسبت ہے جو ازمنہ مظلمہ کو سولھویں صدی سے ہے۔ ازمنہ مظلمہ میں انسان جاہل اور سریع الاعتقاد تھے اس وجہ سے اُنھوں نے ایسا مذہب نکالا جس میں خوش عقیدگی کی ضرورت زیادہ تھی اور علم کی ضرورت کم تھی۔ اگرچہ سولھویں صدی میں اُن کی سریع الاعتقادی اور جہالت پھر بھی بہت تھی لیکن وہ روبہ تنزل تھی اور اُس کی ضرورت معلوم ہوئی تھی کہ ایسا مذہب ترتیب دیا جائے جو اُن کے تبدیل شدہ حالات کے شایاں ہو۔ یعنی وہ مذہب ایسا ہو جو آزادانہ تحقیقات کے لئے موزوں ہو۔ جس میں خوارق و اعجاز پیر پادری ملفوظات اور اصنام زیادہ بھرے ہوئے نہوں جس میں تہوار اور تقریبات شاذ اور کم تکلیف دہ ہوں۔ جو ترک لذات، روزے، اقرار معاصی، تجرّد اور اُن دیگر نفس کشی کی باتوں کو زیادہ ترغیب نہ دیتا ہو جن کا مدت سے رواج ہوگیا تھا۔ یہ سب باتیں پروٹسٹنٹ مذہب کے مُروّج ہو جانے سے ہوگئیں اور یہ ایسا طریقہ عبادت تھا جو ضروریات زمانہ

مطابق ہونے کی وجہ سے بہت جلد ترقی پکڑ گیا۔ اگر یہی تحریک عظیم بغیر کسی فتور یا خلل اندازی کے آگے بڑھنے پاتی تو چند ہی نسلوں کے گزرنے میں اگلی توہم پرستی کو مٹا دیتی اور اُس کی جگہ پر ایک سیدھے سادھے اور کم تکلیف دہ دین کو رائج کر دیتی۔ کیونکہ جس سُرعت سے یہ امر واقع ہوا تھا وہ مختلف ملکوں کی ذہنی ترقی کے متناسب تھی لیکن بدقسمتی سے یورپ کی سلطنتوں نے (جو ہمیشہ سے ایسے معاملات میں دخل دیا کرتی ہیں جن سے اُنھیں کچھ سروکار نہیں ہوتا) اپنا یہ فرض سمجھا کہ رعایا کی مذہبی اغراض ومقاصد کا تحفظ کریں اور اُنھوں نے مذہب کیتھولک کے پادریوں کی جنبہ داری کو اپنے ذمّہ لے کے اکثر مواقع پر اُس عہد کی فطرتی نشو ونما کو روک دیا۔ یہ مداخلت قریب قریب کُل حالتوں میں نیک نیتی پر مبنی تھی اور اُسے حکمرانوں کی صرف اُس بے علمی پر محمول کر سکتے ہیں جو ان میں اپنے اقتدارات کے متعلق پائی جاتی تھی لیکن اس مداخلت سے جو خرابیاں پیدا ہوئیں اُن میں کچھ مبالغہ کی ضرورت ہی نہیں۔ قریب قریب ڈیڑھ سو برس کے عرصہ تک یورپ میں مذہبی جنگ وجدل، مذہبی خونریزیوں اور مذہبی جور و تعدّی کی آفت برپا رہی اور اگر یہ امر حق تسلیم کر لیا جاتا کہ سلطنت کو نہ رعایا کے آزاد خیالات سے کوئی واسطہ ہے نہ اُسے کوئی حق اس بات کا ہے کہ جس طریقۂ عبادت کو رعایا پسند کرتی ہے اُس میں ذرا بھی دخل دے تو اُس جنگ وجدل اور ظلم وستم کی نوبت ہی نہ آتی۔ بہرطور۔ اگلے وقتوں میں یہ اصول یا تو کسی کو معلوم ہی نہ تھا یا اُس کی طرف کسی کو کچھ التفات ہی نہ تھی۔ اور جب تک سترھویں صدی کے وسط کا زمانہ نہیں آیا اُس وقت تک نہ یہ بڑے بڑے مذہبی نزاعات ومناقشات قطعی طور سے اختتام کو پہنچے نہ مختلف ممالک کو اپنے عوام الناس کے دین کے بارہ میں اطمینان نصیب ہوا۔ اور اُس وقت سے لے کے اب تک ان مذاہب کے اصل اصول میں کبھی مستقلاً کوئی تغیر واقع نہیں ہوا۔ دو سو برس سے زیادہ

ہو گئے ہیں کہ کسی قوم نے دوسری سے محض اُس کے مذہب کی وجہ سے لڑائی نہیں ٹھانی ہے اور اس مدّت میں جتنے بڑے بڑے شہر کیتھولک مذہب کے تھے وہ کیتھولک رہے اور جتنے بڑے بڑے شہر پروٹسٹنٹ مذہب کے تھے وہ پروٹسٹنٹ رہی۔

اس سے یہ بات پیدا ہوائی ہے کہ یورپ کے متعدد ملکوں میں مذہبی نشو ونما فطری طریقہ پر نہیں ہوئی بلکہ مصنوعی طور پر ایک غیر فطری طریقہ سے زبردستی واقع ہوئی فطری طریقہ کے موافق جو ملک سب سے بڑھکے متمدن تھے اُن کو پروٹسٹنٹ ہونا چاہئے تھا اور جو سب سے بڑھکے غیر متمدن تھے اُنھیں کیتھولک رہنا چاہیئے تھا۔ بحیثیت مجموعی اگر دیکھا جائے تو فی الواقع حالت یہی ہے۔ حتیٰ کہ اکثر اشخاص اس عجیب غلطی میں پڑگئے ہیں کہ زمانۂ حال کی کل روشنضیری کو مذہب پروٹسٹنٹ کے اثر پر محمول کرتے ہیں اور اس امر اہم سے چشم پوشی کر لیتے ہیں کہ پروٹسٹنٹ مذہب کی حاجت ہی اُس وقت تک نہیں پڑی جب تک روشنضیری شروع نہیں ہوئی۔ لیکن اگرچہ معمولی رفتار زمانہ کے لحاظ سے رفار میشن کی پیش قدمی کو اُس علم کی پیش قدمی کا ایک نشان ہونا چاہیئے تھا جو اُس سے مقدم آیا تھا تاہم اکثر حالتوں میں سلطنت اور کلیسیا کے اقتدار نے خلل انداز سببوں کی طرح عمل کیا اور مذہبی پیش قدمی کی اور مذہبی پیش قدمی کی فطری رفتار کو روک دیا اور جب ولیسٹ فیلیا کے عہدنامہ سے یورپ کے سیاسی تعلقات طے ہو چکے تب جاکر مذہبی مناقشات کا شوق اتنا فرو ہوا کہ لوگ اس بات کو کچھ زیادہ بکار آمد نہ سمجھنے لگے کہ کوئی مذہبی فساد اُٹھائیں اور اپنی جانوں کو مذہب حکومت کے اُلٹ پلٹ دینے کی کوشش کے واسطے جوکھوں میں ڈالیں۔ ساتھ ہی اس کے چونکہ سلطنتیں خود بھی بالتخصیص انقلاب اور تہلکہ کی شوقین نہیں رہی تھیں اس لئے اُنھوں نے بھی اسی رُکی تھمی حالت کو برقرار رہنے دیا اور بہت ہی فطری اور (میرے نزدیک) عاقلانہ طور سے اُنھوں نے کوئی بڑا تغیر تبدل نہ کیا بلکہ قومی نظامات کو جس حالت میں پایا بدستور اُسی حالت میں قایم رہنے دیا۔ یعنی

یہ کہ جو پروٹسٹنٹ تھے اُن کو پروٹسٹنٹ اور جو کیتھولک تھے اُنھیں کیتھولک ہی نے دیا۔
اسی کا یہ نتیجہ ہی کہ جس قومی مذہب کو کوئی ملک مانتا ہے وہ کوئی قطعی معیار اُس ملک کے تمدن کا نہیں ہے۔ کیونکہ جن حالات و اسباب نے مذہب کو قایم کر دیا تھا وہ اب سے بہت پیشتر واقع ہوئے تھے اور اُنھیں اسباب کے سہارے پر وہ مذہب قایم اور مستحکم چلا آتا ہے۔

یہاں تک تو یورپ کی دینی نظامات کی ابتدا کا بیان ہوا۔ لیکن اُن کے عملی نتائج میں بعض ہم کو ایسے نظر آتے ہیں جن سے اعلیٰ درجہ کا سبق حاصل ہوتا ہی۔ چونکہ اکثر ملکوں میں قومی مذہب خاص اُس قوم کے حالات پیشینہ کی بنا پر نہیں بلکہ ذی اقتدار افراد قوم کی زور و قوّت پر مبنی ہوتا ہے اس وجہ سے سلسلہ کے ساتھ ہی معلوم ہوتا ہے کہ اُن ملکوں میں مذہب وہ نتائج پیدا نہیں کرتا جن کی اُس سے توقع کی جاتی ہی مثلاً بہ نسبت پروٹسٹنٹ مذہب کے کیتھولک مذہب زیادہ توہم پرست اور زیادہ غیر متحمل ہے۔ لیکن اس سے کسی طرح یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ جن ملکوں میں پروٹسٹنٹ مذہب کی پیروی کی جاتی ہی وہاں لوگ زیادہ توہّم پرست اور غیر متحمل بہ نسبت اُن ملکوں کے باشندوں کے ہوں گے جہاں کیتھولک مذہب کا رواج ہے۔ برخلاف اس کے اہل فرانس اِن مکروہ صفات سے اسی قدر پاک صاف ہیں جتنی سخت پروٹسٹنٹ قومیں جیسے اہل اسکاٹلینڈ یا اہل سوئیڈن ہیں۔ میں اس مقام پر اعلیٰ درجہ کی تعلیم یافتہ جماعت کا ذکر تو کرتا نہیں لیکن دینداروں یا عوام الناس کی بابتہ یہ تسلیم کرنا ہی چاہیئے کہ اسکاٹلینڈ میں فرانس کی بہ نسبت توہّم پرستی زیادہ ہے اور دوسرے مقامات کے مذہب سے نفرت کہیں بڑھ کر ہے۔ اور سوئیڈن میں (جو یورپ کے قدیم ترین پروٹسٹنٹ شہروں میں ہے) کچھ اتفاقی طور سے نہیں بلکہ عادتاً ایسی ناروا داری اور جور و تعدّی کی خواہش پائی جاتی ہے کہ جو ایک کیتھولک مذہب کی پیروی کرنے والے ملک میں اگر ہوتی تو مذموم سمجھی جاتی۔ اور وہ اُس وقت

اور بھی شرمناک معلوم ہوتی ہے جبکہ وہ ایسے لوگوں سے ظہور پذیر ہوتی ہے جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اُن کا مذہب شخصی قوت فیصلہ کے خو پر مبنی ہے۔

یہ امور اس بات کو ظاہر کرتے ہیں اور اسی کو وسیع ترقیاس کے ذریعہ سے ثابت کرنا آسان ہوگا کہ جب مخصوص یا (جیسا کہا جاتا ہے) اتفاقی اسباب سے کوئی قوم ایسے مذہب کا ادعا کرتی ہے جو اُس قوم کے عام حالات سے زیادہ ترقی یافتہ ہوتا ہے تو وہ اپنی واجبی تاثیرات کو پیدا نہیں کرتا۔ پروٹسٹنٹ مذہب کو جو تفوق کیتھولک مذہب پر ہے وہ اس میں ہے کہ اُس نے توہم پرستی اور ناروا داری کو گھٹا دیا اور اہلِ دین کی قوت واقتدار میں ایک روک پیدا کر دی۔ لیکن یورپ کا تجربہ ہم کو یہ سبق پڑھاتا ہے کہ جب کسی ادنیٰ درجہ کی قوم میں اعلیٰ درجہ کا مذہب قرار پکڑتا ہے تو اُس کی فضیلت اور برتری باقی نہیں رہتی۔ اہل اسکاٹلینڈ اور اہلِ سوئیڈن (اور انھیں میں سوئیزرلینڈ کے بعض قبائل بھی اضافہ کئے جاسکتے ہیں) بہ نسبت اہلِ فرانس کے کم متمدن اور اس لئے زیادہ توہم پرست ہیں اور چونکہ حالت یہ ہے اس وجہ سے اگرچہ اُن کا مذہب اہلِ فرانس کے مذہب سے بہتر ہی ہے لیکن اس سے اُنھیں کچھ نفع حاصل نہیں ہوتا اُنھیں اس سے کچھ فائدہ نہیں پہنچتا کہ بہ سبب اُن حالات و اسباب کے جو مدت ہوئی گزر چکے ہیں اُنھوں نے تین سو برس ہوئے جب ایک دین اختیار کر لیا تھا اور اُسی پر محض تقلیداً اور الف وعادت کی وجہ سے وہ تمسک کر رہے ہیں۔ جس شخص نے اسکاٹلینڈ میں سفر کیا ہے اور کافی طور سے اپنی توجہ لوگوں کے آزاد خیالات کے مطالعہ پر مصروف رکھی ہے اور جو شخص اہل اسکاٹلینڈ کے دینیات پر غور کرتا ہے اور اسکاٹلینڈ کے کرک کی تاریخ اور وہاں کی مجلسوں اور نظامات کی روئدادوں کو پڑھتا ہے اُسے معلوم ہوجاتا ہے کہ ملک کو اُس کے مذہب سے کیا فیض پہنچتا ہے اور وہاں کے ناروا داری کے خیالات اور پروٹسٹنٹ رفارمیشن کے فطری رُجحانات میں کیسا وسیع فاصلہ حایل ہے۔ برعکس اس کے

جو شخص اسی انداز سے فرانس کو بنظر غور و تامل دیکھتا ہے اسے یہ نظر آتا ہے کہ ایک غیر آزاد مذہب کا ساتھ آزاد خیالات نے کس طرح دیا۔ اور وہ دین جو سراسر توہم پرستی سے مملو ہے اُس کا معتقد کس طرح ایک ایسا گروہ ہے جس میں نسبتاً توہم پرستی شاذ ہے۔

سیدھی سی بات یہ ہے کہ اہلِ فرانس کا مذہب خود اُن سے بدتر ہے اور اہلِ اسکاٹلینڈ کا مذہب خود اُن سے بہتر ہی۔ اور جس طرح فرانس کی آزادی مذہب کیتھولک کے بالکل شایان شان نہیں ہے اُسی طرح اسکاٹلینڈ کا تعصّب پروٹسٹنٹ مذہب سے میل نہیں کھاتا اور سب حالات کی طرح ان صورتوں میں سے خصوصیات دینی خصوصیات مذہبی سے مغلوب ہو گئی ہیں اور نہایت اہم امور میں عقیدۂ قومی کا کچھ اثر نہیں رہا ہے کیونکہ وہ اُس تمدّن سے جو ملک میں قایم ہے بالکل سازگار نہیں ہی۔ تو اب یہ کیسی مہمل بات ہی کہ تمدّن کو مذہب پر موقوف اور منحصر ٹھیرائیں۔ اور کسی سلطنت کی یہ کوششیں کس قدر احمقانہ ہیں کہ وہ ایسے مذہب کی حمایت و حفاظت کرنا چاہتی ہے کہ اگر وہ رعایا کی حالت کے لحاظ سے اُس کے لئے موزوں ہی تو اُس کے تحفّظ کی کچھ حاجت ہی نہیں یا اگر وہ رعایا کی حالت کے لحاظ سے ناموزوں ہے تو اُس سے کچھ بھی فیض نہیں پہنچ سکتا۔

اگر اس کتاب کے پڑھنے والے نے مرقومۂ بالا دلایل کے مفہوم کو سمجھ لیا ہے تو اُسے اس کی چنداں احتیاج نہ ہو گی کہ میں اسی تفصیل کے ساتھ دوسرے خلل انداز سبب یعنی لٹریچر (علوم وفنون) تشریح و تحلیل کروں۔ یہ ایک کھُلی ہوئی بات ہی کہ کسی قوم کے مذہب کے بارہ میں جو کچھ کہا گیا ہی وہ بہت کچھ اُس کے علوم وفنون پر بھی منطبق ہو سکتا ہی۔ علوم وفنون اگر اپنے صحیح اور بلا تصنّع حالت میں ہیں تو صرف ایک نقشہ ہیں جس میں کسی ملک کی کیفیت مندرج کی گئی ہے یا ایک سانچہ ہیں جس میں وہ علم ڈھالا گیا ہے۔ اس بارہ میں بھی (اُسی طرح جیسے اور معاملات میں جن پر ہم غور کر چکے ہیں) منفرد اشخاص درحقیقت بڑے بڑے کام کر سکتے اور اپنے عہد کی بلند تر منازل پر چڑھ سکتے ہیں

لیکن اگر وہ ایک معین حد سے تجاوز کر جاتے ہیں تو اُن کی سودمندی میں کمی ہو جاتی ہے اور اگر اُس سے بھی آگے بڑھ جاتے ہیں تو پھر اُن سے کوئی فیض نہیں پہنچتا جب اہل فکر اور اہل عمل میں فاصلۂ دراز حائل ہو جاتا ہے تو اول الذکر کا کچھ اقتدار باقی نہیں رہتا۔ اور آخر الذکر کو کچھ اُس سے حاصل نہیں ہوتا۔ یہی امر دنیائے قدیم میں پیش آیا تھا جبکہ عوام الناس کی جاہلانہ بُت پرستی اور فلاسفہ کے شایستہ طریقے ایک دوسرے سے اتنے فاصلہ پر جا پڑے تھے جس کا طے ہونا ممکن ہی نہ تھا۔ یہی خاص وجہ تھی جس کے سبب سے یونانی اور رومی لوگ اُس تمدن کو قایم نہ رکھ سکے جو ایک مدت قلیل کے واسطے اُنھیں نصیب ہو گیا تھا۔ ٹھیک یہی کارروائی بالفعل جرمنی میں جاری ہے کہ جہاں علوم فنون کا گرانقدر حصہ کنز مخفی کی طرح عالم اسرار میں ہے اور چونکہ اُسے جمہور قوم سے کوئی سروکار نہیں ہے اس لئے وہ قومی تمدن پر کوئی اثر نہیں ڈالتا۔ سچ یہ ہے کہ اگرچہ یورپ نے اپنے علوم و فنون سے بہت فیض پایا ہے لیکن یہ فیض اس کا نہیں ہے کہ علوم نے کیا کیا طبع آزمائیاں کی ہیں بلکہ اس کا ہے کہ علوم نے کن کن چیزوں کو محفوظ اور قایم رکھا ہے۔ علم قبل اس کے کہ وہ معرض تحریر میں آئے حاصل کیا جانا چاہیئے۔ اور کتابوں کا صرف یہی فائدہ ہے کہ وہ ایک گودام کا کام دیں جس میں ذہنی خزانے حفاظت سے جمع کئے جائیں اور جہاں وہ بآسانی دستیاب ہو سکیں۔ بجائے خود علوم و فنون محض بے حقیقت ہیں اور اُن کی جو کچھ قدر و منزلت ہے اس سبب سے ہے کہ وہ ایک سلح خانہ ہیں جس میں نفس انسانی کے اسلحہ چنے جاتے ہیں اور جس میں سے وہ عندالحاجۃ جلد نکال لئے جا سکتے ہیں پس وہ شخص نہایت حسرت مآب مدعی ہوگا جو اس بنیاد پر یہ تجویز کرے گا کہ ذرایع و وسایل حاصل کرنے کے واسطے اصل منشا فوت کر دیا جائے۔ جیسے یہ اُمید ہو گی کہ ہتیار دے ڈالنے کے بعد سلح خانہ کی حفاظت کی جائے گی اور جو خزانہ کو اس لئے برباد کرنا چاہیگا کہ اُس گودام کو ترقی دی جائے جس میں خزانہ رکھا ہے۔

لیکن یہی وہ بات ہی جس کے کرنے پر اکثر لوگ مائل ہوتے ہیں۔ علی الخصوص اہلِ علم حضرات سے ہم بہت کچھ علوم وفنون کی حفاظت اور اُس کی صلہ خواہی کی ضرورت کے بارہ میں سُنا کرتے ہیں اور بہت کم اُس آزادی اور دلیری کی ضرورت کی بابت سُنتے ہیں جس کے فقدان سے بہترین علوم وفنون بالکل بیکار و بے مصرف ہیں درحقیقت ایک عام رُجحان اس کا ہی کہ علوم وفنون کی منفعت کے بارہ میں مبالغہ نہیں کیا جاتا (کیونکہ یہ ناممکن بھی ہے) لیکن اُس شے کے سمجھنے میں غلط فہمی کی جاتی ہے جس میں حقیقۃً علم مضمر ہوا کرتا ہے۔ حقیقی علم (یعنی وہ علم جس پر کل تمدن مبنی ہے) صرف اُن تعلقات کے واقفیت میں ہی جو اشیاء اور خیالات میں بایک دگر ہے۔ یعنی بالفاظ دیگر وہ قوانین ذہنی اور نوامیس طبیعی کی واقفیت میں ہے۔ اگر کوئی وقت ایسا آجائے گا کہ جب یہ کل قوانین ونوامیس معلوم ہوجائیں گے اُس وقت علم انسانی کا دائرہ کامل ہوجائیگا لیکن اس اثنا میں کہ جب تک وہ وقت آئے علوم وفنون کی قدر وقیمت اُس حد تک منحصر ہوتی ہے جس حد تک کہ وہ اُن قوانین کی واقفیت یا اُن قوانین کے انکشاف کا مواد بہم پہنچاتا ہی۔ تعلیم کا کام یہی ہے کہ اس عظیم تحریک میں سہولت پیدا کرے اور جو سر و سامان انسان کو مُیسّر ہوتے ہیں اُنھیں بڑھا کے انسان کی اہلیت وقابلیت بڑھائے پس جس حد تک کہ علوم وفنون اس منشا کے حاصل ہونے میں معین ومددگار ہوتے ہیں اُسی قدر وہ زیادہ کارآمد ہوتے ہیں۔ لیکن علوم وفنون کی واقفیت پر اس حیثیت سے نظر ڈالنا کہ تعلیم کا مقصد یہی واقفیت ہی واقعات کی ترتیب میں غلطی کرنا اور اصل مطلب کو ذریعۂ حصول مطلب کا ماتحت ٹھہرانا ہے۔ چونکہ یہ کہا جاتا ہے اس لئے ہم اکثر ایسے لوگوں کو پاتے ہیں جو اعلیٰ درجہ کے تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں۔ حالانکہ اُن کے علم کی ترقی اُن کے تعلیم کی عجلت اور جلد بازی سے حقیقۃً ملتوی رہجاتی ہے۔ ہم اُنھیں اکثر اوقات ایسے تعصّبات کے بوجھ سے دبا ہوا دیکھتے ہیں جن کو اُن کی تعلیم نے گھٹانے کے عوض اور

چمکا دیا ہے۔ کیونکہ علوم وفنون جو نوع انسانی کے خیالات کے مخزن ہوتے ہیں وہ صرف عقل و دانش ہی سے مالامال نہیں ہوتے بلکہ اُن میں بیہودگیاں اور بے عقلیاں بھی بھری ہوتی ہیں اسی وجہ سے علوم وفنون سے نفع پہنچنا خود اُن علوم وفنون پر زیادہ تر موقوف نہو گا بلکہ جس قدر ہوشمندی سے اُن پر غور و فکر کی جائیگی اور جس ادراک صحیح سے اُن کا انتخاب کیا جائے گا اُس پر موقوف ہو گا۔ یہی اوّلین شرائط ہیں کامیابی کے اور اگر اُن کی پابندی کی جائے گی تو کسی ملک میں کتابوں کی تعداد اور اُن کی قدر و قیمت ایک امر فضول و بے مصرف ہو گی۔ تمدن کی ایک ترقی یافتہ حالت میں بھی ہمیشہ میلان اس طرف ہوتا ہے کہ علوم وفنون کے اُن شعبوں کو ترجیح دی جائے جو بجائے اس کے کہ قدیمی تعصبات کی مخالفت کرتے ہوں اُن کی تائید کرنے والے ہوں اور جن مواقع پر یہ میلان زیادہ غالب ہوتا ہے وہاں بہت کچھ پڑھنے کا نتیجہ صرف اسی قدر نکلتا ہے کہ ایسا مواد جمع کر دیا جائے جو اگلی غلطیوں کی تصدیق اور پُرانے تعصبات کی تائید کرے ہمارے وقتوں میں اس قسم کی مثالیں غیر معمولی نہیں ہیں اور ہم اکثر اوقات ایسے اشخاص سے دوچار ہوتے ہیں جن کا علم اُن کے جہالت کی حمایت کرتا ہے اور وہ لوگ جتنا زیادہ پڑھتے ہیں اُسی قدر اُن کی واقفیت کم ہو جاتی ہے۔ سوسائٹی کے ایسے حالات ہوا کئے ہیں جن میں یہ طریقہ ایسا عام تھا کہ اُس کی مدارات علوم وفنون نے نفع سے کہیں زیادہ نقصان پہنچایا ہے۔ مثلاً چھٹی صدی سے لے کر دسویں صدی تک کی کُل مدت کے اندر تمام یورپ میں تین چار سے زیادہ ایسے آدمی نہ تھے جو بطور خود غور و فکر کرنے کی جرأت رکھتے تھے اور وہ لوگ بھی اس پر مجبور تھے کہ اپنے مفہوم اور منشاء کو مغلق اور مبہم زبان میں بیان کر کے چھپائیں۔ سوسائٹی کا باقی حصہ ان چار صدیوں میں سخت جہالت میں ڈوبا ہوا تھا۔ ایسی حالتوں میں وہ چند لوگ جو پڑھنے کی استعداد رکھتے تھے وہ اپنے

کتب بینی کو ایسی کتابوں تک محدود رکھتے جو اُن کے تعصبات کی تائید کرنے والی اور تقویت دینے والی ہوتی تھیں مثلاً تذکرۃ الاولیا اور ملفوظات بزرگان دین ہی پڑھتے رہتے تھے۔ انھیں ذریعوں سے وہ ایسی جھوٹی اور لغو داستانیں گھڑ لیتے تھے جن سے اُس زمانہ کا علم دین خاص کر مملو ہے۔ یہ بیحد و بیشمار قصص و حکایات نہایت وسعت کے ساتھ شائع کئے جاتے تھے اور اُن کی قدر اس طرح کی جاتی تھی جیسے وہ کوئی بڑے بچے ہوئے اور کار آمد حقایق و معارف ہیں جس قدر زیادہ علوم و فنون پڑھے جاتے تھے اُسی قدر زیادہ ان روایتوں کا عقیدہ لوگوں کو ہوتا تھا۔ یعنی بالفاظ دیگر جتنا زیادہ علم بڑھتا تھا اُتنی زیادہ جہالت ترقی کرتی تھی اور مجھے اس بارہ میں کچھ شک و شبہ نہیں ہے کہ اگر ساتویں اور آٹھویں صدی میں (کیونکہ یہ زمانہ بہترین زمانہ اُس وقت کا تھا) برائے چندے ابجد کا کل علم ضائع ہو جاتا حتیٰ کہ لوگ ایسی کتابوں کو بالکل نہ پڑھتے جن میں اُنھیں کچھ حظ نہ ملتا تو اُس کے بعد جو ترقی یورپ کرتا وہ اُس سے کہیں زیادہ سرعت کے ساتھ ہوتی جتنی سرعت سے کہ واقع میں ہوئی کیونکہ جس وقت ترقی شروع ہوئی اُس وقت اُس کی اصلی مدمقابل وہ زود اعتقادی تھی جسے علوم و فنون نے پالا پوسا تھا۔ کچھ یہ بات نہ تھی کہ عمدہ کتابوں کی کمی تھی بلکہ عمدہ کتابوں کا ذوق ہی نہ تھا جو کچھ تھے یونان اور روم کے علوم و فنون تھے۔ انھیں پیر پادری لوگ (اہل کلیسا) نہ صرف حفاظت سے قایم رکھتے تھے بلکہ اُنھیں کو وقتاً فوقتاً وہ پڑھتے اور انھیں کی وہ نقلیں کیا کرتے تھے۔ لیکن یہ علوم و فنون ایسے پڑھنے والوں کو کیا فیض پہنچا سکتے تھے۔ بجائے اس کے کہ وہ اگلے مصنفین کی خوبیوں کو پہچان سکتے وہ اُن کے طرز بیان کی لطافتوں کو بھی نہیں سمجھ سکتے تھے۔ قدما کی تحقیقات کی ہمت اور جرأت دیکھ کے اُن کے بدن پر لرزہ چڑھتا تھا۔ اور روشنی کی پہلی شعاع سے اُن کی نگاہیں خیرہ ہوتی تھیں۔ وہ جب غیر مسیحی قدما کی کسی کتاب کو ہاتھ

میں لیتے تو اپنی بیباکی اور اُس کے خوفناک نتایج سے ان کے دل میں لرزہ پیدا ہوتا تھا اور اُن میں برابر یہ وحشت سمائے رہتی تھی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اُس کی کوئی رائے دلنشین ہو جائے اور اُنھیں ایک گناہ کبیرہ کا مرتکب بنا دے۔ انجام یہ تھا کہ اُنھوں نے زمانہ قدیم کی معرکتہ الآرا تصانیف کو طاق پر دھر دیا تھا اور ان کی جگہ پر ایسی واہیات خرافات تصانیف کو رکھ چھوڑا تھا جو اُن کے مذاق کو گندہ کرتی، اُن کے تعصبات کو بڑھاتی، اُن کی غلطیوں کو مستحکم کرتی اور یورپ کی جہالت کو اس طرح طوالت دیتی تھیں کہ ہر ایک توہّم پرستی معرضِ تحریر میں اور ہر شخص کے دسترس کے اندر آ کے محفوظ ہو جاتی تھی اور اُس کا اثر دایم قایم رہنے والا اور ابد تک لوگوں کے فہم و شعور کو کمزور بنانے والا ہو جاتا تھا۔

اسی صورت سے جو علوم و فنون کسی قوم کے قبضہ میں ہوتے ہیں اُن کی حقیقت و ماہیت بمقابلہ اُس قوم کی اُفتادِ طبیعت کے ادنیٰ مرتبہ کی ہوتی ہے۔ اُس زمانہ میں کہ جسے صحیح طور پر ازمنۂ مظلمہ سے نامزد کرتے ہیں ایسے علوم و فنون تھے جن میں قابل قدر مواد مل سکتا تھا لیکن کوئی شخص ایسا نہ تھا جو یہ جانتا ہو کہ اُس سے کیونکر کام لیں۔ ایک مدّت دراز تک لاطینی زبان بطور دیسی زبان کے تھی اور اگر لوگ چاہتے تو بڑے بڑے لاطینی مصنّفین کی تصانیف پڑھ سکتے تھے لیکن ایسا کرنے کے واسطے اُنھیں ایسی سوسائٹی میں ہونا ضرور تھا جو اُن کی سوسائٹی سے بالکل جُداگانہ حالت میں ہوتی وہ اور کُل قوموں کی طرح کسی خوبی کو اُسی معیار سے جانچتے تھے جو عام طور پر اُن کے زمانہ میں رائج تھا۔ اُس وقت تو فلزات سونے سے اچھے سمجھے جاتے تھے اور اس وجہ سے وہ سونے کو پھینکتے اور فلزات کو جمع کرتے تھے۔ جو کچھ اُس وقت واقع ہوا وہی ایک چھوٹے پیمانہ پر اب بھی ہو رہا ہے۔ ہر علم و فن میں تھوڑا وہ ہے جو حق و درست ہے اور بہت وہ ہے جو بالکل دروغ و کذب ہے۔ اور اُس علم و فن سے جو اثر پیدا ہوگا وہ خاصکر

[illegible]

جدید خیالات اور جدید انکشافات میں اتنی اہمیت اور سود مندی ہے کہ جس کی بابت مبالغہ کرنا مشکل ہے لیکن جب تک کہ اُن خیالات کو قبولیت نصیب ہو اور وہ انکشافات عمل میں آئیں اُس وقت تک اُن کا کوئی اثر مترتب نہیں ہوتا اور اسی وجہ سے اُن سے کوئی فیض نہیں پہنچ سکتا۔ علوم وفنون کبھی کسی قوم کو نفع رساں نہیں ہوسکتے جب تک وہ اُس قوم کو پہلے سے تیار نہ پائیں۔ اس بارہ میں علوم وفنون کو مذہبی آرا و خیالات سے مشابہت تام ہی۔ اگر کسی ملک کے علوم وفنون اور مذہب وہاں کے باشندوں کی ضروریات کے لئے موزوں اور شایاں نہیں ہیں تو وہ بیکار اور بے مصرف ہوں گے کیونکہ اُن علوم وفنون کا کوئی بھی پُرسان نہ ہوگا اور اُس مذہب کی پیروی کوئی بھی نہ کرے گا۔ ایسے حالات میں نفیس ترین کتابوں کو بھی کوئی نہیں پڑھتا۔ اور نہایت پاک و پاکیزہ اصول سے بھی نفرت کی جاتی ہے۔ پس وہ تصانیف گوشۂ گمنامی میں دھری رہ جاتی ہیں اور اُس دین میں کفر و زندقہ سے گندگی آجاتی ہی۔

ایک اور رائے جس کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے یہ ہے کہ یورپ کا تمدن مبنی ہے اُس قابلیت پر جو مختلف سلطنتوں نے ظاہر کی ہے اور اُس ہوشمندی پر جس سے سوسائٹی کی خرابیوں کا استیصال بذریعہ قوانین کیا گیا ہے۔ جس کسی نے تاریخ کا مطالعہ اُس کے اصلی ماخذوں کی مدد سے کیا ہے اُس کے نزدیک یہ رائے اس قدر لغو اور بیہودہ ہوگی کہ اُسے موزوں متانت و سنجیدگی سے اس کی تردید کرنا مشکل ہوگا۔ درحقیقت امور معاشرت میں جس قدر نظریات کبھی قایم کئے گئے ہیں اُن میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو ایسا کلیتہً بے بنیاد اور اپنے جمیع اجزا میں مہمل ہو جتنا یہ نظریہ ہے۔ سب سے پہلے ہمارے سامنے یہ بدیہی امر ہے کہ کسی ملک کے حکمراں ہمیشہ اُسی ملک کے باشندے ہوا کئے ہیں۔ اُسی ملک کے علوم وفنون میں اُنھوں نے آنکھیں کھولیں۔ وہیں کے قصص و

روایات اُن کی گھٹی میں پڑیں اور وہیں کے تعصّبات اُن کے دماغوں میں رچے بسے رہے تو غایتہ مافی الباب یہ ہے کہ ایسے لوگ اپنے عہد کے مخلوق تھے خالق نہ تھے اُن کی تدابیر مملکت اُس وقت کی معاشرتی ترقی کے معلول تھے علّت نہ تھے۔ یہ بات محض خیالی دلیلوں سے نہیں بلکہ ایسے عملی امور سے ثابت ہو سکتی ہے کہ جن کی تصدیق ہر تاریخ کا پڑھنے والا بطور خود کر سکتا ہے۔ کسی ملک میں کبھی کوئی پولیٹکل تحریک یا کوئی بڑی اصلاح خواہ وہ توضیع قوانین سے متعلق ہو یا عاملانہ نظم ونسق سے وہاں کے حکمرانوں کی ذات سے نہیں ہوئی ہے۔ ایسی تحریک کے ابتدائی محرک ہمیشہ جوانمرد اور قابل اہل نظر ہوا کیے ہیں جو ایک خرابی کا پتہ لگاتے ہیں، اُس کی جھاڑ کرتے ہیں اور اُس کی درستی کی تدبیر بتاتے ہیں۔ لیکن اس سب کچھ ہو چکنے پر بھی ایک مدت تک نہایت ہی روشن ضمیر سلطنتیں بھی اُس خرابی کو جاری رکھتے اور اصلاح کو روکتے رہے ہیں۔ بالآخر اگر اسباب وحالات حسب دلخواہ پیش آ گئے تو خارجی دباؤ اتنا بڑھ جاتا ہے کہ سلطنت اس پر مجبور ہو جاتی ہے کہ رضا وتسلیم کا درجہ قبول کرے۔ اور اُس وقت کہ جب اصلاح کا تکملہ ہو جاتا ہے رعایا سے یہ توقع رکھی جاتی ہے کہ وہ اپنے حکمرانوں کی زیرکی ودانائی کی مدّاح ہو کیونکہ اُنھیں کے سبب سے یہ سب کچھ ہوا۔ اب یہ کہ ملکی ترقی کی بھی یہ راہ ہے یہ بات ہر ایسے شخص کو بخوبی معلوم ہو گی جس نے مختلف ملکوں کی کتب قوانین کا مطالعہ وہاں کے سابقہ ترقی علم کے ساتھ کیا ہو گا۔ اس بارہ میں قطعی اور کامل شہادت اسی کتاب میں پیش کی جائے گی لیکن تمثیلاً میں قوانین غلہ کی منسوخی کی طرف اشارہ کروں گا۔ کیونکہ بلاشبہ یہ بہت ہی یادگار واقعہ منجملہ اُن واقعات کے ہے جو اس صدی کے دوران میں تاریخ انگلستان میں پیش آئے ہیں۔ اُن قوانین کی منسوخی کی عمدگی بلکہ ضرورت اب ہر ایسے شخص کے نزدیک مُسلّم ہے جو معقول علم وآگہی رکھتا ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ منسوخی نافذ کس طرح ہوئی تھی۔ وہ

انگریز جو اپنے ملک کی تاریخ سے کچھ واقف ہیں کہیں گے کہ اُن کا اصلی سبب پارلیمنٹ کی زیرکی و دانائی تھی۔ پھر بعض لوگ ایک قدم آگے بڑھانے کی کوشش کر کے اُس کو انجمن مخالف قانون غلّہ کی تحریک اور جوش وخروش کو اور اُس کی وجہ سے سلطنت پر جو دباؤ پڑا اُس کو سبب قرار دیں گے۔ لیکن جو شخص ان مختلف مدارج کو بغور مطالعہ کرے گا جن میں یہ عظیم مسئلہ یکے بعد دیگرے ہو کے گزرا ہے اُسے یہ معلوم ہو جائے گا کہ سلطنت، واضعان قوانین اور وہ انجمن یہ سب نہایت کارہ اور متنفر کارپرداز تھے اُس قوت کے جو ان سب قوتوں کے مجموعہ سے کہیں زیادہ زوردار تھی۔ یہ سب تو محض عام رائے کی اُس ترقی کے مُظہر تھے جو اُن کے زمانہ سے سو برس پیشتر سے شروع ہو چکی تھی۔ اس تحریک کے مراتب و مراحل پر میں ایک اور موقع پر نظر ڈالوں گا۔ سر دست اسی قدر کہنا کافی ہے کہ اٹھّارھویں صدی کے وسط کے بعد ہی سے تجارت میں حفاظتی قیود کی بیہودگی اور ناواجبی کو سیاست مدن کے ماہرین نے اس تکمیل کے ساتھ ثابت کر دیا تھا کہ ہر ایسا شخص جو اُن کے دلائل و براہین کے سمجھنے کی استعداد رکھتا تھا اور جس نے اُس کے متعلق شہادت پر (جو کچھ کہ جمع ہو چکی تھی) عبور حاصل کیا تھا وہ اس کا قایل ہو جاتا تھا۔ اسی وقت سے قوانین غلّہ کی منسوخی کا مسئلہ نہ تو کسی فریق کا مسئلہ رہا تھا نہ مصلحت وقتی کا بلکہ محض علم و آگہی کا ایک معاملہ رہ گیا تھا۔ یعنی جو لوگ واقعات کو جانتے تھے وہ ان قوانین کی مخالفت کرتے تھے اور جو لوگ واقعات سے لاعلم تھے وہ اُن کی موافقت کرتے تھے۔ لہذا یہ واضح تھا کہ جب علم کی اشاعت ایک حد معیّن پر پہنچی اُس وقت وہ قوانین ضرور ہی زیر ہو جاتے۔ اب اُس انجمن کی جو کچھ کارگزاری تھی وہ اسی قدر تھی کہ وہ اس اشاعت علم میں مدد دے اور پارلیمنٹ کی جو کچھ کارگزاری تھی بس اتنی تھی کہ وہ رضا و تسلیم اختیار کرے۔ بہر نوع یہ یقینی ہے کہ اُس انجمن اور اُس مجلس واضعان قوانین دونوں کے اراکین زیادہ سے زیادہ اگر کچھ کر سکتے تھے

تو اسی قدر کہ علم کی ترقی سے جو امر کہ ہو کے رہنے والا تھا اُس کے ہو جانے میں جلدی کریں۔ اگر وہ ایک صدی پیشتر پیدا ہوئے ہوتے تو اُس وقت وہ بالکل بے اختیار محض ہوتے کیونکہ اُن کا زمانہ اُن کی کوششوں کے واسطے تیار نہ ہوتا۔ وہ لوگ اُس تحریک کے مخلوق تھے جو قبل اس کے کہ اُن میں کا کوئی ایک بھی پیدا ہو شروع ہو چکی تھی۔ اور انتہا سے انتہا اُن کا کام یہی تھا کہ جس بات کی تعلیم اوروں نے دی تھی اُسے عمل میں لائیں اور بلند آوازوں سے اُن سبقوں کو دوہرائیں جو انھوں نے اپنی داستانوں سے پڑھے تھے کیونکہ اس کا اِدعا نہیں کیا گیا تھا (یعنی خود وہ لوگ اس بات کے دعویدار تھے) کہ جن اصول کی تلقین وہ لوگ کرتے تھے اور جن کی اشاعت سلطنت کے ہر ہر گوشہ اور زاویہ میں کی جاتی تھی اُن میں کچھ بھی جدت نہ تھی اُس وقت سے بہت پیشتر جدید انکشافات ہو چکے تھے اور بتدریج اپنا عمل کر رہے تھے یعنی پُرانی غلطیوں کو مٹاتے اور ہر طرف لوگوں کو اپنا گرویدہ اور معتقد بناتے تھے۔ ہمارے وقتوں کے اہل اصلاح بھی بہاؤ کے رُخ پر بہتے رہے اور جس شے کی مقاومت عرصہ سے ناممکن ہو گئی تھی اُس کی تائید کرتے رہے۔ یہ کوئی خفیف یا طنزیہ تعریف اُن لوگوں کی نہ سمجھنا چاہیئے جنھوں نے بیشک وشبہ خدمتیں کی تھیں۔ جس مخالفت کو اُنھیں سر کرنا پڑا تھا وہ پھر بھی بہت شدید تھی اور سیاسی معاملات کی عدم واقفیت اور سیاسی قوانین وضع کرنے والوں کی ناقابلیت کے ثبوت کے طور پر یہ ہمیشہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اگرچہ سو برس سے آزاد تجارت کے اصول ایسے دلائل و براہین کے سلسلہ سے مسلّم ہو چکے تھے جو اُسی قدر راست و درست تھے جس قدر وہ دلایل و براہین راست و درست ہیں جن پر مابعد الطبعیات کے حقایق و معارف مبنی ہیں لیکن آخر وقت تک اُن کی تردید و تکذیب کی گئی۔ اور بڑی ہی مشکلوں سے اتنا ہوا کہ پارلیمنٹ اس پر آمادہ کی گئی کہ اُس شے کو عطا کردے جس کے لینے کے لئے رعایا مچلی ہوئی تھی۔ اور جس کی ضرورت کو قابل ترین

اشخاص نے تین نسلوں میں ثابت کر دیا تھا۔

میں نے اس واقعہ کو بطور مثال اس لئے منتخب کیا ہے کہ اُس کے واقعات متعلقہ میں کسی کو جائے گفتگو نہیں ہے اور درحقیقت اُن کی یاد ہم سب کے حافظہ میں ابھی تازہ ہے کیونکہ یہ بات اُس وقت پوشیدہ نہیں رکھی گئی تھی اور زمانہ مستقبل کو یہ جان لینا چاہیئے کہ یہ عظیم الشان کارروائی جو باستثنا رفارم بل کے اُن تمام قوانین سے جن کو انگریزی پارلیمنٹ نے نافذ کیا ہے اہم ترین تھی اُسے رفارم بل کی طرح خارجی دباؤ واضعان قوانین سے زبردستی حاصل کی گئی تھی۔ اُس کی اجازت ہنسی خوشی نہیں دی گئی تھی بلکہ ڈر کے دی گئی تھی اور یہ کہ اُسے اُن مدبران سلطنت نے جاری کیا تھا جنھوں نے اپنی عمریں اُس کی مخالفت میں صرف کر دی تھیں جس کی اب وہ یکایک حمایت کرنے لگے تھے۔ ان واقعات کی یہ تاریخ تھی اور ایسی ہی کچھ تاریخ اُن کل ترقیات کی ہوا کی ہے جو اس قدر اہم تھیں کہ زمانۂ حال کی توضیع قوانین میں اُنھیں مجتہدین کا رتبہ نہیں دیا جاسکتا ہے۔

ماورا اس کے ایک اور بات ہے جو اس قابل ہے کہ اُس پر وہ مصنفین لحاظ کریں جو یورپ کے تمدن کے ایک بڑے حصہ کو سلطنہائے یورپ کی تدابیر پر مبنی بتاتے ہیں وہ بات یہ ہے کہ ہر ایک بڑی اصلاح جو عمل میں آئی ہے اُس کی ترکیب میں صرف چند جدید امور کا کرنا داخل نہیں ہے بلکہ چند پرانی باتوں کا نہ کرنا بھی داخل ہے۔ توضیع قوانین میں جو نہایت قیمتی اضافے کئے گئے ہیں وہ ایسے قوانین ہیں جنھوں نے سابق قوانین کو باطل و کالعدم ٹھیرایا ہے اور سب سے بہتر قانون جو نافذ ہوئے ہیں وہ وہی ہیں جن کی رو سے کچھ اگلے قوانین منسوخ کئے گئے۔ اب جس قانون غلہ کا ابھی تذکرہ ہوا ہے اس کے بارہ میں جو کچھ کیا گیا تھا وہ اتنا ہی تھا کہ پرانے قوانین منسوخ کئے جائیں اور تجارت اپنی فطری آزادی کی حالت میں چھوڑ دی جائے۔ جب یہ بڑی اصلاح

انجام کو پہنچ گئی تو اُس وقت صرف یہی نتیجہ نکلا کہ سب چیزیں ایسے قرینہ سے رکھ دی
جائیں جس سے یہ معلوم ہو کہ کبھی وضع قوانین نے اُن میں مداخلت کی ہی نہ تھی ٹھیک
یہی رائے زمانہ حال کی ایک اور بڑی قانون سازی کی ترقی پر منطبق ہو سکتی ہے
یعنی مذہبی خونریزی کی کمی بیشک وشبہ یہ بھی اک نعمت عظمیٰ ہے۔ اگرچہ بدقسمتی سے وہ
نہایت ہی متمدن ملکوں میں بھی ہنوز ناقص و نامکمل ہے لیکن یہ بدیہی بات ہے کہ جو کچھ
کسر رہ گئی ہے وہ صرف اتنی کی وجہ سے ہے کہ واضعان قوانین نے خود رجعت
قہقری کی ہے اور اپنا کیا دھرا برباد کر دیا ہے۔ اگر ہم نہایت ہی مہربان اور روشن ضمیر
سلطنتوں کی حکمت عملی کا سُراغ لگاتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ سب اسی راہ پر
چلے ہیں۔ زمانہ حال کی توضیع قوانین کا سارا رُجحان اور پورا زور اس پر ہے کہ شاید کو
اُسی فطری جادہ پر لگا دیں جس سے اگلے مصنفین حضرات کی جہالت نے اُنھیں بھٹکا
رکھا ہے۔ یہ ایک بڑا کارنامہ ہے زمانہ حال کے کارناموں میں اور اگر واضعان
قانون اسے اچھی طرح انجام دے دیں تو وہ نوع انسانی کی شکرگزاری کے مستحق ہوں گے
لیکن اگرچہ اس طور پر ہم واضعان قانون میں سے منفرد اشخاص کے مشکور و ممنون بھی
ہوں تاہم بحیثیت ایک جماعت کے ہم اُن کی منّت کش یا شکرگزار ہو نہیں سکتے۔
اس لئے کہ درآنحالیکہ توضیع قوانین میں بہترین ترقیاں وہی ہوئی ہیں جو قوانین
سابق کی ناسخ تھیں تو یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ خوبیوں کا پلّہ اُن کی طرف جھکتا ہوا
ہو نہیں سکتا۔ پھر یہ بھی بدیہی امر ہے کہ تمدن کی ترقی اُن لوگوں کے دم سے وابستہ
نہیں ہو سکتی جنھوں نے اہم معاملات میں اتنا زیادہ نقصان پہنچایا ہے کہ متاخرین
محض اس وجہ سے نفع رساں خلایق سمجھے گئے کہ اُنھوں نے اپنے متقدمین کے طرز
عمل کو پلٹ دیا اور حالات و معاملات کو اُس اصلی صورت پر کر دیا جو مُدبرین وقت
کی مداخلت کی وجہ سے عمل پذیر نہیں ہوئی تھی حالانکہ اگر وہ معاملات کو اپنی حالت پر

چھوڑ دیے تو وہ فطرۃً بہ تقاضائے ضرورت اچھی صورت میں ظہور پذیر ہوئے۔

حقیقت یہ ہے کہ جس حد تک کارفرما جماعتوں نے مداخلت کی ہے اور جو خرابیاں اس سے ہوئیں وہ اتنی نمودار ہیں کہ اہلِ نظر اس پر تعجب کرتے ہیں کہ اتنی رُکاوٹوں کے حائل ہونے پر بھی تمدن نے جو ترقی کی تو کس طرح کی۔ فی الحقیقت یورپ کے بعض ملکوں میں یہ رُکاوٹیں ایسی بے پناہ تھیں کہ اُن کا سر کرلے جانا ممکن نہ ہوا چنانچہ وہاں قومی ترقی رُک کے رہ گئی۔ خود انگلستان میں جہاں (اُن اسباب سے جنھیں میں ابھی ذکر کروں گا) اور مقامات کی بہ نسبت طبقۂ اعلیٰ والی جماعتیں کئی سو برس تک کم مقتدر رہیں۔ وہاں بھی اس قدر خرابی ضرور پیدا ہوئی کہ جو اگرچہ اُس سے بدرجہا کم ہے جتنی اور ملکوں میں ہے تاہم اتنی سخت ضرور تھی کہ اُس نے نفس انسانی کی تاریخ میں ایک المناک باب کا اضافہ کردیا ہے اُن خرابیوں کا شمار کرنا گویا انگلستان کی توضیع قوانین کی تاریخ لکھنا ہے کیونکہ سرسری طور سے کہہ سکتے ہیں کہ باستثناء بعض ضروری قوانین متعلق بہ قیام امن و امان و تعزیرات جرایم کی اور جو کارروائی کی گئی غلطی پر مبنی تھی۔ اس طور پر اگر ہم صرف وہی نمایاں واقعات چُن لیں جن میں قیل و قال کی گنجایش نہیں ہے تو یہ یقین ہے کہ کُل مفید معاملات کو محض اس وجہ سے سخت گزند پہنچا کہ واضعان قوانین نے اُن کو مدد پہنچانے کی کوشش کیں۔ زمانۂ حال کے تمدن کے مددگاروں میں تجارت سے بڑھ کے کوئی زیادہ قابل لحاظ نہیں ہے کہ جس کی توسیع نے انسان کے سامان آسایش و مسرت غالباً دوسروں سے زیادہ مُہیّا کیے ہیں۔ لیکن یورپ کے ہر ایک ملک نے (جس نے تجارت کے بارہ میں کوئی بھی قانون وضع کیا)، اس طور پر عمل کیا گویا اُس کا اصلی منشا تجارت کو مٹانا اور تاجروں کو تباہ و برباد کرنا تھا۔ بجائے اس کے کہ وہ قومی کاروبار کو اپنی راہ چلنے دیتے اُسے بےحد و شمار قواعد و ضوابط کے ایک سلسلہ نے درہم برہم کردیا اور اگرچہ ان سب کا منشا اُسے نفع پہنچانا تھا لیکن ان سب نے سخت نقصان پہنچایا۔ یہ بات

یہاں تک بڑھی کہ جن تجارتی اصلاحات نے انگلستان کو گزشتہ بیس برسوں میں سر برآوردہ کر رکھا ہے وہ صرف یہی تھیں کہ یہ بیہودہ اور مداخلت بیجا کرنے والے آئین وضوابط منسوخ ومسترد کئے گئے۔ اس معاملہ میں پیشتر جو قوانین وضع کئے گئے تھے اور جن میں سے بُتیرے اب بھی نافذ اور جاری ہیں اُن پر غور کرنے ہی سے استعجاب ہوتا ہے۔ یہ کہنا مبالغہ میں داخل نہ ہوگا کہ یورپ میں تجارتی قوانین کی توضیع کی تاریخ ایک شہادت اُن تمام ممکن الوقوع مزاحمتوں کی ہے جو تجارت کے فروغ میں مانع ہوسکتی تھیں۔ درحقیقت ایک اعلیٰ درجہ کے مستند شخص نے (جس نے اس مبحث پر کامل غور کیا ہے) ابھی حال ہی میں یہ ظاہر کر دیا ہے کہ اگر چوری چھپے بے محصول دیئے مال لے جانے کا عمل جاری نہ ہوتا تو اس متواتر دخل درمعقولات سے تجارت چلائے نہ چلتی اور بالکل ہی فنا ہو جاتی۔ بہرکیف چاہے یہ بیان کتنا ہی مبالغہ آمیز کیوں نہو اس بات سے کوئی واقف کار شخص انکار نہیں کرسکتا کہ کسی زمانہ میں تجارت کیسی کمزور تھی اور جو مزاحمتیں اُس کی سدِّراہ تھیں وہ کتنی زبردست تھیں۔ ہرطرف اور ہر وقت گورنمنٹ کی مداخلت جاری تھی۔ درآمد پر محاصل، برآمد پر محاصل نقصان پذیر تجارت کو فروغ دینے کے لئے اور کسی کثیرالمنفعت تجارت کو نیچا دکھانے پر محاصل، صنعت وحرفت کی ایک شاخ کے لئے امتناعی حکم اور دوسری شاخ کے واسطے موجباتِ ترغیب، تجارت کی ایک جنس کی پیداوار اس لئے ممنوع کہ وہ نوآبادیوں میں پیدا ہوتی ہے اور دوسری جنس کے واسطے یہ حکم کہ وہ پیدا کی جائے اور خریدی جائے مگر دوبارہ بیچی نہ جائے۔ پھر ایک اور جنس کی بابتہ یہ حکم کہ وہ پیدا کی جائے اور خریدی بھی جائے مگر ملک سے باہر نکلنے نہ پائے۔ پھر قوانین کو دیکھئے تو مزدوری کی شرح منضبط کرنے کے قوانین، قیمتوں کے منضبط کرنے کے قوانین، منافع کے منضبط کرنے کے قوانین اور روپیہ پر سود کے منضبط کرنے کے

قوانین۔ اور اسی کے ساتھ چنگی اور راہداری کے حد درجہ پریشان کن انتظامات اور اُس کے متعلق وہ پیچیدہ انتظام تھا جس کو ڈگمگاتی سیڑھی کا بہت موزوں نام دیا گیا تھا جو ایسی ضرر رساں چالاکی سے قایم کیا گیا تھا کہ اُس کی بدولت ایک ہی جنس پر محاصل بار بار ادلتے بدلتے رہتے تھے اور کوئی شخص پیشتر سے یہ حساب نہیں لگا سکتا تھا کہ اُسے کیا دینا پڑے گا۔ اس مذبذب حالت پر (جو بجائے خود تجارت کو گھُن کی طرح کھائے جاتی تھی) تحصیل محصول کی سختیاں مستزاد تھیں اور اُن کا اثر ہر درجہ کے خریداروں اور مال لانے والوں پر پڑتا تھا۔ راہداری کے محصول اتنے سنگین تھے کہ بعض اوقات مال کی پیداوار کی لاگت سے دُگنی بلکہ چوگنی ہو جاتی تھی بازاروں میں مداخلت، کارخانوں میں مداخلت، کلوں میں مداخلت حتیٰ کہ دوکانوں تک میں مداخلت کا ایک ضابطہ مُعیّن کر دیا گیا تھا اور اُس پر نہایت سختی سے عمل کیا جاتا تھا۔ شہروں کی نگہبانی آبکاری والے کرتے تھے اور بندرگاہوں میں مدّوجزر دیکھنے والے ہجوم کئے رہتے تھے جن کا صرف یہ کام ہوتا تھا کہ قریب قریب ہر ایک کاروبار خانگی کی نگرانی کرتے رہیں۔ ہر گٹھری اور بُقچہ کی دیکھ بھال کریں اور ہر جنس پر محصول لگائیں۔ غرض اس سارے جھنجھٹ کا ماحصل حفاظت تھا۔ یعنی یہ کہنا چاہیئے کہ جو روپیہ وصول کیا جاتا تھا اور جو اذیّت لوگوں کو پہنچتی تھی وہ اس لئے نہیں کہ سلطنت کو نفع پہنچے بلکہ اس لئے کہ رعایا مستفیض ہو۔ یعنی بالفاظ دیگر اہلِ حرفہ اس لئے لوٹے جاتے تھے کہ اُن کے کاروبار میں فلاح ہو۔

یہ ہیں بعض وہ فوائد جو یورپ کی تجارت نے یورپ کے واضعان قوانین کی شفقت بزرگانہ سے حاصل کئے ہیں۔ لیکن ابھی اس سے کچھ بدتر باقی ہیں۔ کیونکہ اس انتظام سے جو کچھ مالی نقصانات پہنچے وہ اگرچہ بجائے خود بڑے بڑے نقصانات تھے لیکن اُن سے کہیں بڑھ چڑھ کے وہ اخلاقی خرابیاں تھیں جو اسی انتظام سے پیدا ہوئی تھیں

پہلا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ یورپ کے ہر حصہ میں چوری چھپے اور بے محصول دیئے مال نکال لے جانے والے متعدد پر زور اور مسلح جماعتیں پیدا ہو گئیں جن کی معاش کا انحصار اُن قوانین کی نافرمانی پر تھا جو اُن کے جاہل اور بے علم حکمرانوں کے نافذ کردہ تھے یہ لوگ جو سزا کے ڈر سے بے خوف اور ہر طرح کے جرم کے ارتکاب کے عادی ہوتے تھے گرد و پیش کی آبادی کو ستیاناس کرتے تھے اور با امن و امان دیہات میں وہ خرابیاں پھیلاتے تھے جن کو وہاں کے جاہل لوگ جانتے بھی نہ تھے۔ ان کی بدولت پورے پورے گھرانے تباہ ہو جاتے تھے جہاں کہیں اُن کا گزر ہوتا تھا وہاں شراب خواری چوری اور رندی و اوباشی کا چرچا ہونے لگتا تھا اور جو لوگ اُن کے سنگت میں پڑ جاتے تھے وہ ایسی ذلیل اور بیجا یانہ عیش پرستی کے خوگر ہو جاتے تھے کہ جو ایک مطلق العنان اور آزاد خود سر زندگی کے مقتضیات فطری میں ہوتی ہیں۔ تو یہ بیحد و نہایت جرایم جو اس حالت کی وجہ سے وقوع میں آتے تھے براہ راست اُن سلطنتہائے یورپ کی وجہ سے وقوع میں آتے تھے جنھوں نے اُن کو اشتعالک دے رکھی تھی۔ یہ جرایم تو قوانین کی وجہ سے ہوتے تھے اور جبکہ وہ قوانین منسوخ ہو گئے ہیں وہ جرایم بھی مسدود ہو گئے ہیں۔ لیکن مشکل سے یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ ایسی حکمت عملی سے جیسی یہ تھی تمدن کے اغراض و مقاصد میں کچھ بھی ترقی ہوئی اور مشکل ہی سے یہ دعویٰ بھی کیا جا سکتا ہے کہ ہم کسی ایسے انتظام کے کچھ بھی منت کش ہیں جس نے مجرموں کے ایک نئے گروہ کو پیدا کر کے آخر کار اپنے قدم پیچھے پلٹائے اور گو کہ اُس نے جرایم کا خاتمہ کر دیا لیکن مٹایا اُسی شے کو جو خود اُس کی اپنی کارروائی سے پیدا ہوئی تھی۔

اس کہنے کی کچھ ضرورت نہیں ہے کہ یہ بیانات اُن خدمات پر موثر نہیں ہیں جو ہر ایک شایستہ سلطنت نے سوسائٹی کے حق میں کی ہیں۔ ہر ملک میں جرایم کی سزا دینے اور قانون وضع کرنے کی قوت نہ کہیں منتج بہ ہونا چاہیئے۔ ورنہ قوم میں طوائف الملوکی ایک عالم ہوگا

لیکن ایک مورخ جس الزام کو ہر سلطنت کی طرف (جو اب تک معرض وجود میں آچکی ہے)
منسوب کرنے میں مجبور ہے وہ یہ ہے کہ وہ سلطنت اپنے حدود سے تجاوز کرتی رہی ہے
اور اُس نے ہر قدم پر بیحساب نقصان پہنچایا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اپنے حکومت کی شان
دکھانے کی تمنا ایسی عالمگیر تھی کہ کوئی گروہ جسے یہ اقتدار حاصل ہوا کبھی اپنے اقتدار کے
بیجا صرف سے باز نہ رہا۔ امن وامان قایم رکھنا۔ زبردست کو زیردست کی ایذادہی سے
باز رکھنا۔ جمہور کی صحت عامہ کے واسطے بعض احتیاطوں کو عمل میں لانا یہی وہ خدمتیں
ہیں جو ایک سلطنت تمدن کے اغراض کے واسطے کرسکتی ہے اور اس سے کوئی شخص انکار
کر نہیں سکتا کہ یہ خدمتیں بہت کچھ گرانقدر ہیں لیکن یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ان سے تمدن کو
پیش قدمی نصیب ہو سکتی ہے یا نوع انسانی کی ترقی میں سہولیت حاصل ہو سکتی ہے۔ جو کچھ
کیا گیا ہے اسی قدر ہے کہ ترقی کے واسطے کچھ موقعے پیدا کئے جائیں لیکن خود ترقی دوسرے
امور پر منحصر رہے۔ اب یہ امر کہ توضیع قوانین کے بارہ میں بھی یہی رائے صحیح ہے یہ اس بات
سے بھی واضح ہے کہ جس قدر علم کی نشر واشاعت بڑھ رہی ہے اور جس قدر روز افزوں
تجربات آیندہ نسلوں کو اپنے گزشتہ نسلوں کی بہ نسبت زندگی کے پیچیدہ تعلقات میں
زیادہ سمجھدار بنا رہے ہیں ٹھیک اُسی تناسب سے لوگ ایسے حفاظتی قوانین کی تنسیخ پر زور
لگا رہے ہیں جن کی توضیع کو مُدبّرین سلطنت سیاسی مآل اندیشی کا فوز عظیم سمجھتے تھے۔

لہذا اس بات کو دیکھ کر کے کہ سلطنتوں کی کوششیں تمدن کے حق میں (جب نہایت
کامیاب بھی ہوئی ہیں تب بھی) بالکل سالبہ تھیں اور پھر اس بات کو پیش نظر رکھ کے
کہ وہ ضرر رساں ہوئیں صاف صاف یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ خیال ضرور غلط ہوگا کہ
یورپ کی ترقی اُس کے حکمرانوں کی دانائی پر مبنی تھی۔ یہ وہ قیاس ہے جو نہ صرف
اُن دلایل پر مبنی ہے جو پیش کی جاچکی ہیں بلکہ ایسے واقعات پر مبنی ہے جو تاریخ کے
[illegible] سکتے ہیں کیونکہ جب کبھی سلطنت نے اپنے حدود جائز کو پہچانا ہی

نہیں تو اُس کا یہ نتیجہ ہوا کہ ہر ایک سلطنت نے اپنی رعایا کو بڑے بڑے نقصان پہنچائے اور یہ جو کچھ ضرر رسانی کی نہایت نیک نیتی سے کی سلطنتوں کی اس حفاظتی حکمت عملی نے تجارت کو گزند پہنچانے اور جرایم کے بڑھانے میں جو اثر دکھایا اُس کو ابھی دیکھ چکے ہیں اور ان مثالوں پر بیحد و شمار مثالیں اور بھی مستزاد کی جا سکتی ہیں مثلاً کئی صدیوں تک ہر سلطنت یہی سمجھا کی کہ اُس کا فریضۂ لازمی یہ ہے کہ حقایق مذہبی کی توسیع و اشاعت کرے اور اغلاط مذہبی کو بڑھنے نہ دے۔ اس سے جو خرابی پیدا ہوئی اُس کا اندازہ ہو نہیں سکتا۔ اور تمام خیالات کو الگ رکھکے اُس کے دو سر برآوردہ نتایج کو بیان کر دینا کافی ہے۔ یعنی ریاکاری کی زیادتی اور حلف دروغی کی ترقی کسی مخصوص رائے کے اعتقاد کو کسی سزا و پاداش سے مربوط کر دینے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ریاکاری بڑھے چاہے اشخاص منفرد کی کچھ ہی حالت ہو یہ یقینی ہے کہ اکثر انسانوں کے لئے متواتر موجبات ترغیب سے بچنا نہایت دشوار ہوتا ہے اور جب یہ للچانے والا سامان عزت و سربلندی یا منفعت مالی کی شکل میں اُن کے سامنے آتا ہے تو بسا اوقات وہ اس پر آمادہ ہو جاتے ہیں کہ مقبول عام رائے کا اعتراف کر لیں اور واقع میں اپنے عقیدہ کو نہ چھوڑیں بلکہ اُن ظاہری علامتوں کو ترک کر دیں جن سے وہ عقیدہ عالم میں آشکارا ہوتا ہے۔ ہر ایک شخص جو اس پر کاربند ہوتا ہے وہ ریاکار ہوتا ہے اور ہر ایک سلطنت جو اس کارروائی کی ترغیب دیتی ہے وہ ریاکاری کی مددگار اور ریاکاروں کی پیدا کرنے والی ہوتی ہے۔ لہذا ہم بخوبی یہ کہہ سکتے ہیں کہ جب کوئی سلطنت یہ صلائے عام دیتی ہے کہ جو لوگ فلاں قسم کی رایوں کا اعتراف کر لیں گے (معتقدات کو قبول کر لیں گے) اُن کو فلاں حقوق حاصل ہو جائیں گے وہ سلطنت اگلے زمانہ کی شیطان کی طرح ہوتی ہے اور اہرمن کی طرح نہایت کمینہ طور سے اس عالم کی اشیاء نفیسہ کو اُس شخص کی نذر کرتی ہے جو اپنے عبادت کو بدل ڈالے اور اپنے عقیدہ سے

مرتد ہو جائے۔ پھر اسی کے ساتھ ساتھ دروغ حلفی کو بھی ترقی ہوتی ہے اور وہ گویا ریاکار کا جزو ہے۔ کیونکہ جب واضعان قوانین صاف دیکھ لیتے ہیں کہ جو مرتد لوگ اس طرح ملتے ہیں اُن پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا تو وہ اس خطرہ کا دفعیہ نہایت ہی غیر معمولی احتیاطوں سے کرتے ہیں اور انسانوں کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ اپنے عقیدہ کو متواتر قسموں اور حلفوں سے باندھ دیں اور اس طور پر اُن کی یہ کوشش رہتی ہے کہ نئے مذہب بدلنے والوں کے مقابلہ میں پرانے عقیدہ کو محفوظ کر لیں۔ یہ شک و شبہ جو دوسروں کی منشا اور نیت کے بارہ میں رہا ہے اس نے ہر قسم کی اور ہر طرف بکثرت قسمیں اور حلف ایجاد کئے ہیں۔ انگلستان میں تو لڑکا کالج میں پڑھتا ہے وہ بھی اس پر مجبور کیا جاتا ہے کہ ایسے امور کی قسم کھائے جنہیں وہ سمجھ بھی نہیں سکتا اور جن کو نہایت ہی پختہ کار طبائع بھی بخوبی جان نہیں سکتے۔ پھر بعد ازاں جب وہ پارلیمنٹ میں داخل ہوتا ہے تو اُس وقت بھی اُسی مذہب کے بارہ میں حلف اُٹھانا پڑتا ہے اور سیاسی زندگی کے قریب قریب ہر زینہ پر نئے حلف لینے کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ بڑی بڑی قسمیں اکثر اوقات خفیف خفیف امور کے لئے لی جاتی ہیں۔ خداوند کریم کی شہادت چونکہ ہر موقع پر اس سنجیدگی و متانت سے دی جاتی ہے اس لئے نتیجہ یہ ہوا کہ جو حلف اس طرح معمولی موقعوں پر اُٹھوائے جاتے ہیں وہ آخر کار مُردہ ہو کے بالکل رسمی ہو گئے ہیں۔ جو امر کہ سرسری طور سے کیا جاتا ہے وہ آسانی سے مٹ بھی جاتا ہے۔ اور انگریزی سوسائٹی کے بہترین مبصر (یعنی وہ مبصر جو مختلف طبائع اور مختلف آرا کے ہیں) سب اس بات میں متفق ہیں کہ انگلستان میں جو حلف دروغی نے رواج پایا ہے اور جسے براہ راست سلطنت نے پیدا کیا ہے وہ ایسی عام ہو گئی ہے کہ وہ قوم کی خرابی اخلاق کا ایک سبب بن گئی ہے۔ اُس نے انسانی شہادت کی قدر و قیمت گھٹا دی ہے اور اُس اعتماد کو متزلزل کر دیا ہے جو فطری طور سے انسان اپنے ابنائے جنس کے کلام پر کرتا ہے۔

جو کھلی کھلی برائیاں اور (ان سے بھی زیادہ خطرناک) جو اندرونی (باطنی) فساد چلائے اس طور پر سوسائٹی کے درمیان عیسائی فرمانرواؤں کی جاہلانہ مداخلت سے جڑ پکڑ گئے ہیں اُن کا بیان درحقیقت نہایت دردناک ہے۔ لیکن یہ ایسا معاملہ ہے کہ جسے میں اسباب تمدن کی چھان بین میں نظر انداز کر نہیں سکتا تھا۔ یہ آسان بات ہے کہ یہ تحقیقات اور آگے بڑھائی جائے اور یہ دکھایا جائے کہ واضعان قوانین نے بعض خاص مطالب کی حفاظت اور بعض خاص اصول کی حمایت کی کوشش میں نہ صرف ناکامی اُٹھائی ہے بلکہ ایسے نتائج کا باعث ہوئے ہیں جو صریحاً اُن نیتجوں کے متضاد تھے جو انھوں نے تجویز کئے تھے ہم دیکھ چکے ہیں کہ مزدوری و حرفت کے بارہ میں اُن کے قوانین نے مزدوری و حرفت کو گزند پہنچایا۔ مذہب کے بارہ میں اُن کے قوانین نے ریاکاری کو بڑھایا اور سچائی کے محفوظ رکھنے کے بارہ میں اُن کے قوانین نے حلف دروغی کو ترقی دی۔

ٹھیک اسی طرح قریب قریب ہر ملک نے سود خواری کے روکنے اور روپیہ کے سُود گھٹانے کی تدبیریں کیں اور یکساں نتیجہ یہی نکلا کہ سود خواری بڑھی اور روپیہ کا سود چڑھتا چلا گیا کیونکہ کوئی ممانعت اُس فطری تعلق کو جو رسد اور مانگ میں ہوتا ہے مٹا نہیں سکتی۔ پس نتیجہ یہی نکلا کہ جب بعض لوگ قرض لینا اور بعض قرض دینا چاہتے ہیں تو یہ یقینی امر ہے کہ دونوں فریق اُس قانون سے مفر پانے کی صورت نکالیں گے جو اُن کے فطری تعلقات میں رخنہ انداز ہوگا۔ اگر دونوں فریق اپنے حال پر چھوڑ دیئے جاتے کہ اپنے معاملہ کا سمجھوتا بے کھٹکے کرلیں تو سود خواری محض قرضہ کی حالات کے بموجب رہتی مثلاً یہ کہ کفالت کی مقدار (مالیت) کیا ہے اور ادائے زر کی نوبت کب آئے گی۔ لیکن سلطنت کے دخل درمعقولات سے یہ فطری معاملت پیچیدہ ہوگئی ہے۔ چونکہ ہمیشہ کچھ نہ کچھ جوکھم اُن لوگوں کو اُٹھانا پڑتی ہے جو قانون سے سرتابی کرتے ہیں اس لئے سود خوار نہایت بجا طور سے اُس وقت تک روپیہ قرض دینے سے انکار کرتا ہے جب تک اُس کی

پھر تلافی اُس [illegible]

پڑتا ہے۔ یہ تلافی صرف اُس قرضخواہ کی طرف سے ہوتی ہے جو اس طور پر دُونا سُود دینے پر مجبور رہتا ہے یعنی ایک تو وہ سود جو قرضہ کے فطری جوکھم کے واسطے ہوتا ہے اور دوسرا وہ سود جو قانون کے بنا پر جو مزید جوکھم ہوتی ہے اُس کے لئے۔ پس یہ وہ حالت ہے جس میں یورپ کے واضعین قانون نے اپنے آپ کو ڈال رکھا ہے انھوں نے سود خواری کے خلاف قانون وضع کر کے اُس شئے کو بڑھا دیا ہے جس کے مٹانے کے وہ درپے تھے۔ انھوں نے ایسے قانون نافذ کئے جن کی خلاف ورزی لوگوں کو اپنی شدید ضرورتوں کی وجہ سے کرنی پڑتی تھی۔ پھر سب پر طرّہ یہ ہے کہ اس خلاف ورزی کی پوری پاداش قرض لینے والوں کو بھگتنا پڑتی ہے۔ یعنی جس جماعت کی حمایت کے واسطے مقنن حضرات نے یہ مداخلت کی تھی اُنھیں کے سر یہ بلا جاتی ہے۔

اسی مداخلت کی دُھن اور اسی طرح کے غلط خیال حفاظت میں بڑی بڑی عیسائی سلطنتوں نے اور حرکتیں کی ہیں جو اس سے زیادہ ضرر رساں ہوئیں۔ اُنھوں نے سرگرمی کے ساتھ متواتر کوششیں مطابع کی آزادی مٹانے اور مذہب اور ملکی معاملات کے اہم مسائل پر لوگوں کو اظہار خیال سے روکنے کی کیں۔ قریب قریب ہر ملک میں اُنھوں نے کلیسیا کی مدد سے ایک وسیع انتظام علمی پولیس کا قایم کیا جس کا صرف یہ کام تھا کہ وہ استحقاق کو مٹائے جو ہر شخص کو اپنی رائے ظاہر کرنے کے متعلق حاصل ہے چند ممالک جہاں سخت سخت تدبیریں اس بارے میں عمل میں نہیں آئیں وہاں بھی ایسی تدبیریں ضرور کی گئیں جو اگرچہ اوروں سے کم جابرانہ نہیں مگر اُنھیں کے برابر ناروا تھیں کیونکہ اُن مقامات میں بھی جہاں علم کی آزادانہ نشر و اشاعت کو منع نہیں کیا اُنھوں نے اُس کے روکنے کے لئے طرح طرح کی کوششیں کیں۔ علم کے کل آلات پر اور اُن تمام ذرائع و وسائل پر جن کے ذریعہ سے اُس کی اشاعت کی جاتی ہے جیسے کتابیں پولیٹکل رسالے

کاغذ اور اسی قبیل کی اور چیزیں۔ ان سب پر اُنھوں نے ایسے بھاری بھاری محاصل لگا دیے کہ اگر انھوں نے عوام میں جہالت پھیلانے کا حلف اُٹھایا ہوتا تو اس سے زیادہ نہ کرتے۔ درحقیقت جب ان کی کارستانیوں پر نظر ڈالی جاتی ہے تو نہایت زور کے ساتھ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اُنھوں نے عقل انسانی پر ہر ایک بار ڈال رکھا تھا اُنھوں نے انسان کے خیالات تک پر محصول لگا دیا۔ جو شخص اپنے خیالات کو دوسروں تک پہنچانا چاہتا ہے اور یہ خواہش کرتا ہے کہ اپنے معلومات کے ذخیرے کو بڑھائے اُسے سب سے پہلے شاہی خزانۂ عامرہ میں محصول داخل کرنا چاہیئے۔ یہ سزا ہے اس جرم کی کہ وہ اپنے ابنائے جنس کو آگاہ و باخبر بنانا چاہتا ہے اور یہ وہ جزیہ ہے جو سلطنت علوم و فنون سے حاصل کرتی ہے اور جسے حاصل کرنے کے بعد پھر اس کل کارروائی کو جو شے اور زیادہ ناقابل برداشت بناتی ہے وہ ان رقوم کا تاوان مصرف ہے جو جبراً دماغی اور جسمانی محنت پر لگایا جاتا ہے سچ یہ ہے کہ یہ تصور ہی نہایت مہیب ہے کہ علم روکا جاتا ہے اور یہ کہ ایمانداری کی مشقت و حرفت، صبر و آزما غور و فکر اور بعض اوقات کامل ذہن و ذکاوت کی پیداواریں اس غرض سے گھٹائی جاتی ہیں کہ اُن کے بضاعتِ قلیل کا ایک بڑا حصہ ایک جاہل اور نکمے دربار کے شان و شکوہ بڑھانے میں صرف کیا جائے۔ اُس سے بعض مقتدر اشخاص کی حرص مٹائی جائے اور بسا اوقات اُن کے لئے ایسے ذرائع فراہم کرے جن کی بدولت وہی سامان جسے رعایا نے بہم پہنچایا ہے خود اُسی رعایا کے لئے موجب ہلاکت ثابت ہو

یہ بیان اور اس سے پیشتر جو کچھ اس بارہ میں کہا گیا ہے کہ یورپ کے پولیٹکل و اضعان قوانین نے کیا اثر پیدا کئے ہیں بلاشک محض فرضی و قیاسی نہیں ہے بلکہ ان کی شہادت و تائید ہر ایسا شخص کرسکتا ہے جس نے تاریخ پر عبور حاصل کیا ہوگا۔ درحقیقت ان میں سے بعض اب بھی انگلستان میں اپنا عمل کر رہے ہیں اور ایک نہ ایک ملک میں یہ سب اپنی

پوری قوت سے جلوہ دکھا لے لظرا سکتے ہیں۔ جب سب یہ امور یکجا جمع کئے جاتے ہیں
تو ان سے ایسا خطرناک (ہولناک) مجموعہ مرکب ہوتا ہے دیکھکے حیرت ہوتی ہے باوجود
ان سب اسباب مخالف کے تمدن کیونکر قدم بڑھا سکا۔ یہ بات کہ اُس نے انھیں اسباب
وحالات میں ترقی کی ایک قطعی ثبوت انسان کے غیر معمولی جوش اور ہمت کا ہے اور اس
عقیدہ کی تصدیق ہوتی ہے کہ توضیع قوانین کا دباؤ جس قدر گھٹتا ہے اور نفس انسانی
پر روک ٹوک جس قدر کم ہوتی ہے اُسی قدر سرعت کے ساتھ ترقی کا قدم آگے بڑھیگا
لیکن توضیع قوانین کو ترقی میں کس طرح کا دخیل سمجھنا ایک امر لغو بلکہ عقل سلیم کی ہنسی
اُڑانا ہے۔ البتہ اس قدر ضرور کہا جاسکتا ہے کہ واضعان قوانین نے اپنے متقدمین
کے کاموں کو مٹا کے کچھ فائدہ پہنچایا۔ پس اتنے ہی کے واسطے موجودہ نسل اُن کے
مرہون منت ہے اور یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ جس شے کو ایک نسل بطور نعمت غیر مترقبہ
کے سمجھتی ہے دوسری نسل اس کا مطالبہ بطور حق کرتی ہے اور جب کسی حق کے دینے
سے خشونت کے ساتھ انکار کیا جاتا ہے تو اُس وقت دو باتوں میں سے ایک
بات واقع ہوتی ہے یعنی یا تو قوم رو بہ تنزل ہو جاتی ہے یا رعایا سر اُٹھاتی ہے
اب اگر سلطنت اپنی بات پر اڑی رہتی ہے تو رعایا اس دشوار ضغطہ میں پڑجاتی
ہے کہ اگر وہ اطاعت قبول کرتی ہے تو اُس کے ملک کو نقصان پہنچتا ہے اور اگر سرکشی
وبغاوت کرتی ہے تو اس سے اور بھی زیادہ ابتری ملک میں پھیلتی ہے۔ مشرق کی
قدیم سلطنتوں میں اُن کا معمولی ڈھچر یہ تھا کہ وہ سر انقیاد خم کر دیتی تھی اور یورپ کی
سلطنتوں میں بندھی ہوئی چال یہ تھی کہ وہ سرتابی اور مقابلہ کرتی تھی۔ اسی سے وہ
بڑی بڑی شورشیں اور بغاوتیں ظہور پذیر ہوئیں جن سے زمانۂ حال کی تاریخ کا بڑا
حصہ رنگا پڑا ہے اور جو اُسی پرانی داستان یعنی ظالموں اور مظلوموں کے
باہمی جدوجہد کا اعادہ ہیں۔ بہر نوع اس بات سے انکار کرنا انصاف کا خون کرنا

ہوگا کہ کم سے کم ایک ملک میں یہ نازک اور مُہلک وقت اب کئی پشتوں سے ٹل چکا ہے یورپ کے ایک اور صرف ایک ہی ملک میں رعایا اتنی زبردست اور سلطنت ایسی کمزور ہوگئی ہے کہ بحیثیت مجموعی وہاں وضع قوانین کی تاریخ باوجود چند خلل اندازیوں کی تدریجی مگر مسلسل عطائے حقوق کی سرگزشت ہے۔ وہاں وہ اصلاحات جن کا فیصلہ دلیل و برہان پر ہوتا تو رد کردی جاتیں محض خوف کی وجہ سے مان لی گئیں۔ پھر جمہوریت کے خیالات کی مستقل ترقی سے حفاظت کے بعد حفاظت اور حقوق کے بعد حقوق ہمارے اپنے وقتوں میں بھی حاصل ہوتے رہے حتیٰ کہ قدیم نظامات (اگرچہ اب تک وہ اپنے اُنھیں ناموں سے نامزد کئے جاتے ہیں مگر) اپنے گزشتہ قوت کو کھو چکے ہیں اُن کا جو حشر ہونے والا ہے وہ ظاہر ہے ہم کو اس بات کا تذکرہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ اس ملک میں یورپ کے اور کسی ملک سے زیادہ مقنن حضرات رعایا کی خیالات کے مُظہر بلکہ اُن کے تابعدار رہے ہیں اور اسی بنا پر وہاں کی ترقی دیگر مقامات کی بہ نسبت مستقل اور مسلسل ہوتی رہی۔ وہاں نہ طوائف الملوکی ہوئی نہ انقلاب ہوا۔ اور دنیا اس صداقت کبریٰ سے مانوس ہوگئی ہے کہ لوگوں کے فلاح کی ایک خاص شرط یہ ہے کہ اُس کے حکمرانوں کو بہت کم قوت حاصل ہو۔ اور حکمران اُس قوت کو بہت احتیاط کے ساتھ صرف کریں اور اُن کا مرتبہ اتنا بلند نہ ہو جائے کہ اغراض قومی کے بس وہی حاکم علی الاطلاق بن جائیں یا یہ کہ وہ اپنے نزدیک اس کا مستحق نہ سمجھ لیں کہ جن کے فائدہ کے واسطے اُن کو وہ خدمت سپرد کی گئی ہے انھیں کے حقوق اور خواہشوں کو پائمال کردیں۔

باب ششم

فن تاریخ کا آغاز اور قرون متوسطہ میں

فن تاریخ کی حالت

اب میں اس کتاب کے پڑھنے والے کے سامنے اُن نمایاں حالات و اسباب کا ایک بیان پیش کر چکا جن سے عام طور پر تمدن کی ترقی منسوب کی جاتی ہے اور میں نے یہ ثابت کر دیا ہی کہ یہ حالات و اسباب بجائے اس کے کہ تمدن کے سبب ہوں اگر کچھ ہیں تو نتیجہ ہی ہیں اور اگرچہ مذہب، علوم و فنون اور توضیع قوانین سے نوع انسانی کی حالت میں اصلاح ہوتی ہی لیکن اُس سے زاید یہ سب امور انسان کے ہاتھوں اصلاح پاتے ہیں۔ بیشک جیسا ہم دیکھ چکے ہیں یہ سب امور جب نہایت عمدہ حالت میں بھی ہوتے ہیں تب بھی صرف درجہ دوم کے کارکن ہوتے ہیں کیونکہ اُن کا ظاہری اثر چاہی کتنا ہی سود مند کیوں نہ ہو وہ خود اپنی جگہ انقلابات سابقہ کے نتیجہ ہوتے ہیں اور سوسائٹی کے حالات کے متغیر ہونے سے یہ حالت بھی تغیر پذیر ہوتے ہیں گے۔

اس صورت سے یہ کیفیت ہوئی ہے کہ ہر ایک بعد کی تحلیل و تشریح سے موجودہ تحقیقات کا دائرہ تنگ ہو گیا حتیٰ کہ ہم کو اس امر کے باور کرنے کی وجوہ ہیں کہ یورپ کے تمدن کی نشو و نما کلیتہً مبنی ہے علم کی ترقی پر اور علم کی ترقی موقوف و منحصر ہی اُن حقایق کی تعداد پر جو عقل انسان دریافت کرتی ہے اور اُس حد پر کہ جہاں تک وہ حقایق منتشر کئے جاتے ہیں۔ اس قضیہ کی تائید میں اب تک میں نے ایسے عام دلائل و براہین پیش

سے ہیں جن سے ایک ظن غالب پیدا ہوتا ہے اور اس ظن کو یقین کے مرتبہ پر پہنچانے کے لئے تاریخ کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت ہوگی۔ ان خیالی نتائج کی تصدیق نہایت ہی جزئی واقعات کے مشرح و مفصل بیان سے کرنے کی خدمت وہ ہے جسے میں نے اب حتی الامکان پورا کرنے کا قصد کیا ہے اور باب ماسبق میں میں نے یہ بیان کر دیا ہے کہ کس طریقے سے یہ تحقیقات جاری رکھی جائے گی۔ علاوہ اس کے مجھکو یہ معلوم ہوا ہے کہ میں نے جو اصول قایم کئے ہیں اُن کی جانچ پرتال ایک اور عنوان سے ہو سکتی ہے جس کا میں نے ہنوز تذکرہ تو نہیں کیا ہے لیکن وہ اس مبحث سے بہت قریبی واسطہ رکھتا ہے جو ہمارے پیش نظر ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ تاریخ انسان کی ترقی کی تحقیقات کے ساتھ ہی خود فن تاریخ کی ترقی کی تحقیقات بھی منضم کر دی جائے اس ذریعہ سے سوسائٹی کی حرکات پر بہت روشنی پڑے گی کیونکہ جس طور سے انسان اپنے زمانۂ ماضی پر غور کرتے ہیں اور جس طور سے وہ اپنے زمانۂ حال پر غور کرتے ہیں ان دونوں میں ہمیشہ ایک تعلق ہوگا۔ اس لئے کہ دونوں درحقیقت مختلف شکلیں ہوں گی ایک ہی طرز خیال کی اور اسی وجہ سے ہر زمانہ میں ان دونوں میں ایک خاص قسم کی ہمدردی اور مطابقت پائی جاتی ہے۔ مزید براں یہ بھی معلوم ہوگا کہ اس قسم کی تحقیقات جسے میں فن تاریخ کی تاریخ کہتا ہوں وہ ان دو سر برآوردہ امور کو مسلّم کرا دے گی کہ جو بہت گرانمایہ ہوں گی۔ پہلا امر یہ ہے کہ گزشتہ تین صدیوں میں بحیثیت مجموعی مورخین ہمیشہ عقل انسانی کا بڑا احترام کرتے رہے ہیں۔ اور اُن متعدد ترکیبوں سے اپنی بیزاری ظاہر کیا کئے ہیں جن کی وجہ سے عقل انسانی زمانہ سابق میں جکڑی رہی۔ دوسرا امر یہ ہے کہ اسی مدت میں اُنھوں نے ایک روز افزوں رجحان اُن معاملات کے نظر انداز کرنے کا ظاہر کیا ہے جو ایک وقت میں بڑے اہم و سودمند سمجھے جاتے تھے اور اُن معاملات پر زیادہ توجہ صرف کرنے لگے ہیں جو رعایا کی حالت اور علم کی

نشر و اشاعت سے واسطہ رکھتے ہیں۔ یہ دونوں امور اگر مقدمہ کتاب ہی میں بطور
طے ہوجائیں گے۔ اور یہ تسلیم کرنا چاہیئے کہ اُن کا وجود تائید و تصدیق کرتا ہے اُن
اصول کی جن کو میں نے بیان کیا ہے۔ اگر یہ بات طے ہوجائے کہ جس قدر سوسائیٹی نے
ترقی کی ہے اُسی قدر فن تاریخ علی التواتر ایک معینہ سمت پر مائل و راجع رہا ہے تو اس سے
ایک ظن غالب یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ خیالات ضرور صحیح و درست ہوں گے جن کی جانب
وہ بالبداہت بڑھ رہا ہے۔ درحقیقت اسی قسم کا ایک ظن وہ ہے جو کسی سائنس کے
طالب علم کے لئے اس بات کو بہت ضروری و اہم بنا دیتا ہے کہ وہ اُس سائنس کی تاریخ
سے واقف ہو۔ کیونکہ اس بارہ میں یہ قیاس غالب ہے کہ جب عام معلومات بڑھتی ہوتی
ہے تو اُس معلومات کی ہر ایک شاخ (اگر قابل اشخاص اُس پر غور و فکر کریں) ضرور
بڑھتی ہوئی ہوگی اور یہ صورت اُس وقت بھی ہوتی ہوگی جبکہ نتائج اس درجہ خفیف ہوں
کہ وہ قابل لحاظ نہ معلوم ہوتے ہوں۔ اسی مقام پر اُس طریقہ پر غور کرنا ضروری معلوم
ہوتا ہے جس سے قرون متواترہ میں مؤرخین نے اپنا رنگ بدلا ہے۔ کیونکہ ہم کو یہ معلوم
ہوجائے گا کہ یہ تغیرات ایک ہی رُخ پر مائل رہے ہیں۔ اور درحقیقت یہ تغیرات اُس
تحریک عظیم کا ایک جز ہیں جس کی امداد سے عقل انسانی نے بدقت تمام اپنے حقوق کا اظہار
کیا اور ان کہنہ تعصبات سے اپنے آپ کو رہا کیا جو ایک مدت سے اُس کی راہ میں حائل تھے۔

انھیں خیالات پر لحاظ کر کے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت اُن مختلف
تمدنوں کی دیکھ بھال کی جائے جن میں یورپ کے بڑے بڑے ملک علیحدہ علیحدہ ہوگئے ہیں
اُس وقت میں یہ بیان کردوں کہ کس طریقہ سے عموماً ہر ملک میں تاریخ کی تدوین کی گئی ہے
اس میں مجھے اس امر کے بیان کردینے سے بھی مدد ملے گی کہ باشندگان ملک کی حقیقی حالت
اور اُن کی رائے دربارہ زمانہ ماضی میں کیا واسطہ ہے اور اس غرض سے کہ یہ واسطہ
مد نظر رہے میں فن تاریخ کی حالت کو ایک جداگانہ مبحث نہ قرار دوں گا بلکہ اُسے ہر قوم

کی عقلی تاریخ کا ایک جزو قرار دوں گا۔ اس جلد میں تمدن فرانس (تا زمانۂ انقلاب عظیم) کے خاص خاص واقعات پر ایک نظر ڈالی جائے گی اور اسی کے ساتھ فرانسیسی موخین کا تذکرہ بھی ہوگا اور وہ نمایاں ترقیاں مذکور ہوں گی جو اُن لوگوں نے اپنے شعبہ ہائے علم میں کی ہیں۔ جو تعلق ان ترقیوں کو سوسائٹی کی اُس حالت سے تھا جس سے وہ پیدا ہوئی تھیں وہ بہت عجیب وغریب ہے اور اُسے کسی قدر طوالت کے ساتھ بیان کروں گا پھر دوسری جلد میں اسی طرح سے دیگر سربرآوردہ ممالک کے تمدن اور فن تاریخ سے بحث کی جائے گی۔ بہر نوع قبل اس کے کہ میں ان مختلف مباحث میں پڑوں مجھے یہ خیال ہوتا ہے کہ تاریخ یورپ کے ماخذ یا مبدء کی تحقیقات دلچسپ ہوگی اس لئے کہ وہ ایسے معاملات کی بابت معلومات بہم پہنچائے گی جو اب تک کم معلوم ہیں اور نیز یہ کہ اُس سے کتاب کا پڑھنے والا اُن بے شمار وقتوں کو سمجھ سکے گا جن میں فن تاریخ اپنے موجودہ ترقی یافتہ مگر ہنوز نہایت ناقص حالت پر پہنچی ہے۔ یورپ کی ابتدائی حالت پر غور ومطالعہ کرنے کا مواد مدت ہوئی ضائع ہو چکا ہے۔ لیکن وحشی قوموں کی بابتہ جس قدر وسیع علم وآگہی ہم کو حاصل ہے وہ ہمارے لئے ایک کارآمد سامان ہوگا۔ کیونکہ ان سب میں بہت کچھ قدر مشترک ہے۔ حد درجہ جہالت کے خیالات درحقیقت ہر جگہ ایک ہی ہوتے ہیں باستثنا اس کے کہ جب اُن میں ایسے اختلافات سے ترمیم واصلاح ہو جاتی ہے جو فطرت مختلف ممالک میں پیدا کر دیتی ہے۔ اسی وجہ سے مجھے اس میں تامل نہیں ہوتا کہ میں اُس شہادت سے کام لوں جو لایق وفایق سیاحوں نے فراہم کر دی ہے اور اُن سے طبائع یورپ کے اُس عہد کی بابتہ قیاسات مستنبط کروں جن کے بارہ میں کوئی براہ راست آگہی ہم کو نہیں ہے۔ بیشک ایسے نتایج خیالی ہوں گے لیکن گزشتہ ہزار برس کی مدت میں ہم ایسے خیالی نتایج سے بالکل مستغنی ہیں کیونکہ ہر بڑے ملک میں نویں صدی تک کی خود اپنی داستانیں موجود ہیں اور فرانس میں تو چھٹی صدی تک کے علی الاتصال واقعات

ماضی موجود ہیں۔ اس باب میں میرا یہ ارادہ ہی کہ میں اس کے نمونے دوں کہ کس طرح سولھویں صدی تک اعلیٰ ترین مستند اشخاص عادتاً تاریخ لکھتے تھے۔ پھر اس فن میں بعد کو جو ترقیاں سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں ہوئیں وہ ہر ملک کے جداگانہ عنوان کے تحت میں بیان کی جائیں گی۔ اور چونکہ ترقی سے پیشتر تاریخ نہایت فاش غلطیوں سے مملو تھی اس لئے سب سے پہلے میں اُن سربرآوردہ اسباب کی جانچ کروں گا جس سے یہ عالمگیر بیہودگی پیدا ہوئی تھی۔ اور یہ ظاہر کروں گا کہ کن امور تدریجی سے اُس کی حالت ایسی زبوں ہوگئی تھی کہ کئی صدیوں تک یورپ میں ایک فرد فرید بھی ایسا نہ ہوا جس نے زمانۂ ماضی پر نکتہ چیں نگاہ سے نظر ڈالی ہو یا جو خود اپنے عہد کے واقعات معقول صدق وصحت کے ساتھ لکھ سکا ہو۔

کسی قوم کی رفتار ترقی کے بہت ابتدائی عہد میں اور بہت پیشتر اُس وقت سے کہ جب وہ حروف کے استعمال سے واقف ہوں اُس کو ایسے سامان کی ضرورت محسوس ہوتی ہے جو امن وصلح کے دنوں میں اُس کی اوقات فرصت کا مشغلہ تفریح اور جنگ وجدل کے دنوں میں اُس کی شجاعت وجوانمردی میں جوش پیدا کرنے والا ہو۔ یہ ساماں اُس کے گیتوں کی ایجاد سے مُیسّر ہو جاتا ہے۔ اور یہی گیت وہ ہیں جو کل علم تاریخی کی جڑ بنیاد ہوتے ہیں اور یہی ایک نہ ایک شکل سے دنیا کے نہایت ہی وحشی وغیر مہذب جرگوں میں پائے جاتے ہیں۔ علی العموم انھیں اُس گروہ والے گاتے ہیں جن کا خاص شغل یہ ہوتا ہے کہ وہ اس طور سے سنت قدیمہ کے خزانہ کو محفوظ رکھیں بیشک زمانۂ ماضی کے بابتہ تجسّس ایک ایسا شوق فطری ہے کہ شاید بہت ہی چند قومیں ایسی ہوں گی جن میں ایسے بھاٹ یا کبیشر نہ ہوں چنانچہ مثال کے طور پر میں کہتا ہوں کہ یہی بھاٹ اور کبیشر تھے جنھوں نے نہ صرف یورپ بلکہ چین تبت، اور تاتار، اور اسی طرح ہند وسندھ، بلوچستان، مغربی ایشیا، جزائر بحر اسود، مصر، مغربی افریقہ،

شمالی امریکہ، جنوبی امریکہ اور جزائر بحر الکاہل کے مطبوع ومقبول افسانہ ہائے قدیم کو محفوظ رکھا
ان سب ملکوں میں مدّت دراز تک تحریر سے کوئی آشنا بھی نہ تھا۔ چونکہ ایسی حالت
میں کسی قوم کے پاس اپنی تاریخ کی یاد تازہ رکھنے کے واسطے اور کوئی ذریعہ بجز زبانی
داستان گوئی کے نہیں ہوتا لہذا وہ ایسے طریقہ کو انتخاب کرتے ہیں جو اُن کے حافظہ
کو سب سے بڑھکے مدد پہنچانے والا ہو۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ ثابت ہو جائے گا کہ علم کی
سب سے پہلے بنیاد ہمیشہ شاعری اور اکثر اوقات قافیہ بندی سے پڑتی ہے۔ ایک وحشی
کے کانوں کے لئے یہ الفاظ کی زیر و بم خوش آیند ہوتی ہے اور اُسے اُس کی بدولت
یہ اطمینان نصیب ہو جاتا ہے کہ وہ اُنھیں اپنے بچوں کے (اولاد کے) ہاتھ میں بے
کم و کاست اُسی حالت میں ورثہ چھوڑ جائے گا جس میں اُس نے اُنھیں پایا تھا۔ غلطی سے
محفوظ رکھنے کا یہ اطمینان ان گیتوں کی قدر اور بھی بڑھا دیتا ہے اور بجائے اس کے
کہ وہ صرف ایک تفریح کی چیز سمجھے جائیں اُن کا مرتبہ اتنا بلند ہو جاتا ہے کہ امور تصفیہ
طلب میں اُن سے استناد کیا جاتا ہے۔ اُن میں جو تلمیحات ہوتی ہیں وہ متخاصم خاندانوں
کے تصفیہ حقوق یا اُن وحشی ریاستوں کے تعین حدود میں قابل اطمینان سمجھے جاتے ہیں
اسی وجہ سے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ جو لوگ پیشہ کے طور پر ان گیتوں کے بنانے والے یا گانے
والے ہوتے ہیں وہ امور نزاعی میں مسلم الثبوت پنچ سمجھے جاتے ہیں۔ اور چونکہ اکثر اوقات
وہ لوگ مرشد (پردہت) ہوتے اور الہام سے بہرہ مند سمجھے جاتے ہیں تو غالباً اسی
صورت سے شعرا کی بابتہ تلامیذ رحمن ہونے کا خیال سب سے پہلے پیدا ہوا ہی۔ بیشک مختلف
قوموں کے مراسم اور خصوصیات مزاجی آب و ہوا کے یہ گیت مختلف ہوتے ہیں۔ جنوب میں
اُن کے قطع زیادہ پر ذوق وشوق اور نفسانی خواہشات کی ہیجان میں لانے والی ہے
شمال میں وہ زیادہ تر دردناکی اور جنگجوئی کی شان سے ممتاز ہیں۔ لیکن باوجود اس
جنگجوئی کے اس طرح کے کل طبعزاد کلاموں میں ایک شان ایسی ہوتی ہے جو سب میں مشترک

ہوتی ہے۔ نہ صرف یہ کہ وہ سب سچائی پر مبنی ہوتے ہیں بلکہ شاعرانہ رنگ آمیزی کو الگ کر ڈالنے پر وہ سب بالکل راست و درست ہوتے ہیں۔ وہ لوگ جو اُن گیتوں کو بار بار گاتے ہیں جنھیں وہ بار بار سُنا کرتے ہیں اور جو نزاعی امور میں مسلم الثبوت گلنے والوں سے تصفیہ کے لئے رجوع کرتے ہیں اُن کی بابتہ یہ احتمال نہیں ہوسکتا کہ وہ ایسے معاملات میں غلطی کر جائیں گے جن کی صحت و واقعیت کا خیال اُن کے دل سے لگا ہوتا ہے

جن متعدد مدارج میں ہوکے تاریخ کو گزرنا ضروری ہے اُن میں یہ سب سے بڑھکے آسان اور سادہ ہے لیکن رفتہ رفتہ بشرطیکہ ناموافق اسباب مخل نہ ہوں سوسائٹی آگے بڑھتی ہے اور منجملہ دیگر انقلابات کے ایک خاص تغیر جو سب سے بڑھکے اہم ہوتا ہے وہ تحریر و کتابت کا آغاز ہے یہ سلسلہ قبل اس کے کہ بہت نسلیں گزریں وضع قومی کے شان میں ایک کامل تغیر پیدا کرہی دیتا ہے۔

سب سے پہلے اور غالباً بالکل ہی یہی بات ہی کہ فن کتابت کے اجراسے علم قومی میں ایک قرار و ثبات پیدا ہوجاتا ہے اور اُس زبانی معلومات کی ضرورت (سودمندی) گھٹ جاتی ہے جس میں ایک حرف ناشناس (جاہل) قوم کی کُل لیاقت کو محدود ہونا چاہیے اسی سے یہ بات ہی کہ جوں جوں کوئی ملک قدم آگے بڑھاتا ہے اُس میں افسانہ ہائے قدیم کا اثر گھٹتا اور خود اُن داستانوں کا اعتبار کم ہوتا چلا جاتا ہے۔ علاوہ اس کے سوسائٹی کی اس حالت میں ان داستانوں کے ازبر کرنے والے بہت کچھ اپنی گزشتہ عزت و وقار کو کھو دیتے ہیں۔ ایک بالکل ہی حرف ناشناس قوم میں گیتوں کے گانے والے ہے (جیسا ہم ابھی دیکھ چکے ہیں)، اُن واقعات تاریخی کے حافظ اور امین ہوتے ہیں جن پر اُن کے سرداروں کی عزت و شہرت اور اکثر اوقات اُن کا مال و متاع موقوف ہوتا ہے۔ لیکن جب یہی قوم فن تحریر و کتابت سے واقف ہوجاتی ہی تو اُس وقت وہ اس سے بیزار ہوجاتی ہے کہ ایسے معاملات کو ایسے جہاں گرد گانے والوں کے حافظہ پر چھوڑ دے اور

پھر وہ اپنے جدید فن کی مدد سے اُن واقعات تاریخی کو ایک معین اور مادی صورت میں محفوظ رکھنا چاہتی ہے۔ اس کے بعد اُن لوگوں کی اہمیت اور وقعت جاتی رہتی ہے جو قومی داستانوں (سوانح) کو دُہرایا کرتے ہیں۔ آخر کار یہ لوگ جن پر قومی عزت و شہرت کا دارومدار تھا ادنیٰ درجہ کے لوگ رہ جاتی ہیں۔ اس طور سے ہم دیکھتے ہیں کہ اگرچہ کتابت کے بغیر کوئی زیادہ سودمند علم ہو نہیں سکتا لیکن یہ بیشک صحیح ہے کہ اُن کا چرچا (رواج) واقعات تاریخی کے واسطے دو جُداگانہ صورتوں سے ضرر رساں ہے۔ اول تو یہ کہ واقعات پارینہ کمزور ہو جاتے ہیں اور دوسرے یہ کہ جس جماعت کا یہ پیشہ ہوتا ہے کہ اُن واقعات پارینہ کو محفوظ رکھے اُس کا زور ٹوٹ جاتا ہے۔

لیکن اسی پر خاتمہ نہیں ہو جاتا۔ فن تحریر و کتابت سے صرف یہی نہیں ہوتا کہ حقایق منقولی کی تعداد گھٹ جاتی ہے بلکہ وہ براہ راست کذب و دروغ کی اشاعت میں مدد دیتی ہے۔ مثلاً زمانۂ قدیم میں ہرقل کا نام اکثر اُن بڑے بڑے رہزنوں کو دیا جاتا تھا جو نوع انسانی کے آزار دہندہ ہوتے تھے اور اگر اُن کے جرایم کامیاب اور نیز کثیر التعداد ہوتے تھے تو بالیقین اُن کے مرنے کے بعد اُن کی پرستش غازی مردوں کی طرح کی جاتی تھی۔ یہ بالکل محقق نہیں ہے کہ اس لقب کی اصل کیا ہے۔ لیکن غالباً سب سے پہلے یہ خطاب کسی ایک شخص کو دیا گیا ہوگا اور پھر اُن لوگوں کو ملنے لگا ہوگا جو اپنے فتوحات کی شانوں میں اُس کے مشابہ ہوئے ہوں گے۔ ایک نام کے استعمال کی اشاعت کا یہ طریقہ ایک وحشی قوم کے واسطے فطری بات ہے اور اُس وقت تک اُس سے دھوکا بہت ہی کم یا بلکہ بالکل نہیں ہوگا جب تک کہ ملک کے واقعات (داستانہائے) پارینہ مقامی اور غیر مسلسل رہیں گے۔ لیکن جیسے ہی یہ داستانہائے پارینہ ایک زبان تحریری کے ذریعہ سے معین ہوئیں اُن واقعات کے جمع کرنے والوں نے نام کی مشابہت سے دھوکا کھا کے منتشر واقعات کو جوڑا بٹورا اور ان جمع کئے ہوئے کارناموں کو ایک شخص واحد سے

اسی طور سے جیسے ہی کہ شمالی یورپ میں کتابت کا چرچا ہوا میکسو گرامیٹکس نے مشہور و معروف رگنار لاڈ براک کی سوانح زندگی ترتیب و تالیف کی۔ خواہ اتفاق سے یا بالارادہ اسکنڈینویا کے اس بڑے بنرد آزما سپاہی نے جس نے انگلستان کو تھرا رکھا تھا وہی رگنار کا نام لے پایا تھا کہ جو اُس سے سو برس پیشتر جوٹ لینڈ کے ایک رئیس کا تھا۔ اس توافق سے کوئی دھوکا اُس وقت تک نہ ہوا ہوگا جب تک کہ ہر ضلع میں خود اپنے رگنار کے واقعات علیحدہ اور جداگانہ طور سے موجود ہوں گے۔ لیکن فن تحریر کے سامان ہاتھ لگ جانے سے واقعات کے جداگانہ سلسلوں کو ایکجا ملا دیا گیا اور دو واقعات صحیحہ کو ایک غلطی میں خلط ملط کر دیا گیا۔ چنانچہ جو واقعہ ہوا وہ یہی تھا۔ زود عقیدہ سیکسو نے دونوں رگناروں کے مختلف کارناموں کو یکجا کر دیا اور اُن سب کو اپنے منظور نظر ہیرو کی طرف منسوب کر کے یورپ کے ابتدائی تاریخ کی سب سے زیادہ دلچسپ ٹکڑوں کو تاریکی میں ڈال دیا۔

شمال کے تاریخ قدیم میں اسی سبب سے غلطی کی ایک اور عجیب مثال ملتی ہے۔ فنس کے ایک جرگہ نے جو کوئین کہلاتا تھا خلیج باتھنیا کے شرقی ساحل پر ایک معتد بہ حصہ پر قبضہ کر لیا۔ اُن کے ملک کا نام کوئین لینڈ تھا اور اس نام نے یہ عقیدہ پیدا کیا کہ بالٹک کے شمال میں امیزانیوں کی ایک قوم تھی۔ اس غلطی کی اصلاح مقامی معلومات سے بآسانی ہو سکتی تھی لیکن تحریر کے ذریعہ سے یہ بادہوائی افواہ یکایک متعین ہو گئے اور یورپ کے بعض قدیم ترین تواریخ میں ایک ایسی قوم کی وجود کا یقینی طور سے اقرار کیا جاتا ہے اسی طرح فنلینڈ کے قدیم دارالسلطنت ابو کا نام ترکو تھا جس کے معنی سوئیڈن زبان میں پینٹھ کے ہیں آدم ساکن برامین کو جب اس کا موقع ملا کہ بالٹک کے متصل ممالک سے بحث کرے تو وہ ترکو کے لفظ سے ایسا بھٹکا کہ وہ مشہور مورخ اپنے ناظرین کو یہ باور کراتا ہے کہ فنلینڈ میں تُرک تھے۔

ان مثالوں میں اور بھی ایسے بہت سے اضافہ کئے جاسکتے ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ صرف ناموں نے کس طرح اگلے مؤرخین کو دھوکا دیا اور ایسے بیانات کا موجب ہوئے جو بالکل غلط تھے اور اگرچہ برسر موقع اُن کی صحت کی جاسکتی تھی لیکن محض فن تحریر و کتابت کی وجہ سے دور دست ممالک میں وہ غلطیاں پہنچیں اور تردید و تصحیح کے دسترس سے باہر ہوگئیں۔ اسی قسم کے واقعات میں سے ایک اور کا بیان کیا جاسکتا ہے کیونکہ وہ تاریخ انگلستان سے واسطہ رکھتا ہے۔ رچرڈ اول جو ہمارے بادشاہوں میں سب سے بڑھکے وحشی گزرا ہے وہ اپنے معاصرین میں شیر دل کے لقب سے معروف تھا اور یہ لقب اُسے اس لئے ملا تھا کہ وہ طبیعت کا نڈر اور خشمناک تھا۔ اسی وجہ سے یہ کہا جاتا تھا کہ اُسے شیر کا دل ملا تھا اور "شیر دل" کا لقب اُس کے نام کا اس طرح جزو لاینفک بن گیا کہ اُس سے ایک قصہ پیدا ہوگیا جس میں یہ مذکور ہے کہ اُس نے یکہ و تنہا شیر کا مقابلہ کیا اور اُسے مار ڈالا۔ یہ قصہ ایسا تھا جسے متعدد مصنفین نے اپنی تحریرات میں نقل کیا۔ یہ قصہ نام کی وجہ سے گھڑ لیا گیا اور قصہ نے نام کی تائید کی اور علی الخصوص قرون متوسط کی تاریخ میں غلطیوں کا جو طومار ہے اُس میں یہ داستان بھی شامل ہوگئی۔

یورپ میں صرف جو فن تحریر و کتابت کے رواج سے اس طرح سے فن تاریخ میں بہبودگیاں پیدا ہوئیں اُس میں ایک اور سبب سے بھی اعانت ہوئی۔ فن تحریر کے ساتھ اکثر حالتوں میں دین مسیحی کا علم بھی پھیلا اور اس جدید مذہب نے نہ صرف زمانۂ کفر و ارتداد کی بہت سی روایات کو برباد کیا بلکہ جو باقی بچی تھیں اُنھیں ملفوظات اولیا میں مخلوط کرکے اُن کی تغلیط و تردید بھی کی۔ جس حد تک یہ کارروائی جاری رہی وہ تحقیقات کے واسطے ایک عجیب مبحث ہوگا لیکن اُس کی ایک دو مثالیں غالباً اکثر ناظرین کی تسلی کے واسطے کافی ہوں گی۔

شمالی قوموں کی بہت ابتدائی حالت کی بابتہ ہمارے پاس بہت ہی کم قطعی شہادت ہے۔ لیکن بہت سے ایسے گیت جس میں اسکنڈ ینویا کے شاعروں نے اپنے بزرگوں یا اپنے

ہمعصروں نے کارہائے نمایاں بیان کئے ہیں اب تک محفوظ ہیں۔ اور باوجودیکہ بعد کو
اُن میں خرابیاں پیدا ہوگئیں پھر بھی نہایت قابل منصف مزاجوں کے نزدیک یہ مسلّم ہی۔
کہ اُن میں اصلی اور تاریخی واقعات مذکور رہیں۔ لیکن نویں اور دسویں صدی میں مسیحی مشنریوں
کو بالٹک کے عبور کرنے کا موقع ملا اور اُنھوں نے شمالی یورپ کے باشندوں میں اپنے مذہب کا
علم پہنچایا۔ ہنوز یہ ہو نہیں چکا تھا کہ تاریخ کے سر و سامان میں سمیّت سرایت کرنے لگی۔ گیارھویں
صدی کے خاتمہ پر ایک مسیحی واعظ سائمنڈ سگفسن نے شمال کی مطبوع و مقبول اور ہنوز معرضِ
تحریر میں نہ آئے ہوئے واقعات تاریخی کو الڈرایڈا میں جمع تالیف کیا اور اپنی تسکین قلب
کے لئے اس نے آخر میں اپنا تالیف کردہ ایک گیت بڑھا دیا جس میں عیسائی مذہب کی
بو پائی جاتی تھی تاکہ یہ سب مجموعہ پاک ہوجائے۔ سو برس بعد اُس سے وہاں کی دیسی
تواریخ کا ایک ادر مجموعہ تالیف کیا گیا لیکن جس اصول کو میں نے بیان کیا ہے چونکہ اُسے
عمل کرتے ہوئے زیادہ مدّت ہوگئی تھی اس لئے اُس کی اثرات اور زیادہ وضاحت سے
ظاہر ہوئے۔ اس دوسرے مجموعہ میں جس کا نام ینگر ایڈا ہی یونانی، یہودی اور عیسائی کہانیوں
کا ایک خوش آیند مجموعہ مرکب ہی۔ اور سب سے پہلے اسی کتاب میں اسکنڈنیویا کے ٹرائی کی
نسل سے پیدا ہونے کی وہ روایت ہی جو بہت وسعت کے ساتھ شایع ہی۔

اگر مزید تشریح کے لئے ہم دیگر اقطاع عالم کی طرف نظر کرتے ہیں تو ہم کو معلوم ہوتا ہے
کہ واقعات کا ایک سلسلہ ہے جو اس خیال کی تائید کر رہا ہے۔ ہم کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ جن
ملکوں میں کوئی تبادلۂ مذہب واقع نہیں ہوا ہے وہاں بہ نسبت اُن ملکوں کے جہاں اس قسم کی
تبدیلی ہوئی ہے تاریخ زیادہ قابل اعتبار اور مسلسل ہے۔ ہندوستان میں مذہب براہمہ (جو
اب بھی غالب ہے)، ایسے ابتدائی عہد میں رائج ہوا تھا کہ اُس کی ہدایت نہایت ہی بعید زمانہ
قدیم میں گم ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہی کہ وہاں کے ملکی واقعات پارینہ کسی جدید توہم پرستی سے
آلودہ نہیں ہوئے اور ہندوستان کے پاس ایسے روایات تاریخی ہیں کہ جو اتنی پُرانی اور

قدیمی ہیں کہ ایشیا کے کسی اور قوم کے پاس نہیں ہیں۔ اسی طرح چینی لوگ قریب دو ہزار برس سے مذہب فو پر قایم ہیں اور یہ مذہب بُدھ مذہب کی ایک نئی شکل ہے۔ اسی وجہ سے چین میں (اگرچہ وہاں کا تمدن کبھی ہندوستان کے تمدن کے برابر نہیں ہوا) ایک تاریخ ہے جو اگرچہ اس قدر قدیم تو نہیں ہے جتنے کہ وہاں کے باشندے ہم کو باور کرانا چاہتے ہیں پھر بھی اتنے زمانہ دراز تک ضرور پہنچتی ہے جو سنہ عیسوی سے کئی صدی پیشتر کا ہے۔ اور اُس وقت سے لے کے خود ہمارے وقتوں تک اُس کا سلسلہ بے خلل چلا آتا ہے۔ برعکس اس کے اہل فارس کے پاس (جن کی عقلی ترقی بیشک چینیوں سے فایق تھی) کوئی معتبر اطلاع اُن کی قدیم سلطنت کے ابتدائی فتوحات و کارنامجات کے نہیں ہے۔ اس کی بابتہ مجھے اس کے سوا اور کوئی معقول وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ فارس کو قران کی اشاعت کے بعد ہی مسلمانوں نے فتح کر لیا جنھوں نے اہل فارس کے مذہب کو کامل طور سے الٹ پلٹ دیا اور اس طور سے قومی روایات کے چشمہ میں تہلکہ ڈال دیا اسی وجہ سے بات ہے کہ اگر زند اُستاد کی قصص اصنام علیحدہ رکھ دی جائیں تو ہم تاریخ فارس میں کوئی قابلِ قدر ملکی مصنف نہیں ملتا حتیٰ کہ گیارھویں صدی میں شاہنامہ کا مصنف پیدا ہوا اس کتاب میں فردوسی نے اُن دو مذہبوں کے اعجاز نما تعلقات کو مخلوط کر دیا ہے جھوں نے اُس کے ملک کو یکے بعد دیگرے مسخر کیا تھا۔ انجام یہ ہے کہ اگر مختلف اکتشافات نہ ہو گئے تھے جو یادگاروں، کتابوں اور سکوں کے ذریعہ سے کئے گئے ہیں تو ہم اس پر مجبور ہوتے کہ ایک نہایت مہتم بالشان ایشیائی سلطنت کی تاریخ کے بارہ میں اپنے معلومات کے واسطے یونانی مصنّف کے غلط اور ناکافی تفصیلات پر تکیہ کرتے۔

زیادہ وحشی قوموں میں بھی ہم اسی کارروائی کو ہوتے دیکھتے ہیں ملایا پولینیشیا کی قوم کی بابتہ نسل انسانی کے محققوں کو بخوبی معلوم ہے کہ وہ متعدد جزائر کے سلسلوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ یہ جزائر مداغاسکر سے دو ہزار میل کے دَور میں امریکہ کے مغربی ساحل تک

[illegible] ہیں یہ لوگ [illegible] کے لحاظ [illegible] ہیں ان کا اصلی مذہب بت پرستی
تھا جس کی خالص صورتیں مدّت دراز تک جزائر فلپائن میں مروج رہیں۔ لیکن پندرھویں
صدی میں پولینیشیا کی اکثر قوموں نے اسلامی مذہب قبول کر لیا اور اس تبدیلی
مذہب کی رو میں وہی کارروائی ہوئی جسے میں نے دیگر ممالک میں بیان کیا ہے۔
نئے مذہب نے قومی خیالات کے بہاؤ کا رُخ بدل قومی تاریخ کی صفائی کو گندہ کر دیا
ہندوستانی مجمع الجزائر کے سب جزیروں میں جاوا وہ جزیرہ تھا جو تمدن کے سب سے
اعلیٰ درجہ پر پہنچا تھا۔ لیکن بایں‌ہمہ باشندگان جاوا نے نہ صرف اپنی تاریخی روایات
کو کھو دیا بلکہ اُن بادشاہوں کی جو فہرست باقی رہی تھی اُس میں بھی مُسلمان پیروں
کے نام داخل کر کے اُسے بگاڑ دیا۔ برعکس اس کے ہم دیکھتے ہیں کہ جاوا سے متصل
جزیرہ بالی میں (جہاں اب تک قدیم مذہب محفوظ ہے) جاوا کی پُرانی داستانیں
لوگوں کو یاد ہیں۔

جس طور سے ایک ناقص تمدن والے گروہ میں ایک نئے مذہب کے رواج سے
اُس گروہ کی ابتدائی تاریخ کی صحت و واقعیت پر مضر اثر پڑتا ہے اُس کی بابتہ مزید
شہادت پیش کرنا بیکار ہوگا۔ میں صرف یہی بیان کرنا ضروری جانتا ہوں کہ اسی طور سے
مسیحی پادریوں نے جن اقوام یورپ کا مذہب تبدیل کرایا اُن سب کی پُرانی داستانوں
کو تاریکی میں ڈال دیا اور گالون، ویلشی، آئرلینڈ والوں، اینگلوسیکسن والوں، سکینڈونیک
قوموں، فینوں، اور حتیٰ کہ آئسلینڈ کے باشندوں کی روایات قدیمہ کو غارت اور
مخلوط کر دیا۔

علاوہ اس سب کے کچھ اور بھی اسباب ایسے واقع ہو گئے جنھوں نے یہی نتیجہ دکھایا
اُن واقعات کی وجہ سے جن کو میں آگے چل کے بیان کروں گا سلطنت رومۃ الکبریٰ
کے زوال کلی سے کچھ ہی پیشتر یورپ کے علوم و فنون کلیتہً پادریوں کے ہاتھوں میں آ گئے

کیونکہ یہ لوگ مدت سے نوع انسانی کے واجب التعظیم اساتذہ مانے جاتے تھے۔ کئی سو برس تک یہ نہایت شاذ تھا کہ کوئی شخص جو پادری نہ ہو ایسا ملتا جو لکھنا پڑھنا جانتا ہو اور یہ تو بالکل ہی شاذ تھا کہ کوئی شخص ایسا ملتا جس میں کسی کتاب کی تصنیف و تالیف کی قابلیت ہوتی۔ جب علوم و فنون پر صرف ایک گروہ کا اس طرح قبضہ ہو گیا تو ان میں ایسی مخصوص شانیں پیدا ہو گئیں جو ان نئے مالکان علوم کے اثر کا نتیجہ تھیں اور چونکہ پادری لوگ (بحیثیت ایک جماعت کے) ہمیشہ یہ اپنا ہی کام سمجھا کئے ہیں کہ ترقی دینے کے اپنے عقیدے زبردستی منوائیں تو یہ کچھ عجیب بات نہیں تھی اگر انھوں نے اپنی تصنیفات میں وہ رنگ دکھایا جو اُن کے پیشے کی عادتوں کے واسطے لازمی تھا۔ اسی وجہ سے میں یہ دیکھ چکا ہوں کہ علوم و فنون نے بجائے سوسائٹی کو نفع پہنچانے کے اُن کی زود اعتقادی کو بڑھا کے علم کی ترقی کو روک دیا اور سوسائٹی کو ضرر پہنچایا۔ درحقیقت جھوٹ کو اتنا فروغ ہو گیا کہ کوئی بات ایسی نہ رہی تھی جسے لوگ ماننے پر تیار نہ تھے۔ لوگوں کے حریص اور زود عقیدہ کانوں تک کوئی بات ایسی نہ پہنچتی تھی جو دلنشین نہیں ہو جاتی تھی۔ فال اور شگون، عجائب المخلوقات، بھوت پریت، عجیب و غریب سعادت و نحوست آسمانوں میں بھاری بھرکم صورتیں، نہایت ہی عجیب اور بے سیاق ناممکنات کی باتیں داستانیں اور حکایتیں تھیں جو ایک مہینے سے نکلتی اور پھیلتی تھیں۔ ایک کتاب میں لکھی جاتی اور ہر کتاب میں نقل کی جاتی تھیں اور یہ سب احتیاط سے کیا جاتا تھا کہ جس سے یہ معلوم ہوتا کہ انسانی عقل و دانش کے وہ نہایت قیمتی خزانے تھے۔ یہ بات کہ یورپ اس تاریک حالت سے نکل آیا یہ نہایت قطعی ثبوت انسان کی غیر معمولی زور طبیعت کا ہے کیونکہ ہم سوسائٹی کی ایسی ایسی حالت کا تصور بھی نہیں کر سکتے جو اُس کی ترقی کے لئے اس سے زیادہ ناموافق ہو۔ لیکن یہ بدیہی بات ہے کہ جس وقت تک آزادی حاصل ہو نہیں چکی ہے اُس وقت تک خیالات کی سریع الاعتقادی اور بے ربطی

انسان تحقیق و جستجو کے عادی ہونے کے قابل نہ تھے اور ان کے واسطے ناممکن ہو گیا تھا کہ گزشتہ معاملات کو بکامیابی مطالعہ کر سکیں یا اپنے گرد و پیش کے واقعات کو صحت کے ساتھ لکھ ہی ڈالیں۔

پس اگر ہم اُن واقعات کی طرف رجوع کریں جو ابھی مذکور ہوئے ہیں تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ چند حالات کو (جو بالکل ادنیٰ درجہ کے ہیں) چھوڑنے کے بعد تین سربرآوردہ سبب ازمنہ متوسطہ میں تاریخ یورپ کی ابتری کے تھے۔ پہلا سبب فن تحریر و کتابت کا یکایک رواج پانا اور ایسے مختلف مقامی رواج کا خلط ملط ہو جانا کہ جو علیحدہ علیحدہ رہتیں تو صحیح رہتیں اور ملا دی گئیں تو غلط سلط ہو گئیں۔ دوسرا سبب مذہب کا تبادلہ تھا جس نے دو صورتوں سے اپنا عمل کیا یعنی نہ صرف روایات قدیمہ کے سلسلہ میں خلل ڈالا بلکہ اُن میں دخل در معقولات بھی کر دیا۔ اور تیسرا سبب جو غالباً سب سے بڑھ کے زبردست تھا یہ تھا کہ تاریخ کا ایسی جماعت کے آدمیوں نے اجارہ لے لیا جن کے پیشے کی عادتوں نے اُنھیں سریع الاعتقاد بنا دیا تھا جس کے بڑھنے میں وہ اپنا بھلا سمجھتے تھے کیونکہ یہی بنیاد تھی جس پر خود اُن کا اقتدار قایم تھا۔

ان اسباب کے عمل سے یورپ کی تاریخ ایسی گندی ہو گئی کہ اُس کی کوئی نظیر کسی اور عہد میں نہیں ملتی۔ یہ کہنا کہ اُس وقت تاریخ کا وجود ہی نہ تھا یہ ایسی بات ہے جو سب سے کم مکلف ہے۔ لیکن مصیبت تو یہ تھی کہ چونکہ لوگ سچ واقعات کے موجود نہ ہونے سے غیر مطمئن تھے اُنھوں نے اُس کی جگہ جھوٹ کے طومار باندھ کے پوری کی۔ اس کی متعدد مثالوں میں ان طبعزاد باتوں کا ایک سلسلہ ایسا تھا جو قابل لحاظ ہے کیونکہ اُس سے قدامت پرستی کا وہ شوق ظاہر ہوتا ہے جو اُن لوگوں کی خصوصیات طبع میں تھا جو تاریخیں تالیف کرتے تھے۔ میرا مطلب اُن موضوع قصص سے ہے جو مختلف قوموں کے مبدا و ماخذ کے بارہ میں ہیں جن میں سے ہر ایک میں وہی قرون متوسطہ کا رنگ جھلک رہا ہے۔ کئی سو برس تک ہر قوم یہ سمجھتی تھی کہ وہ بلا واسطہ ایسے مورثوں کی اولاد ہے جو محاصرہ ٹرائے میں شریک

تھے۔ یہ ایسا مسئلہ تھا جس میں شک وشبہ کا کسی کو خیال نہ تھا۔ جو کچھ چون وچرا تھی اس
مشہور ومعروف سلسلہ نسبی کی تفصیل میں تھی۔ بہرکیف اصل معاملہ میں ایک طور پر سبھی
متفق آرا تھے کیونکہ ادنیٰ درجہ کے ملکوں کا کون ذکر کرے جبکہ یہ مُسلّم تھا کہ اہلِ فرانس
اولاد تھی فرانکس کی جسے ہر شخص جانتا تھا کہ وہ ہکڑ کا بیٹا تھا اور یہ بھی معلوم تھا کہ برطانیہ
والے بروٹس کی نسل سے تھے جس کا باپ اینیَس تھا۔

مختلف مقامات کی اصل وبنیاد کے بارہ میں بھی قرون متوسطہ کے بڑے بڑے مؤرخ
بہت فیاض ہیں۔ اُنھوں نے اُن مقامات کے جو حالات بیان کئے ہیں اُن میں اور نیز جن
مشاہیر کی سوانح عمریاں اُنھوں نے لکھی ہیں اُن میں بھی تاریخ کا سلسلہ ایک نہایت ہی قدیم
زمانہ سے شروع ہوتا ہے اور جس مبحث پر وہ قلم اُٹھاتے ہیں اُس کے متعلق جو واقعات ہیں
وہ اکثر اوقات ایک غیر منقطع سلسلہ کے ساتھ اُس وقت سے شروع ہوتے ہیں جب حضرت
نوحؑ نے کشتی سے زمین پر قدم رکھا تھا یا بلکہ جب حضرت آدمؑ بہشت کے دروازہ سے باہر
نکلے تھے۔ اور موقعوں پر جس قدیم زمانہ سے وہ واقعات کو وابستہ کرتے ہیں وہ کسی قدر
کم بعید ہوتا ہے لیکن اُن کی معلومات کے حروف ہمیشہ غیر معمولی ہوتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں
کہ فرانس کا دارالسلطنت پیرس خلف پرایم کے نام سے منسوب ہے کیونکہ جب ٹرائے برباد
ہوچکا تب وہ وہاں سے بھاگ کے یہیں آیا تھا۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ٹورس کا نام اس
وجہ سے ٹورس رکھا گیا کہ وہ ٹورونس کا مدفن تھا کہ جو ٹروجنس میں سے تھا۔ پھر شہر ٹرائیں
کو ٹروجنس نے بسایا تھا جیسا کہ اُس کے نام کی ترکیب ہی سے معلوم ہوتا ہے۔ یہ بھی بہت
یقینی ہوگیا تھا کہ فورالمبرگ کا نام شہنشاہ فیرو کے نام پر رکھا گیا تھا۔ اور جیروشلم کا نام
شاہ جیبس کے نام پر۔ یہ ایسا بادشاہ تھا جس کی شہرت قرون متوسطہ میں نہایت دُور تک
پھیلی ہوئی تھی لیکن بعد کے مؤرخین اُس کی وجود تک کی تصدیق نہیں کرسکے۔ دریائے
ہمبیر کا نام اس وجہ سے پڑا کہ اگلے وقتوں میں ہُنس قوم کا ایک بادشاہ اُس میں غرق

... لوگوں کا ماخذ (مبدء) بعضوں کے نزدیک کلیتھیا تھی (جو جیفٹ کی نسل سے تھی) اور بعضوں کے نزدیک گوم پسر جیفٹ۔ پروشیا کا نام پروس کے نام پر رکھا گیا جو آگسٹس کا ایک بھائی تھا۔ یہ عجیب بات ہی کہ یہ متاخرین میں تھا۔ لیکن سلیشیا کا نام الیشا پیغمبر کے نام سے نکلا جن کی نسل سے درحقیقت اہل سلیشیا پیدا ہوئے۔ پھر شہر ذُورِچ کے بارہ میں اُس کی واقعی تاریخِ بنا معرضِ بحث میں تھی لیکن بے شک وشبہ وہ حضرت ابراہیم کے عہد میں بنایا گیا تھا۔ اور اسی طرح حضرت ابراہیم اور حضرت سارہ کی نسل سے مصری خانہ بدوش پیدا ہوئے لیکن یہ نہیں بیان کیا گیا کہ کیونکر۔ لیکن غالباً یہ لوگ حضرت سارہ کی کسی اور شادی سے پیدا ہوئے ہوں گے یا ممکن ہے کہ کسی مصری تعلق سے وجود میں آئے ہوں بہرکیف۔ یہ یقینی ہے کہ اہل اسکاٹلینڈ مصر سے آئے کیونکہ اصل میں وہ سکوٹا کی نسل سے تھے جو فرعون کی ایک بیٹی تھی اور اُس نے اُن کو اپنا نام بخشا۔ اسی قسم کے اور متعدد امور میں قرونِ متوسطہ کو ایسی ہی قدر وقیمت کی معلومات حاصل تھی۔ ایسے لوگ بخوبی جانتے تھے کہ شہر نیپلس کی بنا انڈوں پر قایم کی گئی تھی اور نیز یہ کہ طبقہ سنٹ میکائیس کو بالذات مقرب الملکوت (حضرت جبریل) نے قایم کیا تھا اور وہی سب سے پہلے نائٹ (رئیس دلاور) تھے اور فی الحقیقت شجاعت کا وجود اُنھیں کے وجود باوجود سے ہوا ہے۔ تاتاریوں کی بابتہ یہ معلوم تھا کہ فی الحقیقت وہ لوگ تارتارس سے نکلے تھے جسے بعض اہلِ مذہب تو کہتے ہیں کہ وہ ادنیٰ قسم کی جہنم تھی اور بعض کہتے ہیں کہ وہ خود جہنم ہی تھی۔ خیر یہ چاہے جو کچھ بھی ہو یہ امر تو بے چون وچرا مسلّم تھا کہ اُن کا مولد تحت ارض میں تھا اور یہ بات بہت ایسے امور سے (کیفیات سے) ثابت تھی جو یہ ظاہر کرتے تھے کہ یہ کیسے زہریلے اور مخفی اثر ڈال سکتے تھے۔ چونکہ ترک مشابہ تھے تاتاریوں کے اور یہ بہت مشہور تھا کہ چونکہ صلیب ترکوں کے ہاتھ لگ گئی تھی اس وجہ سے کل عیسائی بچوں کی سابق کی نسبت دس دانت کم ہوتے تھے اور یہ ایسی عالمگیر مصیبت تھی جس کی تلافی کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔

گزشتہ واقعات کی تاریخ سے متعلق اور جو امور تھے وہ بھی ایسی ہی وضاحت سے صاف کر دیئے گئے تھے۔ یورپ میں کئی سو برس تک جس غذائے حیوانی کا بہت عام طور سے رواج تھا وہ سُور کا گوشت تھا کیونکہ بہ نسبت سُور کے گوشت کے گائے کا گوشت، حلوان کا گوشت بھیڑ کا گوشت گویا کوئی جانتا ہی نہ تھا اس وجہ سے یہ بالکل حیرت انگیز نہیں کہ صلیبوں نے مشرق سے واپس آکے اپنے اہل وطن سے یہ بیان کیا کہ اُن کا گزرا ایسے لوگوں میں ہوا تھا جو یہودیوں کی طرح سُور کو نجس سمجھتے اور اُس کے کھانے سے انکار کرتے تھے۔ لیکن جیسا سخت تحیر اس خبر سے ہوا تھا وہ اُس وقت فوراً دُور ہو گیا جب اس کا اصلی سبب اُن سے بیان کر دیا گیا۔ اس بحث کو میتھو پیرس نے اُٹھایا جو تیرھویں صدی کے نہایت مشاہیر مؤرخین میں اور قرون متوسطہ میں نہایت سربرآوردہ تھا۔ یہ مشہور مصنف ہم سے کہتا ہے کہ مسلمان اس وجہ سے سور کے گوشت کھانے سے انکار کرتے ہیں کہ اُن کے پیغمبر پر ایک عجیب حادثہ گزرا تھا (اس مقام پر ایک نہایت مہمل حکایت لکھی گئی ہے۔ جس میں رسول خدا صلعم کی شان میں سخت گستاخی کے الفاظ ہیں۔ حد ادب مانع ہے کہ اُس کا ترجمہ کیا جائے اور ایسی بیہودہ داستان سے کتاب کے مبحث کو کوئی تعلق بھی نہیں اس لئے قلم انداز کرتا ہوں ایک اور عجیب واقعہ مذہب اسلام کے وجود میں آنے کا یہ لکھا ہے کہ آنحضرت صلعم (جیسا کہ مشہور و معروف ہے) کارڈنل تھے (یہ عہدہ پوپ سے ایک درجہ کم ہوتا ہی) اور جب انھیں پوپ کا درجہ حاصل کرنے میں مایوسی ہوئی تو اُس وقت آنحضرت صلعم نے یہ نیا مذہب قایم کیا۔ نعوذ باللہ)۔

عیسائیت کی ابتدائی تاریخ کی بابتہ قرون متوسطہ کے بڑے بڑے مصنف خصوصیت کے ساتھ نہایت متجسس تھے اور وہ لوگ ایسے واقعات کی یاد تازہ رکھتے تھے جن بارہ میں اور صورت سے ہم بالکل بے خبر رہتے۔ پندرھویں صدی کے سب سے زیادہ نامور مؤرخ فروئسرٹ کے بعد میتھو ساکن ویسٹ منسٹر گزرا جس کے نام سے اکثر ناظرین آشنا ہوں گے۔ اس سربرآوردہ

شخص نے بجملہ دیگر امور کے اپنی توجہ یہوداہ کی تاریخ پر اس غرض سے مصروف کی کہ وہ حالات معلوم ہو جائیں جن میں اُس سرگروہ منکرین کی حقیقت و سیرت قایم ہوئی تھی۔ اُس کی تحقیق و کاوش بہت دُور تک پہنچی ہوئی معلوم ہوتی ہے لیکن اُس کا خاص نتیجہ یہ تھا کہ یہوداہ جب بچّہ تھا اُسی وقت اُس کے ماں باپ نے اُسے چھوڑ دیا اور ایسے جزیرہ میں ڈال دیا تھا جو اسکیریتھ (اسکریا) کہلاتا تھا اور اسی سے اُس کا نام یہوداہ اسکریوتی پڑ گیا اس پر مورخ یہ اضافہ کرتا ہے کہ جب یہوداہ جوان ہوا تو اُس نے اور بے اعتدالیوں کے ساتھ اپنے باپ کو قتل کر ڈالا اور اپنی ماں کے ساتھ شادی کر لی۔ یہی مؤرخ اپنی تاریخ کے ایک اور حصّہ میں ایک اور واقعہ ایسا بیان کرتا ہے جو اُن لوگوں کے واسطے دلچسپ ہے جو کلیسا کے قدیم حالات مطالعہ کرتے رہتے ہیں۔ پوپ کے پاؤں کے انگوٹھے پر بوسہ دینے کے وجوب کی بابتہ کچھ بحث پیدا ہوئی۔ اور دیندار لوگوں میں بھی ایسی عجیب تقریب کی بابتہ کچھ شکوک پیدا ہوئے۔ لیکن اس ہم کو بھی میتھو ساکن ویسٹ منسٹر نے سر کر دیا وہ اس دستور کے اصلی ماخذ کو بیان کرتا ہے اور کہتا ہے کہ پیشتر یہ دستور تھا کہ محتشم الیہ کے دست مبارک پر بوسہ دیا جاتا تھا لیکن آٹھویں صدی کے آخر زمانہ میں کسی بدراہ عورت نے حضرت کے دست مبارک پر نہ صرف بوسہ دیا بلکہ اُسے دبایا بھی۔ پوپ صاحب نے (جن کا نام نامی لیو تھا) اس خطرے کو دیکھ کے اپنا ہاتھ قلم کرا دیا اور اس طور سے اپنے آپ کو اُس نجاست سے بچا لیا جس میں وہ آلودہ ہو سکتے تھے۔ اُس وقت سے یہ احتیاط کی گئی کہ بجائے دست مبارک پر بوسہ دینے کے پوپ صاحب کی قدمبوسی کی جاتی ہے اور اس لئے کہ کہیں کوئی شخص اس بیان کی صحت و واقعیت پر شبہ نہ کرے مؤرخ صاحب ہم کو یہ یقین دلاتے ہیں کہ جو ہاتھ پانچ چھ سو برس ہوئے قلم کیا گیا تھا وہ اب تک رُوم میں موجود ہے اور حقیقت میں وہ ایک زندہ کرامت تھا کیونکہ وہ لیٹران میں پڑے گلنے سے محفوظ اور اپنی اصلی حالت پر باقی تھا اور جبکہ بعض ناظرین

خواہش ہوگی کہ اُنھیں خود لیٹران کی بابتہ آگہی بہم پہنچائی جائے جہاں وہ ہاتھ محفوظ رکھا تھا اس بات پر بھی مؤرخ نے اپنی عُمدہ کتاب کے ایک اور حصہ میں لحاظ کیا ہے کہ جہاں وہ اس مقام کا سلسلہ شہنشاہ نیرو تک پہنچاتا ہے۔ کیونکہ یہ کہا گیا ہے کہ اس بدکار غارت گر دین نے ایک بار قے کی تو مُنہ سے مینڈک نکلا جو خون سے لتھڑا ہوا تھا۔ اس کی بابتہ اُس نے یہی سمجھا کہ وہ اُس کا پیدا کیا ہوا ہے اور اس لئے اُس نے اُس کو ایک قبہ میں بند کر دیا جہاں وہ چند مدت تک رہا۔ اب چونکہ لاطینی زبان میں لیٹنٹ کے معنی میں مخفی اور رانا کہتے ہیں مینڈک کو اس لئے ان دو لفظوں کے ملانے سے ہم کو لیٹران کا ماخذ معلوم ہوتا ہے کہ جو درحقیقت اُس جگہ بنا تھا جہاں وہ مینڈک پایا گیا تھا۔

یہ بہت آسان بات ہوگی کہ ایسے ہی خیالات سے جلدیں کی جلدیں رنگ دی جائیں جن میں سے ہر ایک پرانُ ازمنہ مظلمہ میں نہایت راسخ عقیدہ جما ہوا تھا۔ درحقیقت وہ اہل دین کے لئے ایک عہد زریں تھا کیونکہ لوگوں کی عقیدتمندی ایسے بلند درجہ پر پہنچ گئی تھی کہ اُس کی بدولت اہل کلیسا کو مدّت دراز تک عالمگیر اقتدار کا اطمینان ہو گیا تھا۔ پھر بعد ازاں کلیسا کی ساری اُمیدوں پر کیوں کر پانی پھر گیا اور عقل انسانی نے کس طرح سرکشی کی اس کا بیان اس مقدمہ کے ایک اور حصّہ میں میں کروں گا جہاں میں یہ کوشش کروں گا کہ اُس دنیاوی اور تشکیک کی تحریک کے بڑھنے کا سُراغ لگا دوں جس کے سبب سے یورپ کے تمدن کی بنیاد پڑی ہے۔ لیکن قبل اس کے کہ باب ختم ہو یہ بہتر ہوگا اگر اور مثالیں اُن خیالات کی دیدی جائیں جو قرون متوسطہ میں دلنشیں تھے۔ اور اس غرض سے میں صرف دو تاریخی بیانات کو منتخب کروں گا جو سب سے زیادہ مطبوع و مقبول تھے جن کا بڑا اثر ہوا تھا اور جن پر عالمگیر عقیدہ تھا۔

جن تواریخ کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے وہ آرا تھر اور شارمین کے بارہ میں تھیں۔ ان دونوں کے مُصنّف کلیسا کے عہدہ داروں میں تھے اور یہ دونوں تاریخیں

کی بابتہ جو تاریخ تھی اُس کا نام تاریخ ٹرپن تھا اور اُس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ اُسے ٹرپن نامی ریمس کے آرچ بشپ نے لکھا تھا اور یہ شخص شہنشاہ کا مصاحب اور جنگ میں اُس کا رفیق تھا۔ اس کتاب کے چند فقروں سے یہ پتہ لگتا ہے کہ درحقیقت وہ بارھویں صدی کے آغاز میں تالیف کی گئی تھی لیکن قرون متوسطہ میں لوگ ان باتوں میں کچھ دخل نہ رکھتے تھے اور کوئی شخص ایسا نہ تھا جو اس کتاب کی صحت میں کچھ چون وچرا کرتا۔ درحقیقت ریمس کے آرچ بشپ کا نام ہی ایک کافی ضمانت تھا اور اسی وجہ سے ہم کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۱۱۲۲ء میں پوپ صاحب نے باضابطہ طور سے اُس کی بابتہ اپنی پسندیدگی ظاہر کردی اور یہ کہ ونسنٹ ڈی بیویس (جو تیرھویں صدی کا ایک نہایت نامور مصنف اور لوئی نہم کے بیٹوں کا اتالیق تھا) اُس کا تذکرہ اس طرح کرتا ہے جیسے وہ بڑی قیمتی کتاب ہے اور شارلمین کے عہد حکومت کے باب میں سب سے اعلیٰ سند ہے۔

ایک ایسی کتاب جو یوں عام طور سے پڑھی جاتی تھی اور جسے ایسے فاضل مصنفوں نے پسند کیا ہو نہایت عمدہ معیار اُس زمانہ کے آرا و معلومات کے جانچنے کے واسطے ہوگی۔ اور اسی بنیاد پر ہماری موجودہ مطلب کے لئے اُس کی مختصر دیکھ بھال مفید ہوگی کیونکہ اس سے ہم یہ سمجھ سکیں گے کہ کتنی انتہائی درجہ کی سستی سی تاریخ نے ترقی کی ہے اور کیسی قریب قریب غیر مرئی رفتار سے وہ آگے بڑھی ہے اور جب تک اٹھارھویں صدی میں بڑے بڑے اہل نظر نے اُس میں روح تازہ نہیں پھونکی اس میں کچھ ترقی نہ ہوئی۔

تاریخ ٹرپن میں ہم کو یہ بتایا گیا ہے کہ شارلمین نے جو اسپن پر حملہ کیا تھا وہ سینٹ جیمس برادر سنٹ جان کی براہ راست تحریک اور ایما سے کیا تھا۔ اور چونکہ یہی حواری صاحب اس حملہ کے بانی تھے اس لئے اُنھوں نے ایسی تدابیر کیں جن سے فتح نصیب ہو جب شارلمین نے پمپ لونا کا محاصرہ کیا تو اُس شہر نے جواب ترکی بہ ترکی دیا لیکن جیسے ہی محاصرین نے

نمازیں ادا کیں فوراہی (شہر پناہ کی) دیواریں زمین پر آرہیں۔ بعد ازاں شہنشاہ نے فی الفور کل ملک کا قلع قمع کر ڈالا مسلمانوں کو قریب قریب نیست نابود کر دیا اور بیشمار کلیسیا بنوا دیئے۔ لیکن شیطان کے ساز و سامان کبھی ختم نہیں ہوتے۔ اب غنیم کی جانب ایک پہلوان نظر آیا جس کا نام فیناکوٹ تھا اور وہ زمانہ قدیم کے گولیاتھ کی اولاد میں تھا۔ یہ فناکوٹ ایسا خطرناک حریف تھا کہ اس سے بڑھکے کسی خطرناک حریف سے کبھی عیسائیوں کا سابقہ نہیں پڑا۔ اُس میں چالیس آدمیوں کی برابر زور تھا۔ اُس کے چہرے کی پیمایش ایک ہاتھ تھی اور پاؤں اُس کے چوگنے لانبے تھے اور قد بلند کی کُل درازی بیس ہاتھ تھی۔ شارلمین نے اس کے مقابلہ کے لئے نہایت اعلیٰ درجہ کی نبرد آزما بھیجے لیکن پہلوان نے اُنھیں بآسانی شکست دیدی اس پہلوان کے بے اندازہ زور و قوت کا کچھ اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہی کہ اُس کی اُنگلیوں تک کی لمبائی تین تین بالشت تھی۔ عیسائیوں میں دہشت سما گئی۔ اُنھوں نے اُس کے مقابلہ کے لئے بیس چیدہ منتخب آدمی بھیجے مگر کچھ حاصل نہوا۔ اُن میں سے ایک بھی تو میدان سے جیتا نہ پھرا۔ فیناکوٹ نے اُن سب کو اپنی بغل میں دبا لیا اور لے جا کے قید کر دیا۔ آخر کار مشہور زمانہ آرلینڈو آگے بڑھا اور اُس نے پہلوان کو دعوت جنگ دی۔ دونوں میں سخت جنگ ہوئی اور جب عیسائی (آرلینڈو) نے دیکھا کہ جس فتح کی توقع تھی وہ حاصل نہ ہوئی تو وہ اپنے حریف سے مذہبی بحث کرنے لگا۔ اس بحث مباحثہ میں بُت پرست آسانی سے شکست کھا گیا اور آرلینڈو جو مباحثہ سے گرمایا تو اُس نے غنیم کو خوب دبایا اور تلوار سے حربہ کر کے اُسے ایک مُہلک زخم پہنچا دیا۔ اس کے بعد مسلمانوں کی آخری اُمید کا بھی خاتمہ ہو گیا انجام کار مسیحی ہتیاروں کو فتح نصیب ہوئی اور شارلمین نے اسپین کو اپنے اُن بہادر رُفقا میں تقسیم کر دیا جنھوں نے اس فتح کے حاصل کرنے میں اُس کی دستیاری کی تھی۔

آرتھر کی تاریخ کے بارہ میں بھی قرون متوسطہ میں ایسی ہی مستند واقفیت مُہیّا تھی

اس نامور بادشاہ کی بابتہ مختلف تذکرے شایع تھے۔ لیکن یہ بات طے نہیں ہوئی تھی کہ کون کس سے زیادہ قابل اعتبار ہے۔ حتیٰ کہ بارھویں صدی کے آغاز ہی میں اس معاملہ پر جافری کی توجہ مصروف ہوئی جو منماؤتھ کا آرچ ڈکن تھا۔ اس سربرآوردہ شخص نے ۱۱۴۷ء میں اپنی تحقیقات کے نتایج اپنی تصنیف "تاریخ برٹنس" میں شایع کئے۔ اس کتاب میں اُس نے پورے معاملہ پر جامعیت سے نظر ڈالی ہے۔ اور صرف آرتھر کی سوانح زندگی بیان نہیں کئے ہیں بلکہ اُن حالات واسباب کا بھی کھوج لگایا ہے جنھوں نے ایسے فاتح اعظم کے ظہور کے لئے راستہ صاف کیا۔ آرتھر کے کارنامجات کے بارہ میں یہ مورخ عجیب طور سے خوش قسمت تھا کیونکہ اُس کی کتاب کے اس حصہ کے واسطے والٹر آرچ ڈکن آکسفورڈ نے سامان جمع کر دیا تھا جو جافری کا ایک دوست تھا اور جسے اُس کی طرح تاریخ تاریخ کے مطالعہ میں بڑی ہی دلچسپی تھی۔ اسی لحاظ سے یہ کتاب دو آرچ ڈکن صاحبوں کی مشترک تالیف ہی اور نہ صرف اسی بنیاد پر بلکہ اس لئے کہ وہ قرون متوسطہ کی تمام تصنیفات میں سب سے بڑھکے مطبوع اور مقبول تھی وہ قابل وقعت ہی۔

اس کتاب کا ابتدائی حصہ اُن تحقیقاتوں کے نتایج میں صرف کیا گیا ہی جو آرچ ڈکن منماؤتھ نے آرتھر کی تخت نشینی سے پیشتر برطانیہ کی حالت کے بارہ میں کی تھیں ہم کو اس سے چنداں سروکار نہیں ہی۔ اگرچہ اتنا بیان کر دینا چاہیئے کہ آرچ ڈکن نے یہ تحقیق کیا تھا کہ ٹرائے کی قبضہ کے بعد اسکینیس شہر سے بھاگا اور اُس سے ایک لڑکا پیدا ہوا جو بروٹس کا باپ ہوا۔ ان دنوں میں انگلستان میں دیو بسے ہوئے تھے۔ اُن سب کو بروٹس نے قتل کر ڈالا اور کل قوم کو نیست و نابود کر کے بروٹس نے لنڈن کو تعمیر کیا۔ ملک کے معاملات طے کئے اور اپنے نام کے اوپر اُس کا نام برٹین رکھا۔ آرچ ڈکن اس کے بعد بادشاہوں کے اُس سلسلۂ طویل کا بیان کرتا ہی جو بروٹس کے جانشین ہوئے جن میں سے اکثر اپنے قابلیتوں کی وجہ سے اور جن میں سے بعض اُن عجائب و غرائب واقعات کے

سبب ممتاز تھے جو اُن کے عہد میں واقع ہوئے تھے۔ مثلاً ریوالو کے عہد میں تین دن تک متواتر خون کی بارش ہوا کی اور جب مرویدا س تخت حکومت پر متمکن تھا اُس وقت سواحل ایک مہیب سمندری دیو منڈلایا کرتا تھا جس نے بیشمار آدمیوں کو کھا کے آخر کار خود بادشاہ کو بھی نگل لیا۔

یہ اور اسی قسم کے امور کو آرچ ڈکن مناؤتھ نے خود اپنے نتایج تحقیقات کے طور پر بیان کیا ہے۔ لیکن اس کے بعد کے واقعات متعلقہ آرتھر میں اُس کی دستیاری اُس کے دوست آرچ ڈکن آکسفورڈ نے کی تھی۔ دونوں آرچ ڈکن صاحبان اپنے ناظرین کو اطلاع دیتے ہیں کہ شاہ آرتھر کا وجود مرلن مشہور جادوگر کی افسوں گری سے ظہور پذیر ہوا تھا اور اس واقعہ کے حالات دونوں مؤرخ اس تفصیل سے بیان کرتے ہیں جو دونوں کی تقدس مآبی کے لحاظ سے بہت حیرت انگیز معلوم ہوتے ہیں۔ آرتھر نے بعد کو جو کام کیے اُنھوں نے بھی اُس کے مافوق الفطرۃ ولادت کی تکذیب و تردید نہیں کی۔ اُس کا زور وطنطنہ اس قدر تھا کہ کوئی اُس کی بات کو ٹال نہیں سکتا تھا۔ اُس نے سیکسنوں کو بہ تعداد کثیر قتل کیا وہ ناروے پر چڑھ دوڑا۔ اُس نے گال پر یورش کی۔ پیرس کو اپنا دارالسلطنت قرار دیا۔ اور کل یورپ کی فتح و تسخیر کے لئے تیاریاں کیں۔ اُس نے دو دیووں کو الگ الگ لڑائی میں مصروف کیا اور دونوں کو مارا۔ ان میں سے ایک دیو جو کوہ سنٹ میکائیل پر رہتا تھا ایسا زبردست تھا کہ اُس کی وہ دھاک ہمارے ملک میں بندھی ہوئی تھی۔ اور اُس کے مقابلہ میں جتنے سپاہی بھی گئے اُن سب کو موت کے گھاٹ اُتارا البتہ وہ بچ رہے جن کو زندہ کھانے کے غرض سے اسیر کر لیا۔ لیکن یہ شخص بھی آرتھر کی دلیری کا شکار ہوا۔ یہی حال ایک اور دیو مسمی ریتھو کا ہوا کہ اُس سے بھی بڑھکے خوفناک اور سفاک تھا۔ کیونکہ ریتھو نے ادنیٰ درجہ کے آدمیوں سے لڑنے پر قناعت نہ کر کے حقیقت میں اپنا لباس ایسا بنایا جو بالکل اُن بادشاہوں کی داڑھیوں سے بنا تھا جنھیں اُس نے ہلاک کیا تھا۔

اسی قسم کے بیانات تھے جو تاریخ کے نام سے بارھویں صدی میں دنیا کے روبرو پیش کیے جاتے تھے۔ اور یہ محض گوشہ گمنامی میں پڑے ہوئے مصنفین نہیں کرتے تھے بلکہ کلیسا کے بڑے اعلیٰ درجہ والے لوگ کرتے تھے۔ پھر کوئی ایسا دقیقہ نہیں اُٹھا رکھا جاتا تھا جس سے تصنیف کی کامیابی میں دھبہ لگتا۔ اُس کے گواہ آرچ ڈکن منماؤتھ اور آرچ ڈکن آکسفورڈ تھے۔ وہ رابرٹ ارل اف گلوسٹر پسر ہنری اول کے نام معنون کی گئی تھی اور قومی خزانۂ علمی میں یہ ایسا اہم اضافہ خیال کیا جاتا تھا کہ اُس کے خاص مصنف کا درجہ آسقف کے عہدہ اُسقف (بشپ) تک بلند کر دیا گیا تھا۔ اور کہا یہ جاتا ہے کہ اُن کی یہ قدر افزائی اس وجہ سے کی گئی تھی کہ اُنھوں نے تاریخ انگلستان کے دفتر پارینہ کی تحقیق میں کامیابی حاصل کی تھی۔ وہ کتاب جس پر پسندیدگی کی جتنی مہریں لگسکتی لگی تھیں غالباً یہ اُس عہد کی اچھی معیار ہے۔ درحقیقت اُس کی قبولیت ایسی عالمگیر تھی کہ کئی سو برس کی مدت میں دو تین سے زیادہ موقع ایسے نہیں ہیں جن میں کسی نکتہ چین نے اُس کی صحت و واقعیت میں کچھ شک و شبہ کیا ہو۔ اس کتاب کا ایک خلاصہ لاطینی زبان میں مشہور و معروف مؤرخ الفریڈ آف بیورلی نے شایع کیا اور اس لئے کہ اُس کا زیادہ عام طور سے چرچا ہو جائے اس کا ایک ترجمہ انگریزی میں لیامن نے اور اینگلو نارمن زبان میں پہلے گیمر نے پھر ویس نے شائع کیا۔ یہ سب بڑے سرگرم اور پُرجوش لوگ تھے جنھیں اس کی دُھن تھی کہ اُس کتاب میں جو اہم حقایق تھے وہ اس قدر وسعت کے ساتھ شائع کئے جائیں جس قدر اُس وقت کے حالات میں ممکن تھا۔

مشکل سے اس کی ضرورت ہوگی کہ میں کوئی مزید شہادت اس بارہ میں پیش کروں کہ کس طرح سے قرون متوسطہ میں تاریخ لکھی گئی تھی کیونکہ مندرجۂ بالا نمونے معمولی کتابوں سے انتخاب نہیں کئے گئے بلکہ قابل ترین اور مشہور ترین مصنفوں کی تصنیفات سے لئے گئے ہیں اور جو اُس وقت کے یورپ کے علم و فضل کے لحاظ سے بہت مقبول اور اعلیٰ نمونے ہیں۔

چودھویں اور پندرھویں صدی میں پہلے پہل ایک انقلاب کی کچھ علامتیں نظر آئیں لیکن یہ انقلاب سولھویں صدی کے خاتمہ بلکہ سترھویں صدی کی آغاز سے پیشتر بہت نمایاں نہیں ہوا۔ اس دلچسپ تحریک کی خاص مدارج کا سُراغ میں اس مقدمہ کے اُس حصہ میں لگاؤنگا جس میں میں یہ ظاہر کروں گا کہ اگرچہ سترھویں صدی میں ایسی ترقی ہوئی تھی جس میں چون وچرا کا محل نہیں لیکن اس کی کوشش تقریباً اٹھارھویں صدی کے وسط سے پیشتر نہیں کی گئی تھی کہ تاریخ پر ایک بسیط اور جامع نظر ڈالی جائے۔ البتہ اس زمانہ میں (وسط اٹھارھویں صدی میں) اس بحث کا پہلے تو اعلیٰ درجہ کے فرانسیسی مبصرین نے مطالعہ کیا۔ پھر دو ایک اہل اسکاٹلینڈ نے اور کئی برس بعد اہل جرمن نے جیسا کہ میں آگے چل کے دکھاؤنگا تاریخ کی اصلاح ودرستی اُن دیگر انقلابات عقلی سے وابستہ رہی ہے جو اُس سے مطابقت کھاتے تھے اور جو یورپ کے خاص خاص ملکوں کی معاشرتی تعلقات پر موثر تھے۔ لیکن بغیر اس کے کہ جو کچھ اس جلد کے دوسرے حصہ میں ہوگا اُس کی بابتہ کوئی پیشین گوئی کی جائے یہ کہنا کافی ہے کہ سولھویں صدی کے خاتمہ سے پیشتر صرف یہی نہ تھا کہ کوئی تاریخ لکھی نہیں گئی تھی بلکہ اُس وقت سوسائٹی کی حالت ایسی تھی کہ کوئی تاریخ لکھی جا سکتی ہی نہ تھی۔ یورپ کا علم اتنا تیار نہ تھا کہ وہ اُسی واقعات گزشتہ کے مطالعہ کے قابل بناتا۔ کیونکہ ہم کو یہ خیال نہیں کرنا چاہیئے کہ اگلے مورخین کی خامیاں صرف اس وجہ سے تھیں کہ اُن میں فطری قابلیتیں نہ تھیں۔ غالباً انسانوں کی اوسط عقل ہمیشہ ایک ہی رہتی ہے لیکن اُس پر سوسائٹی کا جو دباؤ پڑا کرتا ہے وہ برابر بدلتا رہتا ہے۔ پس اس لحاظ سے یہ صرف سوسائٹی کی عام حالت تھی جو اگلے زمانہ میں قابل ترین مصنفوں کو مجبور کرتی تھی کہ نہایت طفلانہ لغویات کو مان لیں جب تک وہ حالت نہیں بدلی تاریخ کا وجود محال تھا کیونکہ یہ ناممکن تھا کہ کوئی ایسا شخص ملے جو یہ جانتا ہو کہ کس بات کا بیان کرنا سب سے بڑھکے اہم ہے اور کس کا چھوڑ دینا اور کس کا تسلیم کرنا۔

انجام یہ تھا کہ جہاں کہیں تاریخ کا مطالعہ ایسے ممتاز قابلیت والے اشخاص جیسے میکالے
یا باڈن نے بھی کیا تو وہ بھی تاریخ کو اس سے زیادہ کارآمد نہ بنا سکے کہ پولیٹکل تصورات
اُس کے ذریعہ سے ادھر اُدھر پہنچائے جائیں۔ اور اُن کی کسی تصنیف میں ہم کوئی کوشش
ایسی استقرار کی نہیں پاتے ہیں جو اتنا وسیع ہوتا کہ کل آثار معاشرتی پر حاوی ہوتا۔ یہی رائے
کامنس پر بھی صادق آتی ہے جو اگرچہ میکالے سے درجہ میں کم تھا لیکن وہ بھی ایسا مبصر تھا
جس میں معمولی ذہانت نہ تھی اور فی الحقیقت اشخاص منفرد کی مَردُم شناسی میں اُسے بہت کم
تمیز ہے۔ لیکن یہ تو اُس کے اپنی فرزانگی کی بدولت تھا۔ درآنحالیکہ جس عہد میں وہ رہتا تھا
اُس نے اُس کو توہم پرست اور تاریخ کے اعلیٰ مقاصد کے واسطے نہایت کوتاہ نظر بنا دیا
تھا۔ اُس کی یہ کوتاہ نظری حیرت انگیز طور سے اُس کی اُس قطعی و کلی لاعلمی سے واضح ہوتی
ہے جو اُس نے اُس بڑی عقلی تحریک کی بابتہ ظاہر کی ہے جو خود اُس کے زمانہ میں قرون
متوسطہ کی جاگیرداری کا استیصال کر رہی تھی جس کی طرف اُس نے اشارہ تک بھی نہیں
کیا ہے اُس کی توجہ ہمہ تن چھوٹی چھوٹی پولیٹکل سازشوں پر مصروف پائی جاتی ہے اور
وہ خیال کرتا ہے کہ اُنھیں چیزوں کے بیان کرنے کا نام تاریخ ہے۔ پھر اُس کی توہم پرستی
کے باب میں اُس کی بہت سی مثالیں دینا فضول ہوگا کیونکہ پندرھویں صدی میں کوئی ایسا
شخص نہیں مل سکتا جس کا نفس عالمگیر زود اعتقادی سے کمزور نہ ہو گیا ہو۔ بہر نوع یہ کہا جا سکتا
ہے کہ اگرچہ ذاتی طور سے وہ مدبروں اور ملکی چال بازوں سے واقف تھا اور اس وجہ سے
اُسے یہ دیکھنے کا پورا موقع حاصل تھا کہ کیونکر محض اُن لوگوں کی ناقابلیت سے جو بڑے ہی ہونہار
کاموں کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہیں وہ کام برابر بگڑ جایا کرتے ہیں پھر بھی کل اہم مواقع پر وہ
اس قسم کی ناکامیوں کو اصلی اسباب پر محمول نہیں کرتا بلکہ خدا کی بالذات مداخلت پر
محمول کرتا ہے۔ پندرھویں صدی کا یہ رُجحان ایسا مُمدار اور ایسا اٹل تھا کہ یہ سر برآوردہ
واقف کار امور سیاست جو بڑا دنیادار تھا اور دنیاوی معاملات میں اچھی سمجھ رکھتا تھا

بڑی متانت سے یہ بیان کرتا ہے کہ لڑائیوں میں ہزیمت اس وجہ سے نہیں ہوتی کہ فوج کے پاس کافی سازوسامان نہیں نہ اس وجہ سے کہ لڑائی کا منصوبہ بُری طرح باندھا گیا اور نہ اس لئے کہ میر عساکر نالایق ہے بلکہ صرف اس لئے کہ رعایا یا اُن کا بادشاہ بداطوار ہے اور خدا کی یہ مرضی تھی کہ اُن کو سزا دی جائے۔ کیونکہ کامنس کا قول ہے کہ جنگ ایک بڑا راز ہوتی ہے اور چونکہ اُس سے خدا اپنی مشیّت پوری کرنا چاہتا ہے اس لئے وہ کبھی ایک فریق کو فتح دیتا ہے اور کبھی دوسرے فریق کو۔ پھر اسی طور سے سلطنت میں انقلابات بھی بالکل خدائی مرضی سے واقع ہوتے ہیں اور یہ صرف اُسی وقت واقع ہوتے ہیں جبکہ بادشاہ لوگ آسودہ و خوشحال ہو کے یہ بھول جاتے ہیں کہ اُن کی خوشحالی اور آسودگی اُنھیں کہاں سے نصیب ہوئی ہے۔

سیاسی معاملات کو مذہب کی ایک شاخ بنانے کی کوشش کرنا اُس عہد کی شیون مخصوصہ میں سے ہے۔ اور وہ اس وجہ سے اور بھی زیادہ دلچسپ ہیں کہ وہ ایسے شخص کی تصنیف ہیں جو بڑی قابلیت رکھتا تھا اور معاملات جمہوری کے تجربہ اُٹھاتے اُٹھاتے سن رسیدہ ہو گیا تھا۔ جب اس قسم کے خیالات ظاہر کئے جاتے تھے اور اُن کا ظاہر کرنے والا خانقاہ کا کوئی درویش نہیں ہوتا تھا بلکہ ایک ممتاز و سر برآوردہ مُدبّر ہوتا تھا جسے ملکی معاملات میں درخور حاصل ہوتا تھا تو ہم اسے بآسانی سمجھ سکتے ہیں کہ اُس وقت معمولی لوگوں کی عقل کی حالت کیا ہوگی یہ بالکل بدیہی بات ہے کہ اُن لوگوں سے اور کچھ توقع نہیں ہو سکتی تھی قبل اس کے کہ یورپ اُس توہم پرستی سے سر اُبھارے جس میں وہ ڈوبا ہوا تھا اور اُن سخت زنجیروں کو توڑ ڈالے جو اُس کے آیندہ ترقی کی مانع تھیں اُسے بہت سے ایسے مدارج طے کرنے تھے۔

لیکن اگرچہ بہت کچھ کرنا باقی تھا تاہم اس میں کوئی شک نہیں کہ ترقی کے آثار نمایاں تھے اور اُس وقت بھی جبکہ کامنس اپنی تصنیف میں مصروف تھا ایک بڑے اور تصفیہ کن انقلاب کے

آثار صفات ظاہر ہوتے ہیں۔ پھر بھی وہ نقش آثار ہے اس کے کہ جو قریب آرہی تھی اور اُس
مرنے کے بعد قریب سو برس کے گزرے ہوں گے کہ وہ ترقی اپنے کل نتائج میں عالم آشکارا
ہوگئی۔ کیونکہ اگرچہ پروٹسٹنٹ ریفارمیشن اِسی ترقی کا نتیجہ تھا لیکن وہ ایک مدت تک اُس کے
واسطے ناساز رہا کیونکہ اُس نے قابل ترین اشخاص کو ایسے مسائل کے بحث مباحثہ میں مصروف
کردیا جہاں تک انسانی عقل کی دسترس نہ تھی اور اُن کو ان معاملات میں مشغول کر کے
اُن کی توجہ ایسے امور سے پھیر دی جن میں اُن کی کوششیں تمدن کے عام اغراض کے واسطے
زیادہ موثر ہوتیں۔ اسی سے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ سولھویں صدی کے خاتمہ سے پیشتر اصلی کام
فی الحقیقت بہت کم ہوا جیسا ہم کو آگے کے اور بابوں میں معلوم ہوگا۔ انگلستان اور فرانس
میں مذہبی جوش فرو ہونے لگا اور اس دنیاوی اور خالص فلسفہ کے واسطے راستہ ہموار
ہوگیا جس کے بیکن اور ڈیکارٹس محض رہنما تھے اور ہرگز خالق نہ تھے۔ یہ دورہ سترھویں
صدی سے واسطہ رکھتا ہے اور اُسی وقت سے یورپ کے عقلی احیاء کی آغاز کو منسوب کرسکتے
ہیں اُسی طرح جیسے ہم اٹھارھویں صدی سے یورپ کے معاشرتی احیاء کے آغاز کو منسوب
کرسکتے ہیں۔ لیکن سولھویں صدی کے زیادہ بڑے حصہ میں زود اعتقادی پھر بھی عالمگیر تھی
کیونکہ اُس کا اثر نہ صرف ادنیٰ اور اجہل طبقوں تک محدود تھا بلکہ جو سب سے زیادہ تعلیم یافتہ
تھے اُن پر بھی تھا اس کی بابتہ بے شمار ثبوت پیش کئے جاسکتے ہیں۔ اگرچہ میں بنظر اختصار
صرف دو واقعات سے زیادہ نہ بیان کروں گا۔ یہ دو واقعات خصوصیت کے ساتھ
حالات متعلقہ کے لحاظ سے اور نیز اُس اثر کے لحاظ سے جو اُنھوں نے ایسے لوگوں پر ڈالا
تھا جس کی بابتہ ایسے دھوکوں میں پڑنے کا کم احتمال تھا عجیب ہیں۔

پندرھویں صدی کے خاتمہ اور سولھویں صدی کے آغاز میں اسٹافلر مشہور و معروف
ہیئت داں ٹوبنگن میں پروفیسر ریاضی تھا۔ اس سربرآوردہ شخص نے علم ہیئت کی
بڑی خدمتیں کیں اور وہ پہلا شخص تھا جس نے جولیس سیزر کی تقویم کی (جس کے مطابق اُس

زمانہ میں وقت کا شمار ہوتا تھا) غلطیوں کی اصلاح کی۔ لیکن اُس زمانہ کی ہوا سے نہ تو اُس کی قابلیتیں اُسے محفوظ رکھ سکیں نہ اُس کی علمیت ۱۵۲۴ء میں اُس نے چند دقیق حسابات کے نتائج پیش کیے جن میں وہ مدت تک مشغول رہا تھا اور جن کے ذریعہ سے اُس نے اس عجیب امر کو محقق کیا تھا کہ اُسی سال میں دنیا بھر طوفان سے غرقاب ہو جائے گی اس اعلان نے جو ایسے فاضل شخص نے کیا تھا اور جسے اُس نے نہایت ہی اطمینان اور وثوق سے شائع کیا تھا ایک عالمگیر تہلکہ مچا دیا۔ اس آنے والے واقعہ کے جزو بہت جلد شائع ہو گئے اور یورپ میں ایک ہلچل ڈال دی۔ جن لوگوں کے مکانات سمندر یا دریا کے کنارے یا قریب تھے اُنھوں نے پہلے طلاطم سے بچنے کے واسطے اُن مکانات کو چھوڑ دیا دیا۔ اوروں نے یہ سمجھکے کہ ان تدبیروں سے بہت غیر مستقل اور عارضی پناہ مل سکتی ہے اور زیادہ اہم تدابیر پر عمل کیا۔ یہ تجویز پیش کی گئی کہ بطور تدبیر ابتدائی کے شہنشاہ چارلس پنجم ایسے انسپکٹر مقرر کریں جو کل ملک کی پیمایش کریں اور اُن مقامات کا پتہ لگائیں جن پر غالباً آنے والا طوفان کم اثر ڈالے گا اور جہاں اماں مل سکے گی۔ شاہی سپہ سالار کی یہی مرضی تھی کہ یہ کیا جائے۔ وہ اُس وقت فلارنس میں مقیم تھا اور اُسی کی مرضی سے ایک کتاب تصنیف کی گئی جس میں یہی ترکیب سمجھائی گئی۔ لیکن ایسی اہتمام طلب تجویز پر عمل کرنے کے فرصت کسے تھی لوگ تو ایک انتشار میں مبتلا تھے۔ پھر چونکہ طوفان کی بلندی کی بابت یقین نہ تھا کہ کہاں تک پہنچے گی اس وجہ سے یہ کہنا ممکن نہ تھا کہ آیا سب سے زیادہ ارفع و بلند پہاڑوں کی چوٹی تک وہ پہنچے گا کہ نہ پہنچے گا۔ ان تجویزوں اور انھیں کی ایسی اور تدبیروں کی کھچڑی پکتی رہی اور وہ قیامت خیز دن قریب آگیا مگر ہنوز یہاں کوئی حکمت ایسی نہیں کی گئی تھی جو اس بلا کا سامنا کر سکتی۔ اُن متعدد تجویزوں کا بیان کرنے کے لئے جو پیش کی گئیں اور نامنظور ہوئیں ایک دفتر چاہیئے۔ بہرکیف ایک تجویز ایسی ہے جس پر اس لئے نظر ڈالنا چاہیئے کہ اُس کی نہایت گرمجوشی سے تکمیل کی گئی تھی نیز اس لحاظ سے بھی کہ

... معلوم ہوتی ہے۔ ایک دین دار صاحب بن نام زیو
تھا اور جو اُس زمانہ میں یونیورسٹی طولوس میں قوانین مذہبی کے پروفیسر تھے اُنھوں نے اپنی طبیعت پر بڑا زور دیا اور اس عالمگیر بلا کے دفعیہ کی مختلف تدابیر پر بہت کچھ دماغ سوزی صرف فرمائی۔ آخر کار اسی اُدھیڑ بُن میں اُن کے ذہن شریف میں یہ بات آہی گئی کہ اسی قسم کی آفت میں حضرت نوحؑ نے جس راہ کو اختیار کیا تھا اور جس میں وہ کامیاب ہوئے تھے اُنھیں کے قدم بقدم اُسی جادہ پر چلنا چاہیے۔ ہنوز یہ خیال دل میں پوری طرح آیا بھی نہ تھا کہ اُس پر عملدرآمد ہونے لگا۔ طولوس کے باشندوں نے اُن کا ہاتھ بٹایا اور ایک کشتی اس غرض سے تیار ہوگئی کہ نوع انسانی کا کوئی حصہ تو بچ رہے جو اپنی نسل بڑھائے اور جب پانی تھم جائے اور زمین پھر خشک ہوجائے تو دوبارہ اسے آباد کرے۔

اس ہنگامہ کے فرو ہو چکنے کے کوئی ستّر برس بعد ایک اور معاملہ ایسا پیش آیا جس نے یورپ کے ایک بڑے شہر میں نہایت نامور لوگوں کو بھی کچھ عرصہ تک مشغول رکھا۔ سولھویں صدی کے خاتمہ پر ایک افواہ یہ اُڑی کہ سلیشیا میں ایک لڑکا پیدا ہوا ہے جس کے کلّے (جبڑے) میں ایک طلائی دانت نکلا ہے اور اس افواہ پر بڑا ہنگامہ ہوا۔ جب اس افواہ کی تحقیق کی گئی تو بات بھی سچّی نکلی اور یہ ناممکن ہوگیا کہ اُس کا جمہور سے اخفا کیا جائے چنانچہ یہ کرشمہ جرمنی بھر میں زبان زدِ خاص و عام ہوگیا اور وہاں چونکہ لوگوں نے اسے ایک سرِّ قدرت اور کنزِ مخفی سمجھا اس لئے بہت کچھ ہیجان اس پر پیدا ہوا کہ اس کرشمۂ قدرت سے مُراد کیا ہے۔ سب سے پہلے اس کی اصلی غرض و غایت کو ڈاکٹر ہورسٹ نے کھولا سنہ ۱۵۹۵ء میں اس سرِ برآوردہ طبیب نے اپنے نتیجہ تحقیقات کو شائع کیا جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بچّے کی پیدائش کے وقت آفتاب کا قران برج حمل میں زحل سے تھا اور اس وجہ سے یہ واقعہ اگرچہ مافوق الفطرۃ ہے لیکن کسی طرح اندیشہ ناک نہیں ہے۔ طلائی دانت ایک عہدِ زرّیں کا پیش رو ہے جس میں شہنشاہ ترکوں کو قسطنطنیہ سے نکال باہر کرے گا اور

ایک ایسی سلطنت کی بنیاد قایم کریگا جو ہزاروں برس تک باقی رہے گی۔ اور ہورسٹ کہتا ہے کہ دانیال نے اپنے مشہور ومعروف باب ثانی میں جہاں طلائی سر والے مجسمہ کا ذکر کیا ہے اس کا اشارہ اسی طرف ہی۔

باب ہفتم

انگلستان کی اجمالی علمی تاریخ (تقریباً سنہ ۱۵۵۰ء سے سنہ ۱۸۰۰ء تک)

آج سے تین صدیاں پیشتر یعنی سولھویں صدی عیسوی میں ملک جس شدید جہالت کی تاریکی میں گھرا ہوا تھا، اس کا خاکہ ہم پچھلے باب میں کھینچ چکے ہیں۔ اُسے پڑھکر ہمارے معاصر ناظرین انگشت بدنداں ہو گئے ہوں گے انھیں اس کا یقین ہی نہ آتا ہوگا کہ آج سے تین ہی سو برس پیشتر ملک کی حالت استقدر ابتر اور جہالت بھی ایسی ہمہ گیر ہو سکتی ہے کہ عوام و خواص، جہلا و علما، بلکہ اپنے وقت کے اکابر و ممتاز ترین اشخاص تک بھی اس میں یکساں گرفتار ہوں، ہمارے معاصر ناظرین کی یہ بے اعتباری کسی ضعف روایت پر مبنی نہ ہو گی کیونکہ ہماری روایت کے معتبر ترین مآخذ اور مضبوط ترین اسناد موجود ہیں۔ تاہم اس تاریخی استناد کے باوجود بھی آج کل کے لوگوں کے لئے یہ تخیل ہی دشوار ہے کہ کسی زمانہ میں یہ مہملات و مزخرفات حقایق تاریخی کا درجہ رکھتے ہوں گے اور یورپ کے علوم و معارف کا مایۂ خمیر ہوں گے۔

لیکن درحقیقت کہ اس صورت حال پر حیرت و استعجاب کی مطلق وجہ نہیں بلکہ استعجاب اس وقت ہونا چاہیئے تھا، جب صورت حال اس سے مختلف ہوتی۔ اصل یہ ہے کہ اس زمانہ میں ہر شے اس ضعیف الاعتقادی کے رنگ میں ڈوبی ہوئی تھی! ایک تاریخ پر کیا موقوف ہے سائنس، مذہب، قانون، غرض علم و ادب کا ہر شعبہ اسی کے اثر میں محیط تھا۔ یہ خصوصیت اس زمانہ کے آب و ہوا میں سرایت کئے ہوئے تھی جس میں بوڑھے، بچے، عالم و جاہل سب کا نشو و نما ہو رہا تھا۔ بے شبہ کبھی کبھی مستثنیات عامہ کے طور پر ایک آدھ متشکک پیدا ہو جاتا تھا،

[illegible]

جو شاہراہ علم سے ہٹ کر معتقدات پر شک و شبہ ظاہر کرنے لگتا تھا کہ ۳۰-۲۰ فٹ کے لانبے جنات
دویزاد ہوتے ہیں، پردار اژدہے ہوتے ہیں لشکر کے لشکر ہوا میں اُڑتے چلے آتے ہیں
نجوم و جوتش، سحر و کہانت برحق ہیں۔ یا اگر کسی نے بہت سے بہت ترقی کی تو یہ کہنے لگا کہ بلا
امتیاز ہر زندیق اور ہر کاہنہ کو زندہ ڈبو دینا مناسب نہیں۔ اس قسم کی متشکّکین کا اول تو وجود
ہی شاذ تھا اور جو معدودے چند ہوتے بھی تو ان کی بابت یہ عام فتویٰ ہوتا تھا کہ یہ خود بین
و خود رائے اپنے کو اپنے اسلاف و اجداد سے زیادہ دانشمند سمجھنے والے خیالی منصوبہ باندھا
کرتے ہیں۔ اس سے زیادہ ان کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی تھی اور نہ وہ اپنا کوئی مستقل اثر
چھوڑ سکتے تھے۔ سوسائٹی کی اس زمانہ میں جو حالت تھی اس کے لحاظ سے اس کے سوا کچھ اور
ممکن ہی نہ تھا بلکہ سچ یہ ہے کہ ایسے اشخاص کی سب سے بڑی کامیابی یہی تھی کہ وہ اپنی زندگی
سلامتی کے ساتھ گزارے جائیں۔ کیونکہ سولھویں صدی کے آخر زمانہ سے پیشتر اس طرح کے
خیالات کا اظہار دفعتاً انسان جان پر کھیل ہی کے کر سکتا تھا۔

باینہمہ یہ ظاہر ہے کہ بغیر تشکیک و ارتیاب کے ترقی ممکن ہی نہ تھی۔ کیونکہ جیسا صفحات گزشتہ میں
بہ وضاحت ثابت ہو چکا ہے ترقی تمدن کا دارمدار اضافہ و اشاعت علم پر ہے اور علم پر اضافہ
اس وقت تک ہو ہی نہیں سکتا جب تک شوق و جستجو و تحقیقات نہ ہو اور یہ صرف اس صورت
میں ممکن ہے جب انسان اپنے موجودہ معلومات و معتقدات پر قناعت و اطمینان کامل چھوڑ دے
اور یہ سمجھنے لگے کہ اس میں اضافہ و ترمیم کی گنجائش ممکن ہے۔ اس بنا پر ہم یہ کلیہ قایم کر سکتے
ہیں کہ ترقی تمدن کا مقدمہ اضافہ علوم ہے۔ اور اضافہ علوم کا پیش خیمہ شوق و تحقیقات ہے
اور اس کا زینہ تشکیک و ارتیاب ہے۔ علم کوئی جامد شے نہیں کہ یک بیک ذہن انسانی پر
القا ہو جائے اس کے حصول کے لئے سخت سے سخت جفاکشی اور سخت سے سخت ایثار کی
ضرورت ہے اور ظاہر ہے کہ جو لوگ اپنی موجودہ حالت پر بالکل قانع، مطمئن و مسرور ہیں وہ
کیوں اسے گوارا کریں گے۔ جو آنکھیں تاریکی کا احساس ہی نہیں رکھتیں وہ کیوں روشنی کی تلاش

کریں گی؟ پس اپنی جہالت کا احساس اپنی موجودہ حالت سے بے اطمینانی، علمی ترقیوں اور انکشافات کا ابتدائی زینہ ہے اور تشکیک اس کی اصل الاصول ہے۔

یہیں سے یہ مسئلہ بھی حل ہوجاتا ہے کہ جہلا تشکیک کے نام سے لرزتے کیوں ہیں؟ تشکیک اُن سے علمی قناعت واطمینان سلب کرلیتی ہے۔ توہمات وباطل پرستوں کے سہارے سے انھیں محروم کردیتی ہے اور انھیں تقلید کی پُرامن راہ سے ہٹاکر تلاش وتحقیق کی محنتوں میں پھنساتی ہے پھر بھلا ایسی تکلیف دِہ شے سے کیوں نہ دہشت معلوم ہو؟ حقیقت یہ ہے کہ پچھلی دو صدیوں میں جو کچھ بھی ترقی ہوئی ہے اُس کے لیے ہم اسی تشکیک کے ممنونِ احسان ہیں، یہ تشکیک ہی ہے جس نے علوم نظری وعلمی کے ہر صیغہ میں اصلاح کردی ہے۔ یہ تشکیک ہی ہے جس نے طبقات مخصوص کی غیر مسئولیت کو توڑ کر حریت کی بنیاد مضبوط کردی ہے یہ تشکیک ہی ہے جس نے سلاطین کی استبداد وامرا کی خودسری کو مٹادیا ہے اور ہاں۔ پھر یہ تشکیک ہی ہے جس نے کلیسا کی تعب پروری کو مدھم کردیا ہے۔ غرض یہ کہ عہد قدیم کی تین بڑی غلطیوں کا ازالہ بھی تشکیک کے واسطے سے ہوا ہے یعنی ایک تو سیاسی عقیدہ کی غلطی جس کی بنا پر خلقت تمام تر اپنے حکمران پر تکیہ کیے رہتی تھی۔ دوسرے علمی عقیدہ کی غلطی جس کے بنا پر زودیقینی وباطل پرستی عام تھی اور تیسرے مذہبی عقیدہ کی غلطی جس کی بنا پر رواداری مفقود تھی۔

اثرات تشکیک کے اس اجمالی بیان کو غالباً وہ اصحاب حیرت وبے اعتباری کی نظروں سے دیکھیں گے جو خود تفحص وتحقیق کے عادی نہیں ہیں۔ لیکن مسئلہ کی اہمیت اس کی متقاضی ہے کہ میں اس اجمالی پر اکتفا نہیں کروں گا بلکہ اس کلیہ کی صحت پر تمدن یورپ کی متعدد شکلوں سے تفصیلی استشہاد کروں گا۔ اور اس سے اس نتیجہ پر پہنچنا یقینی ہے کہ کسی قوم پر کوئی واحد شے اس قدر موثر نہیں ہوئی ہے جس قدر تشکیک کی مدت مقدار وتعمیم۔ اسپین میں کلیسا نے صیغہ احتساب کی مدد سے ہمیشہ تشکیک کی اشاعت کو محدود رکھا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں میں

تابع رہتی ہے حد درجہ سست رہی۔ برخلاف اس کے انگلستان و فرانس جو تشکیک کے مولد و منشا ہیں اور جہاں اس کی پوری تعمیم سے اشاعت ہوتی رہی علم و تحقیق کا شوق بھی روز افزوں ترقی کرتا رہا اور یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج یہ دونوں قومیں دنیائے تمدن کی سرتاج ہیں۔ جلد ہذا کے بقیہ صفحات میں مجھے یہی دکھانا ہے کہ ان دونوں ملکوں میں تشکیک ہر عہد میں کن گوناگوں صورتوں میں ظاہر ہوتی رہی اور قوم کو کن کن طریقوں پر متاثر کرتی رہی۔ ان دونوں میں بھی میں انگلستان کو فوق و فضیلت دیتا ہوں، کیونکہ جیسا پچھلے صفحات میں گزر چکا ہے، انگریزی تمدن باوجود متعدد خامیوں اور نقائص کے بہ مقابلہ فرانسیسی تمدن کے زیادہ اعتدال کی روش پر ہے اور اس کا نشو و نما زیادہ طبعی و غیر مصنوعی اسباب کی بنا پر ہوا ہے۔ تاہم چونکہ انگریزی تمدن کی بابت پوری تفصیلات اصل کتاب میں ملیں گی میں اس مقدمہ میں صرف اس مسئلہ کو چھیڑتا ہوں کہ تشکیک کی براہ راست ہماری قومی تاریخ پر کیا کیا اثرات ہوئے اور جو ضمنی و فرعی اسباب و موثرات نکل آئے اُن کا بیان کسی آیندہ موقع پر اُٹھائے رکھتا ہوں، پھر چونکہ مذہبی رواداری اس تحریک کا اہم ترین ثمرہ ہے اس لئے میں سب سے پہلے یہی دکھاؤں گا کہ سولھویں صدی کے انگلستان میں اس کی بنا کن اسباب سے پڑی اور اس کے بعد دیگر واقعات کا ذکر کروں گا جو اسی علت کے دوسرے معلول، اسی تخم کے دیگر ثمرات تھے۔

مذہبی رواداری کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر مسیحی ملک میں جہاں یہ پیدا ہوئی ازخود نہیں پیدا ہوئی بلکہ ہمیشہ دنیوی گروہوں نے اسے زبردستی اہل کلیسا میں پیدا کرایا۔ چنانچہ آج بھی جہاں دنیوی گروہ کو غلبہ نہیں حاصل ہے بلکہ اہل کلیسا بدستور برسرِ اقتدار ہیں، رواداری مفقود ہے اور یہ امر تو قیاس ہی سے خارج ہے کہ قدیم یورپ میں اس قدر دانشمندانہ و عادلانہ مسئلہ تک لوگوں کے دماغ کی رسائی ہو سکتی۔ لیکن ہوا یہ کہ جب ملکہ الزبتھ تخت نشین ہوئی تو اس نے دیکھا کہ ملک میں دو زبردست طاقتیں ایک

دو فرقے مقابلہ پر تلی ہوئی ہیں یعنی پروٹسٹنٹ و رومن کیتھولک۔ اس فرزانہ روزگار ملکہ نے بکمال ہوشمندی اپنا طرزِ عمل یہ دیکھا کہ ان دونوں قوتوں میں توازن پیدا کر دیا اور کسی کو زیادہ اُبھرنے نہ دیا۔ یہ ایک بالکل سیاسی حکمت عملی تھی مگر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مقتدایان مذہب کو مداخلت کا بالکل موقع نہ رہا اور اس دورِ توحش میں ایک غیر محسوس طور پر رواداری کے اصول پر عملدرآمد ہوتا رہا۔ بدقسمتی سے بعض اسباب کی بنا پر جن کی تفصیل حسب موقع آئے گی الزبتھ کو اپنے طرزِ عمل میں تغیر کرنا پڑا (اور اس میں کس کو شبہ ہو سکتا ہے کہ جس دماغی سطح پر اُس کے معاصرین تھے اُس کے لحاظ سے وہ ایک سخت خطرناک تجربہ کر رہی تھی)، اب پروٹسٹنٹوں کو اپنے حریفوں سے دل کھول کر پُرانے کینہ نکالنے کا موقع ملا لیکن اس تمام ہنگامہ آرائی و کشت و خون کے درمیان میں بھی یہ شے کس قدر قابل لحاظ ہے سبب قتال ہمیشہ سیاسی مصالح ہی ظاہر کیے گئے۔ اور گو واقعۃً ساری خونریزی مخالفت مذہبی ہی کی بنا پر ہوتی تھی تاہم زبان سے کسی کو یہ نکالنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی بلکہ کہا ہمیشہ یہی جاتا تھا کہ چونکہ رومن کیتھولک کے بعض معتقدات ملک و سلطنت کے لئے خطرناک ہیں اس لئے انھیں قتل کر دینا چاہیے۔ مذہبی رواداری کی تاریخ میں اس وقت سے نیا دور شروع ہوتا ہے یعنی اس وقت سے تعصب منافقت کی آڑ پکڑتا ہے اور مقتدایان کلیسا کو یہ کہنے کی ہمت نہیں ہوتی کہ ہم لوگوں کو عذاب اُخروی سے نجات دلانے کے لئے جبر و تعدی کو کام میں لاتے ہیں بلکہ اس کے بجائے یہ کہا جانے لگتا ہے کہ یہ تو صرف اس لئے ہے کہ ملک میں فتنہ و فساد و نقض امن نہ ہو۔ یہ درحقیقت بڑی اصلاح تھی۔ کیونکہ جب تعصب منافقت کے پردے میں ظاہر ہونے لگا تو صاف ظاہر ہے کہ اُس زمانہ نے خاصی ترقی کر لی تھی۔

اس تغیر کی ایک دلچسپ و مضبوط شہادت ہمیں دو انگریزی تصانیف میں ملتی ہے جو الزبتھ ہی کے زمانہ میں شائع ہوئیں۔ ایک پادری ہوکر کی کتاب (اکلیسیاٹیکل پالیٹی) ہے اس کا سال تصنیف ۱۵۹۴ء ہے۔ یہ اپنے زمانہ کی نہایت معرکۃ الآرا کتاب تھی اور انگریزی کلیسا میں

اس کی عظمت اب تک مسلم ہے۔ دوسری کتاب پادری جوئل کی (اپالوجی فار دی چرچ آف انگلینڈ) ہے جو اپنے زمانہ کی سب سے زیادہ مستند و مقبول کتاب تھی۔ اس کا زمانہ تصنیف ۱۵۶۲ء ہے دونوں مصنفین اپنے زمانہ کے مستند و زبردست عالم تھے دونوں کلیسائے انگلستان کے سچے خادم تھے دونوں نے اسی کی تائید میں لکھا ہے دونوں کے زمانہ میں بھی کچھ بہت زیادہ فرق نہیں یعنی کل ۳۰ سال کا ہے لیکن باوجود اس شخصی مماثلت و مشابہت اور زمانی اتصال کے دونوں کے طریق استدلال میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اس ۳۰ سال کی مدت میں انگلستان کی دماغی سطح اس قدر بلند ہو گئی تھی کہ جو چیزیں جوئل کے وقت میں براہین قاطعہ کا حکم رکھتی تھیں وہ ہوکر کے زمانہ میں قابل اعتبار بھی نہیں رہیں جوئل کے زمانہ میں کسی مسئلہ کے ثبوت کے لئے یہ بالکل کافی تھا کہ آبائے کلیسا و مجالس کے اقوال و فتاویٰ نقل کر دیئے جائیں بہ خلاف اس کے ہوکر گو ذاتی طور پر وہ بھی آبائے کلیسا و مجالس کا ویسا ہی معتقد ہے مگر ان کے اقوال و فتاویٰ کو دلایل کا قایم مقام نہیں قرار دیتا جوئل اعتقاد پر زور دیتا ہے ہوکر عقل کو مخاطب کرتا ہے اوّل الذکر قدما کے طریق عمل کو حجت قطعی قرار دیتا ہے آخر الذکر بھی ان کے طرز عمل کو پیش کرتا ہے لیکن محض نظیر و تمثیل کے لئے نہ بہ طور حجت و دلیل۔ جوئل انجیل و شارحین انجیل کے بڑے بڑے اقتباسات دے کر اپنی قوت حافظہ کا بار بار مظاہرہ کرتا ہے اور اسی کے بل پر سب کو اپنا ہم خیال بنانا چاہتا ہے۔ لیکن شیکسپیر و بیکن کے معاصر کا طرز استدلال اس سے بالکل مختلف ہے وہ قال سے نہیں بلکہ اقوال سے دلیل لاتا ہے۔ اس کا مناسب استدلال اقوال شارحین بلکہ آیات انجیل تک نہیں ہوتے وہ نظام کائنات سے حجت لاتا ہے اور یہ دکھاتا ہے کہ اس کے مخالف عقاید پر عملدرآمد سے فلاں فلاں تمدنی مصالح درہم وبرہم ہو جائیں گے۔ مثلاً ایک مسئلہ یہ ہے کہ فرماں روائے وقت کو دینی معاملات میں مداخلت کا حق حاصل ہے جوئل و ہوکر دونوں اسی مسئلہ کے حامی و موید ہیں لیکن جوئل اس کے ثبوت میں صرف موسیٰ، یوشع، داؤد، وسلیمان کے نظایر پیش کر دینا کافی سمجھتا ہے۔ بہ خلاف اس کے

[illegible] واقعات پر اور عقلی منطق

پر مبنی ہے۔

ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ متکلمین کے دائرہ میں یہ تغیر کس قدر اہم تھا۔ جب تک کلام کی بنیاد محض اعتقاد پر تھی ظاہر ہے کہ اس میں کسی قسم کا شبہ وارد کرنا صاف اپنے اوپر الحاد و زندقہ کا فتویٰ صادر کرنا ہے۔ اعتقاد اور ایمان بالغیب تو ایسی شے ہے کہ اس میں کسی چون وچرا کی گنجائش ہی نہیں نکل سکتی۔ البتہ جب کلام کی بنیاد عقل پر آٹھیری تو ظاہر ہے کہ عقلیں متفاوت ہوتی ہیں اور ہر جماعت اپنے موافق کچھ نہ کچھ عقلی دلائل پیش ہی کر سکتی ہے اور کوئی شخص بغیر فریق ثانی کے دلائل کو سنے ہوئے یہ قطعی طور پر نہیں کہہ سکتا کہ اس کے دلائل ناقابل انکار ہیں۔ سب سے بڑا اثر اس کا مذہبی احتساب و تعدی پر پڑا۔ جس وقت تک کوئی مذہبی فریق اپنے تئیں بالکل قطعی وغیر مشتبہ طور پر برسرِ حق سمجھتا ہے وہ یقین کامل رکھتا ہے کہ فریق مخالف قطعاً عذاب جہنم میں گرفتار ہوں گے اور اس لئے وہ انتہائی خلوص و ہمدردی سمجھتا ہے کہ انھیں بہ جبر اپنا ہم عقیدہ بنائے اور اس جبر و تشدد میں اگر انھیں قتل بھی کر دینا پڑے تو یہ کوئی شقاوت نہیں بلکہ در اصل اُن کے فوائد اُخروی کے لحاظ سے گویا اُن کے ساتھ ہمدردی و دوستی کرنا ہے بہ خلاف اس کے جب سے عقل پرستی کا دور دورہ ہوتا ہے "پائے استدلال کا چوبین ویے تمکین" ہونا ہر شخص کو نظر آنے لگتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگوں میں لامحالہ تحمل و رواداری پیدا ہو جاتی ہے اور ہر شخص یہ سمجھنے لگتا ہے کہ خود اسی کے برسر غلط ہونے کا کم از کم احتمال تو جائز ہے اور اسی لئے اب جبر و تشدد ایک سنگین جرم نظر آنے لگتا ہے۔ چنانچہ سترھویں صدی سے انگلستان میں یہی دور شروع ہوتا ہے۔ ہوبز کی تصنیف سے ۱۷ سال بعد (یعنی ۱۶۱۱ء میں) انگریزی پادریوں نے صرف دو شخصوں کو الحاد و زندقہ کے جرم میں زندہ جلایا لیکن یہ مذہبی جبر و تعدی کی آخری تاریخ تھی وہ گھڑی اور آج کا دن کہ انگلستان کی سرزمین محض مخالفت مذہبی کی بنا پر کسی انسانی ہستی کے خون سے ناپاک نہیں ہوئی۔

اس وقت تک ہم اس حقیقت سے بخوبی خبردار ہو چلے ہیں کہ تشکیک ہی جس طرح
واقعات طبعی کے دائرہ میں سائنس کے لئے سنگ بنیاد ہے اسی طرح مذہب کے دائرہ میں رواداری
کا پیش خیمہ ہے بغیر اس کے نہ سائنس کی ابتدا ہو سکتی تھی اور نہ رواداری کی۔ یہ میں اقوام کی
تمام حالت بیان کر رہا ہوں بعض مجتہد الفکر افراد بے شبہ انھیں ضعیف الاعتقاد قوموں میں
بھی ایسے پیدا ہو سکتے اور واقعۃً ہو جاتے ہیں جو تقلید کی بندشیں توڑ ڈالتے ہیں۔ لیکن یہ
مستثنیات ہیں قوم کی تمام حالت بدل نہیں سکتی تاوقتیکہ یہ تشکیک نہ پیدا ہولے۔ جب تک
انسان اس وہم میں گرفتار ہے کہ کسوف وخسوف اور دمدار ستاروں کا طلوع براہ راست
فرمان ایزدی کا معلول اور اس کے قہر کی علامت ہے اُن کے ذہن میں یہ بات آہی نہیں سکتی
کہ ان کے وقوع کے اوقات پیشتر سے معلوم کئے جائیں اور ان کے قوانین منضبط ہوں بالکل
اسی طرح جب تک عقل پرستی کا دور دورہ نہ ہو ذہن انسانی تنوع ادیان وتخالف مذاہب
پر تحمل کرنے سے قاصر ہے۔ جب تک ہمارے ذہن میں یہ عقیدہ جما ہوا ہے کہ راہ نجات بالکل
قطعی وغیر مشتبہ طور پر صرف ہماری ہے تو کیوں ہم دوسروں کو دوسری راہیں چلنے دیں
ایسی حالت میں ہمارا فرض ہے کہ ہم انھیں بہ جبر اپنے ہمراہ رکھیں۔

اگر اس زمانہ کی انگلستان کی دماغی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو اس تحریک عقلیت کے
مظاہر ہر شعبہ میں نظر آئیں گے۔ تحقیق، تنقید وتشکیک کی ہوا عام ہو گئی ہے اور ہر جگہ اس کی
جلوہ آرائیاں نظر آرہی تھیں۔ واقعات طبعی کے دائرہ میں اس تحریک نے پرانی بساط
دفعتہً الٹ دی اور بجائے تقلید وقیاس کے ذاتی تجربہ ومشاہدہ کی بنا پر مختلف اصناف
سائنس وجود میں آنے لگیں۔ سیاسیات میں حریت وآزادی کی ہوا چل گئی یہاں تک کہ
غدر وبغاوت کی نوبت آگئی اور بالآخر فرماں روائے وقت کو دار پر چڑھنا پڑا۔ اسی طرح
مذہب کے دائرہ میں بھی صدہا نئے فرقے قایم ہو گئے۔ اور ہر فرقہ اپنی حقانیت عقلی دلائل کی
بنا پر ثابت کرنے لگا۔ اس تغیر حال کی ایک بڑی دلچسپ مثال ایک مصنف چلنگورتھ کی

کتاب (ریجن آف پروٹسٹنس) میں ملتی ہے جس کی بابت اجماع ہے کہ کلیسیائی رومہ کی تردید اور کلیسیائی انگلستان کی تائید میں بہترین کتاب ہے۔ چلنگورتھ خود پہلے کیتھولک تھا اور حال ہی میں پروٹسٹنٹ ہوا تھا لہٰذا یہ بالکل قدرتی تھا کہ وہ اپنے سابق مذہب کے خلاف انتہائی تعصب و سب وشتم سے کام لے۔ پھر وہ آرچ بشپ لاڈ کا نہایت گہرا دوست تھا، جس کی تنگ نظری تعصب وسخافت مسلّم ہے۔ اور پھر سب سے بڑھکر یہ کہ وہ آکسفورڈ یونیورسٹی کا جو توہم پرستی و قدامت پسندی میں آج تک مشہور ہے ۔ وہاں قیام کرنے والا اور وہاں کا خاص کارکن تھا۔ ان تمام حالات کے لحاظ سے ہمیں اس کی تصنیف کی ایک ایک سطر تعصب و تشقف و تنگ خیالی سے لبریز نظر آنی چاہیئے تھی۔ لیکن ہماری یہ توقع عملاً صحیح نہیں ثابت ہوتی۔ وہی ملک جو صدیوں سے مقتدایان کلیسیا کے اقتدار کا شکار رہو رہا تھا اور وہی سرزمین جس پر آج کُل ۲۶ سال پیشتر دو شخصوں کو محض اس بنا پر علانیہ زندہ جلا دیا گیا تھا کہ وہ عقاید مروجہ کی رو سے بدعات کے مرتکب تھے آج اُسی ملک اُسی سرزمین میں یہ شخص پیدا ہوتا ہے جو پوری صفائی کے ساتھ ان قدیم و متبرک اصنام کی جڑ کاٹتا ہے۔

اس جلیل القدر تصنیف میں دینی حکومت کی سرے سے بیخکنی کر دی گئی ہے۔ بے شبہ اس سے قبل ہوکر نے بھی بجائے آبا کے عقل کے فیصلہ کو ناطق قرار دیا تاہم اس کا وہ بھی قایل رہا تھا کہ فیصلۂ ناطق کا حق عقول افراد کو نہیں بلکہ عقول مجالس کو حاصل ہے لیکن چلنگورتھ نے یہ قید بھی اُٹھا دی وہ بالکل غیر مقید و غیر مشروط طریقہ پر افراد کی عقل کو حاکم اعلیٰ قرار دیتا ہے وہ ہوکر کی طرح صرف آبا ہی کا نہیں بلکہ مجالس کے اقتدار کا بھی منکر ہے۔ اس کی کتاب بداہتہً علم کلام کی کتاب ہے جس میں ایک مخصوص فرقۂ مسیحیت کی حقانیت ثابت کی گئی ہے لیکن وہ اپنے سارے استدلالات میں کہیں قدما کے طرز عمل و فتویٰ سے استشہاد نہیں کرتا کہیں قرون اولیٰ کے مسیحوں کی نظیریں نہیں پیش کرتا اور کبھی انا وجدنا اباءنا سے دلیل نہیں لاتا۔ وہ تمامتر عقلی دلائل استعمال کرتا ہے اور صرف عقل کو اعمال و عقاید پر حاکم و متصرف قرار دیتا ہے

کوئی عقیدہ خواہ بجائے خود کتنا ہی صحیح ہو لیکن اگر کسی کے سمجھ میں نہیں آتا تو چلنگورتھ کے نزدیک اُسے اُس کے رد کر دینے کا پورا اختیار ہے۔ اور پھر ایمان بالغیب بھی اُس کے نزدیک ایک مہمل شے ہے۔ حق و باطل، کذب و صداق میں امتیاز کرنے کا حق صرف عقل کو حاصل ہے جس کی جانشینی ایمان و اعتقاد ہرگز نہیں کر سکتے اعتقاد ہم سے ایک شے آنکھ بند کر کے منوا لیتا ہے، برخلاف اس کے عقل اُسے ہمارے ذہن میں اُتار دیتی ہے عقل ایک نعمت عظمیٰ ہے اور جو شخص عقل کا قایم مقام اعتقاد کو بتاتا ہے، وہ عقل کا ناقدر شناس ہے اور کفران نعمت کا مرتکب ہوتا ہے۔

ان خیالات کی رو کس جانب تھی، اسے ہر شخص سمجھ سکتا ہے۔ لیکن اس سے زیادہ غور طلب ترقی تمدن میں ذہن انسانی کے تغیرات ہیں۔ اصلاح کلیسا کی تحریک نے لوگوں کے دلوں سے پادریوں کا تقدس و شان الوہیت ضرور گھٹا دی تھی، لیکن پادریوں کا ادب و احترام اب بھی قایم تھا۔ چنانچہ جویل گو حاکم ناطق صرف احکام انجیل کو قرار دیتا تھا، تاہم جہاں نص صریح نہ موجود ہو یا احکام موجود ہوں مگر ان کی تعبیر مشتبہ و مبہم ہو وہاں وہ تمام تر قدمائے شارحین و مفسرین کے اقوال سے سند پکڑتا تھا۔ ۳۰ سال کے بعد ہوکر پیدا ہوا، جس نے جویل سے قدم آگے بڑھایا، اور وہ ایسی بہت سی چیزیں کہہ گزرا جنھیں زبان پر لاتے جویل لرزتا تھا۔ ۲۶ سال اور گزرے اس کے بعد چلنگورتھ پیدا ہوا جس نے بقیہ پردے بھی اُٹھا دیئے اور صاف صاف عقلیت کے آگے گردن جھکا دی۔ گویا یہ تین دور تھے جن میں ہوکر ذہن انسانی اپنے موجودہ مرتبہ تک پہنچا ہے اور یہ ہر سہ اشخاص اپنے اپنے دور کے علمبردار ہوئے ہیں۔ جویل کے دور میں تقلید و اعتقاد بنیاد کا رہے اور عقل و اجتہاد بالائی عمارت ہے ہوکر کے دور میں یہ ترتیب اُلٹ جاتی ہے۔ عقل بمنزلہ بنیاد کار کے ہو جاتی ہے اور تقلید و اعتقاد بالائی عمارت کا کام دیتے ہیں۔ چلنگورتھ کے دور میں تقلید و اعتقاد کا سرے سے خاتمہ ہو جاتا ہے اور بنیاد و عمارت سب عقل ہی کی ہوتی ہے۔

چلنگورتھ کی یہ تصنیف اپنے معاصر عقلیت کی صرف شاہد ہی نہیں بلکہ اس کی پیدایش و اشاعت میں معین بھی ہوئی۔ اس نے کلیسیا کے جمود و تقشف کو شکست فاش دی اور مذہبی آزاد خیالیوں پر مُہر استناد لگا دی۔ اپنے زمانہ کے تمام مشاہیر مثلاً ہیلز، ٹیلر، آدین، برنٹ، ٹیلوٹسن، لاک، بلکہ ابن الوقت ہمپٹن تک کو اس نے متاثر کیا۔ اور مذہبی معاملات میں قربت فکری کا صور جو اس نے پھونکا اسکی آواز بازگشت ان سب کے صفحات سے آنے لگی لیکن اگر یہ اصول صحیح تسلیم کر لیا جائے کہ معتقدات کی فیصلہ کن صرف عقل ہی تو افراد کے تفاوت عقول کی بنا پر اس سے یہ لازم آتا ہے کہ انسان کے پاس کوئی قطعی و غیر مشتبہ معیار حقیقت شناسی نہیں یہ مسئلہ گو سخت یاس آفریں ہی اور ذاتی طور پر میں بھی اس کا قایل نہیں تاہم تحمل و رواداری کا یہ لازمی پیش خیمہ ہے۔ انسان جب تک اپنے اعتقاد کو تنقید و تنقیح سے ارفع سمجھتا ہے اُس کی نظر میں دوسروں کے عقاید قطعاً باطل و ہیچ رہتے ہیں اور وہ انھیں ہمیشہ ناحق پر سمجھکر ان کی بے وقعتی کرتا رہتا ہی۔ دوسروں کے عقاید کی اگر کچھ وقعت ہمیں اپنے ذہن میں پیدا کرنا ہے تو ہمارے لئے یہ سمجھنا لازمی ہے کہ خود ہمارے مقام میں بھی غلطی کا احتمال ہے یہی تشکیک ہی اور اسی کا وجود رواداری و تحمل کے لئے ناگزیر ہے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ رواداری عامہ کا یہ اصول اب بھی کسی ملک میں پوری طرح سرایت کر چکا ہی۔ میرے خیال میں یورپ کے کسی خطّہ میں یہ ابھی پوری طرح پر جاگزیں نہیں ہو سکا البتہ رفتہ رفتہ ہو رہا ہے۔ جس روز یہ تکمیل کو پہنچ جائے گا اُس روز بے شبہ ہم لوگوں کی وقعت کا اندازہ اُن کے عقاید کی بنا پر کرنا بالکل چھوڑ دیں گے بلکہ صرف ان کے کردار و طرز و عمل کی بنا پر کرنے لگیں گے اور خود عوام کسی عقیدہ کے اختیار یا ترک میں اپنا معیار اُسی قدر بلند و ممتاز رکھیں گے جتنا اب تک ہر دور کے صرف معدودے چند مشاہیر رجال رکھ سکے ہیں کائنات کی موجودہ رفتار اسی رُخ پر جاری ہے اور ترقی تمدن کا بھی اقتضا یہی ہے۔ تین صدیوں کی مدت کچھ بہت نہیں ہوتی، لیکن اتنی ہی مدت میں مذہب کی قدیم شدید گرفت

دیکھی ہو چکی ہے اور صرف یہی نہیں کہ آج اس کا مرتبہ نسبتہً پست ہو گیا ہے بلکہ ہر معرکہ میں اسے علم کے مقابلہ میں شکست نصیب ہوئی ہے اور آج اسے با دل ناخواستہ تمام بلند بانگ دعاوی سے دست بردار ہونا پڑا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہوئی ہے کہ موجودہ تمدن ومعاشرت کی پیچیدگیوں کے باعث ہر شخص کے مشاغل اتنے بڑھ گئے ہیں کہ لوگوں کو الٰہیات وکلام کے خشک و دوراز کار مباحث پر متوجہ ہونے کی فرصت نہیں رہی ہے۔

ایک طرف تو معاشری زندگی کے اس اُلجھاؤ اور مشغولیت نے لوگوں کی توجہ کو اس جانب سے ہٹا لیا ہے دوسری طرف سائنس کی ترقیاں بھی اس باب میں ایک بڑے حد تک معین ہوئی ہیں۔ مختلف اصناف سائنس کی روز افزوں مادی ومحسوس ترقیوں کا ایک خاص اثر یہ پڑا ہے کہ آج کل کے بہترین دماغ سائنس ہی کو اپنا مطمح نظر بنائے ہوئے ہیں وہ اعلیٰ دل و دماغ رکھنے والے جو آج سے چند صدیوں پیشتر الٰہیات وکلام کے محقق ہوتے اس وقت منطق، فلسفہ، ریاضی، طبعیات، کیمیائیات وغیرہ کے دائرہ میں داد تحقیق دے رہے ہیں اور مذہبی تحقیقات کا کام چھوٹے دماغ والوں کے سر آپڑا ہے۔ یہ لوگ خواہ شور و غُل برپا کرنے میں اپنے محترم پیشرووں سے کسی طرح کم نہ ہوں، لیکن ان کی قوت، ان کا فضل وکمال ہے اور ان کی وقت نظر کہاں سے لا سکتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ یہ تاریخ پر کوئی اثر نہیں چھوڑتے اور یہی سبب ہے کہ گو دوسرے علوم پر بہتر سے بہتر محققانہ تصانیف شایع ہو رہی ہے مذہب سے متعلق ہم کسی اعلیٰ تصنیف کا وجود نہیں پاتے۔ چنانچہ انگلستان کی بابت تو جہاں اس حیثیت سے تمدن کے اثرات دیگر ممالک سے زیادہ نمایاں ہیں یہ کامل وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ یہاں مذہب کے موضوع پر پوری ایک صدی سے کوئی مجتہدانہ تصنیف نہیں شائع ہوئی ہے اور یہ حقیقت تو بالکل منظر عام پر آگئی ہے کہ اب قوموں کے کاروبار و تعلقات پر مذہبی خیالات کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔

مذہبی تقشف وکورانہ تقلید کے زوال کے یہ شواہد آج ہر شخص کو بجز اُن لوگوں کے جن کی

چشم بصیرت پر ... نیم ... پردہ ڈال دیا ہے نظر آتے ہیں ان کی روز افزوں
ترقی کو دیکھکر مقتدایان کلیسا کی ایک بڑی جماعت (بعض افراد ذاتی خودغرضیوں کی بناء پر
مگر زیادہ تعداد نیک نیتی سے) اس سیلاب کو روکنا چاہتی ہے۔ لیکن ان نیک نیت اصحاب
کو جلد اپنی غلط فہمیوں پر مطلع ہونا چاہیئے۔ تشکیک جسے یہ روکنا چاہتے ہیں وہ توہم پرستی
اور رواداری کے درمیان کی ایک لازمی کڑی ہے۔ ممتاز دل و دماغ کے افراد کا ذکر
نہیں وہ تو مدت ہوئی اس منزل پر پہنچ چکے ہیں لیکن عام جمہور کے لئے اس راہ کو طے کرنا
ناگزیر ہے۔ جب تک یہ نہ طے ہولے گی نہ تقشف و تقلید و قدامت پرستیوں کی بندش
ڈھیلی ہوسکتی ہے اور نہ رواداری آسکتی ہے۔ اس لئے ہم سب پر فرض ہے کہ ہم
اس تحریک کو دبانے کے بجائے اسے اور تقویت دیں۔ رہیں وہ بعض خرابیاں جو
اشاعت تشکیک سے پیدا ہوں گی تو وہ عارضی ہیں اور اس وقت اُنھیں بہر طور انگیز ہی
کرنا چاہیئے۔ جس زور کا مد ہوگا ویسا ہی جزر بھی ہوگا۔ جتنی قوت عمل میں ہوگی اتنی ہی
ردعمل میں بھی ہوگی۔ اگر اب تک شدید مذہبیت تھی تو لازمی ہے کہ کچھ روز الحاد کی
بھی گرم بازاری رہے۔ یہ تو فطرت بشری میں داخل ہے۔ اس سے بچنے کی کوشش ہی
کرنا بیکار ہے رفتہ رفتہ کچھ روز کے بعد خود ہی توازن پیدا ہو جائے گا۔ سونے کو
جب تک آگ پر نہ ڈالئے گا اس کا کھوٹ کیونکر معلوم ہوگا اور اگر آگ کی گرمی سے ڈر
معلوم ہوتا ہے تو سونے کو الگ لئے بیٹھے رہیئے قیامت تک اس کی اصلی قیمت نہ معلوم
ہوگی۔ وہ غریب زائر جس کے سر پر توہمات او ضعیف الاعتقادیوں کا انبار لدا ہوا ہے
وہ اگر سکون و تحمل و رواداری کے شاندار شہر تک پہنچنا چاہتا ہے تو اُسے وادیٔ یاس
وصحرائے جمود و انکار کی منازل یقیناً طے کرنا ہوں گی۔

تشکیک و رواداری کی یہ مشترک تحریک سترھویں صدی بھر جاری رہی گو الزبیتھ کے
دو جانشین اس کی روک تھام کی برابر کوشش کرتے رہے اور ہر طریقہ پر اپنے پیشرو کی

دانشمندانہ حکمت عملی کی مخالفت کیا کیے۔ سمندر کی روانی کو بڑے سے بڑا مضبوط بند بھی نہیں روک سکتا۔ یہی حشر ان فرماں روایوں کی ناکام کوششوں کا بھی ہوا۔ پھر ایک بڑی مدد اس تحریک کو اُن مناقشات سے بھی ملی جو ملک میں کامل نصف صدی تک سرگرمی سے جاری رہے۔ الزبتھ کے زمانہ میں مذہب ہی کے دو گروہوں، یعنی قدامت پسندوں اور اہل بدعت کے درمیان جاری تھی۔ لیکن اب انگلستان کی تاریخ میں پہلی بار مذہبی غلو سیاسی جوش وخروش کے سامنے مغلوب ہوا، یعنی اب جو خونریز جنگ شروع ہوئی وہ تمامتر دو سیاسی گروہوں کے درمیان تھی۔ ایک پارٹی تاجدار کی حمایت میں تھی اور دوسری پارلیمنٹ کی مدافعت میں تھی۔ اب پہلی بار ایسا ہوا کہ خلقت کی توجہ الٰہیات ومناظرات مذہبی سے ہٹ کر سیاسی مقالات کی جانب مبذول ہوئی۔ اس کے علاوہ شاہ چارلس کے قتل نے بجائے خود اقتدار کلیسا پر ایک ضرب شدید لگائی۔ اور گو اس کا قتل جس شقاوت وسنگدلی سے ہوا تھا۔ اس نے تمام لوگوں کو پارلیمنٹ سے متنفر کر کے شاہ پسند بنا دیا تھا اور اس بنا پر بادشاہت دوبارہ بہت جلد قایم ہو گئی تاہم اس حقیقت کی اہمیت کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا کہ اس درمیانی مدت میں جو فریق برسرِ حکومت رہا اُس کی افراد اپنے تئیں احرار کہتے تھے اور اب فرماں روائی حزب الاحرار کے ہاتھ میں تھی، جو مذہب کے قدیم دستوروں اور رسموں کی سخت تحقیر کرتی تھی اور کلیسا کے بڑھے ہوئے اختیارات کی دشمن تھی۔ پھر دوبارہ انقلاب حکومت ہوا ہی یعنی بادشاہ پسندوں کو از سرِ نو تسلط حاصل ہوا ہے تو بھی اس سے یہ ہوا، جو اب عام ہو گئی تھی ذرا بھی نہ بدل سکی اور کلیسا کا اقتدار رفتہ پھر کسی طرح نہ عود کر سکا۔ خود شاہ چارلس دوم کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنے میلان طبعی وتن آسانی کی بنا پر مذہبی مباحث ومناظرات کی طرف سے پوری (اور اپنے نزدیک فلسفیانہ) بے اعتنائی برتتا تھا، اور اس کے تمام ارکان سلطنت اس باب میں اپنے "ظلِ سبحانی"

کی تقلید واجب سمجھتے تھے اس کے جو کچھ اثرات ہوئے وہ انگریزی لٹریچر جاننے والوں کی نظر سے مخفی نہیں مختصر یہ کہ وہ تشکیک و عقلیت جو احرار کے وقت میں ایک باوقار و سنجیدہ شے تھی، دربار کے مسخروں کے ہاتھ میں پڑ کر اپنی ساری متانت و عظمت کھو بیٹھی اور اب ایک بازیچۂ اطفال بن گئی، اوچھے درباریوں کا ظرف اس بار کا متحمل نہ ہو سکا اور نہایت دریدہ دہنی کے ساتھ ہر طرف سے انکار و الحاد کی صدائیں آنے لگیں۔ بغاوت کی ہوا عام ہو گئی اور حریت و لاحکومتی کے جلوے ہر سو نظر آنے لگے۔ بیکن کی فلسفیانہ حریت کرامول کے ہاتھوں سیاسیات کے میدان میں نمودار ہو چکی تھی اور اس دور میں مذہبی حیثیت سے چلنگورتھ، ہیلز، و آدین، فلسفیانہ حیثیت سے ہابس اور گلینول اور سیاسی حیثیت سے ہیرنگٹن، میڈنی اور لاک سب یہی بولی بولنے لگے۔

اب رفع توہمات میں انگریزی دماغ جو روز افزوں ترقی کر رہا تھا، اس کی بڑی تائید اس غیر معمولی شغف و انہماک سے بھی ہو گئی جو علوم طبعی سے لوگوں کو پیدا ہو چلا تھا اس نے شوق کی علت بھی اپنے مقدم واقعات میں ملتی ہے۔ تحقیق پسندی کا جو مادہ ساری ملک میں پیدا ہو گیا تھا، یہ اُسی کا نتیجہ تھا اور پھر کچھ روز اُس کی اشاعت و تقویت میں یہ اُس کا سبب بھی بن گیا۔ تعلیم یافتہ حلقوں میں قدیم روایات و معلومات کی طرف سے جو بے اعتباری و بے اطمینانی پھیل گئی تھی، اس کا تقاضا یہ ہوا کہ لوگوں میں خود بخود اب ہر شے کے سمجھنے اور دریافت کرنے کا شوق پیدا ہو گیا اور اسرار کائنات کی رازجوئی اپنے ذاتی تجربہ و مشاہدہ کی بنا پر نہ کہ تقلیدی روایات کے اعتماد پر ان کا نصب العین قرار پا گئی۔ اس تغیر خیال کی سب سے واضح مثال اس زمانہ کے ایک مشہور فاضل سر ٹامس بروان کی دو تصانیف میں ملتی ہے سنہ ۱۶۳۳ء کا ذکر ہے (اور یہ وہ زمانہ ہے کہ ابھی کلیسائے انگلستان اپنے اقتدار کے شباب پر ہے، لوگ محض اختلاف عقائد کی بنا پر مستوجب تعزیر ہو رہے ہیں اور تخت شاہی پر ایک ضعیف الاعتقاد فرماں روا متمکن ہے) کہ یہ مصنف ایک کتاب "طب دینی"

(Religio-medici) کے نام سے شائع کرتا ہے جو اول سے آخر تک رکیک اوقت توہمات وضعیف الاعتقادیوں کا مجموعہ ہے۔ پارس پتھر، دیو، جن وغیرہ کوئی شے ایسی نہیں جس کا یہ دقیق النظر عالم قایل نہو اور سحر پر تو اسے اس قدر پختہ اعتقاد ہی کہ جو لوگ اس کے منکر ہیں وہ اس کی نظر میں صرف کافر ہی نہیں بلکہ ملحد اور دہری ہیں۔ خود اپنے وجود کی بابت ارشاد فرماتے ہیں کہ میں جب وقت سے پیدا ہوا اپنی زندگی کا شمار نہیں کرتا ہوں بلکہ جس وقت سے میں نے اصطباغ لیا ہی اُس وقت سے اپنے تئیں موجود سمجھتا ہوں، کیونکہ بتپسمہ لینے سے پیشتر میں کیونکر اپنے تئیں موجود سمجھ سکتا ہوں، سب سے زیادہ حکیمانہ حضرت کی یہ تلقین ہے کہ "جو شے جتنی زیادہ بعید از قیاس ہوتی ہے میں اسی قدر زیادہ اُسے تسلیم کرنے کے لئے تیار رہتا ہوں اور جب کوئی شے قطعاً محال معلوم ہوتی ہے تو اُس کے اسی استحالہ کی بنا پر میں فوراً اس کا قایل ہو جاتا ہوں"۔

زمانہ کی نیرنگی اور انقلاب خیالات کی قوت دیکھو کہ یہی مصنف جب کل ۱۳ سال کی مدت کے بعد ۱۶۴۶ء میں اپنی دوسری تصنیف "تحقیق اغلاط عامہ" (Inquiries into Vulgur & Common Errors) کے عنوان سے شائع کرتا ہے تو اِن توہمات کی تائید کے بجائے خود ہی ان سب کی تردید و تغلیط کرتا ہے اور مشاہدہ و تجربہ کے صحیح اصول کی بنا پر بعض ایسے مسایل کی تعلیم کرتا ہے جن پر محققین حال بھی اضافہ نہیں کر سکتے ہیں۔ اِس تصنیف کے مطالعہ سے صاف یہ اثر پڑتا ہی کہ مصنف کا ذاتی علم و فضل اس کی پہلی اور دوسری دونوں تصانیف میں یکساں اور مشترک ہی لیکن رفع اوہام کی قوت اب زمانہ کے زبردست ہاتھوں نے اُس کے دل میں چارناچار پیدا کر دی ہے اور اب وہ جو کچھ لکھ رہا ہے وہ ایک آئینہ ہی جس میں معاصرانہ اصلاحی خیالات کا عکس نظر آرہا ہی، ورنہ بغیر اس توجہ کے یہ باور ہی نہیں آسکتا کہ یہ دونوں چیزیں ایک ہی دماغ کی پیداوار ہیں۔ اور یہ توجیہ ہم محض ایک تاویل کی حیثیت سے نہیں پیش کرتے بلکہ واقعہ نفس الامر بھی یہی ہے۔ کلیسا کی قوت و اقتدار اب ہمیشہ کے لئے

رخصت ہو چکی تھی، بادشاہ پرستی کا خاتمہ ہو چکا تھا اور ۱۲ سال کی مدت میں حریت نے معاشری وعلمی دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دیا تھا۔ اس حقیقت کی شہادت کوئی ایک چیز نہیں، بلکہ اس زمانہ کی خانگی مراسلت، لٹریچر، اور اعمال عام، غرض ہر شے دے رہی ہے اور یہ طاقت اس قدر زبردست تھی کہ بڑے سے بڑے ممتاز دماغ اس کا اثر قبول کئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ پھر اگر سرٹامس براؤن بھی زمانہ کی اس زبردست طاقت سے مغلوب ہو گئے تو تعجب نہ کرنا چاہیئے۔ البتہ اگر وہ اس طرح متاثر نہ ہوتے تو بے شبہ حیرت انگیز تھا۔ دریا کا بند جب ٹوٹتا ہے، تو پانی کس غضب کی تیزی اور زور سے رواں ہوتا ہے یہی حال خیالات کے سیلاب کا ہوتا ہے، جو لوگ اس کی بندش کرنا چاہتے ہیں اُنھیں کو وہ اپنی رو میں سب سے زیادہ پامال کرتا ہے۔ سرٹامس براؤن اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں رہ سکتے تھے اپنی پہلی کتاب میں انھوں نے جو داد وہم ستی دی ہے اس کا جلوہ ابھی گزر چکا ہے اب اس دوسری تصنیف میں ردّعمل نے جو اثر دکھایا اس کا نمونہ بھی ملاحظہ ہو کہتے ہیں کہ ”حقیقت شناسی صرف ان دوستونوں پر قایم ہے ایک تجربہ، دوسرے صحیح استدلال“ پھر فرماتے ہیں کہ ذہن انسانی کی گمراہی کے تین بڑے اسباب یہ ہیں ”کورانہ تقلید، عدم تحقیق ذاتی، اور زود اعتقادی“ اور ان عام ارشادات کے علاوہ آبائے کلیسا کی متعدد اغلاط کی تصریح کے ساتھ پردہ دری کی ہے۔

انقلاب خیالات کی یہ کیسی روشن مثال ہے! مگر کس کے خیالات میں انقلاب؟ سرٹامس براؤن یا کسی فرد واحد کے خیالات میں نہیں بلکہ وہ انقلاب جو اب سارے ملک پر محیط ہو گیا تھا اور جس کی ان تصانیف میں صرف جھلک نظر آتی ہے۔ یہ انقلاب سترھویں صدی کے وسط میں جملہ علوم نظری وعملی میں پیدا ہو گیا تھا۔ اس زمانہ میں بیکن کی موت کے بعد اگر انگلستان میں نیوٹن کو چھوڑ کر کوئی اور شخص دماغی حیثیت سے سب سے زیادہ ممتاز کہا جا سکتا ہے تو وہ بوایل تھا۔ ہم کو سردست اس سے سروکار نہیں کہ اس نے

علم میں کیا کیا اضافے کئے۔ تاہم اثنا یہ ضمنی تذکرہ کہہ سکتے ہیں کہ لون وحرارت کے باہمی تعلقات پر سب سے پہلے تجربہ اسی نے کیا، اور اس طرح نہ صرف بعض متفرق معلومات کا اضافہ کیا بلکہ علم الحرارت وعلم المرایا کے اتحاد کا سنگ بنیاد بھی اسی نے رکھدیا۔ اسی بوایل کو علم کا بانی بھی کہہ سکتے ہیں یہی بوائل اس اہم قانون کا بھی مکتشف ہے کہ ہوا کی لچک ہمیشہ اس کی کثافت کے متناسب ہوتی ہے۔ اور یہ قول ایک موجودہ محقق علم الموجودات کے اسی بوایل نے اُس مواد کے فراہمی کی بھی ابتدا کی جس نے آگے چل کر لویزا کے ہاتھوں کیمسٹری یا کیمیائیات جیسے اہم علم کی صورت اختیار کی۔

بوایل کے ان اکتشافات سے انسان کی راحت اور تمدن کی مادی سہولتوں میں کہاں تک اضافہ ہوا۔ اس کے بیان کا یہ موقع نہیں۔ ہم ان کے ذکر سے یہاں صرف یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ اوپر جس تحریک کا خاکہ کھینچا گیا، اس سے بوایل کے کارنامہ کس حد تک مطابقت رکھتے ہیں۔ بوایل اپنی تمام مختلف ممنوع تحقیقات میں ان دو اصول کا سررشتہ کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑتا اوّل یہ کہ "اپنے ذاتی تجربہ ومشاہدہ سے کام لو۔ دوسرے یہ کہ "روایات قدیم پر کبھی پورا اطمینان واعتماد نہ کرو"۔ دونوں اصول اُس نے بیکن سے لئے تھے وہ خود ان پر سختی سے عمل کرتا رہا اور اُس کے بعد تمام محققین اس شاہراہ پر چلتے رہے ہیں۔ پہلا درجہ شک وبے اعتمادی کا دوسرا مرحلہ تحقیقات وتلاش کا اور آخری منزل اکتشاف وحصول علم کی اس کے سوا اہل تحقیق کے لئے اور کوئی جادۂ عمل نہیں ہے خود بوایل کو اس طریق عمل کی صحت کا اس درجہ یقین تھا کہ گو وہ ذاتی طور پر بہت ہی مذہبی آدمی تھا تاہم اُس نے اپنی سب سے زیادہ مقبول سائنٹیفک کتاب کا عنوان رکھا "متشکک عالم کیمیا" (The Sceptical Chemist) جس سے اس کا منشا یہ تھا کہ جس وقت تک کوئی شخص اپنے زمانہ کے مسائل کیمیائیات پر قناعت رکھے گا وہ تحقیق کر ہی نہ سکے گا گویا تحقیق وتفحص کے لئے پہلے بے اعتمادی وبے اطمینانی ضروری ہے۔ یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ اس تصنیف کا

سنہ اشاعت ۱۶۶۱ء ہے یعنی جلوس شاہ چارلس دوم کا سال دوم۔ اس بادشاہ کے زمانہ میں روشن خیالی کی خوب اشاعت ہوئی یہاں تک کہ اہلِ دربار سے بھی ضعیف الاعتقادیاں رخصت ہوگئیں۔ اور گو یہ ضرور ہوا کہ دربار میں آکر خود روشن خیالی نے اپنا وقار کھو دیا اور اس پر درباریوں کی سخافت و مسخرگی غالب آگئی۔ تاہم اس سے روشن خیالی کی تعمیم اشاعت کا پورا پتہ چلتا ہے کہ اہلِ دربار جنھیں غور و فکر سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا اور جو اپنے تساہل و کاہلی کے باعث عموماً قدامت پرستی پر قانع رہتے ہیں وہ تک زمانہ کے اثر سے نہ بچ سکے۔

اس زمانہ سے ہر شے اس سے متاثر ہونے لگی۔ ہر صیغہ میں یہ نظر آنے لگا کہ لوگ درایت و اجتہاد کو روایت و تقلید پر مقدم سمجھتے ہیں اسی زمانہ میں شاہ چارلس دوم کی فیاضیوں سے انگلستان کی مشہور و معروف رایل سوسائٹی اس غرض سے قایم ہوئی کہ تجربات و اختیارات کے ذریعہ سے علوم میں اضافہ ہو اور لطف یہ ہے کہ اس کو جو چارٹر عطا ہوا اُس میں صاف تصریح ہے کہ یہ انجمن "علوم طبعی" کی ترقی کے لئے ہے نہ کہ علوم غیر طبعی یا روحانی کے لئے۔

مگر یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ ان چیزوں کو مخالفت شدید سے دُو بدو ہونا نہیں پڑا۔ قدامت پرستوں کا جو طرزِ عمل آج ہے یہی ہمیشہ رہا ہے۔ ان لوگوں نے اپنے اقتدار کو سلب ہوتے دیکھکر جی توڑ کر مخالفت کی۔ یہ لوگ جن کی بصارت صرف ماضی کے لئے ہوتی ہے اور حال و استقبال کی طرف سے اندھی ہوتی ہے، ہر جدید شے کو بدعت قرار دیتے تھے اور بس چلتا تو اُسے تازیانہ کے زور سے روکتے۔ خود رایل سوسائٹی کے قیام پر مخالفت کا جو زبردست طوفان برپا کیا گیا وہ بہت کچھ سبق آموز ہے اور میں کسی دوسرے موقع پر اس کا تفصیلی ذکر کروں گا۔ یہاں صرف اس قدر کہہ دینا کافی ہے کہ رجعت پسند جماعت کے ... تھی لیکن بالآخر انھیں ہزیمت کامل ہوئی اور شاید یہ

اسی کا نتیجہ ہوا کہ کچھ ہی روز میں ادھر سے کچھ لوگ کٹ کر ادھر آرہے ہیں اور اب ترقی پسند گروہ میں بھی چند ارباب کلیسا شامل ہو گئے علم و فضل کب تک تقلید و تعصب کی بندشوں میں جکڑا رہ سکتا جوں ہی آزادی نصیب ہوئی۔ یہ لوگ علانیہ رایل سوسائٹی کے مُدبّرین میں ہو گئے۔ لیکن درحقیقت ایسے لوگ صرف معدودے چند تھے۔ اہل کلیسا کا سوادِ اعظم برابر مخالفت پر جما رہا اور شاہ چارلس دوم کا سارا عہد حکومت سائنس و کلیسا کا رزمگاہ بنا رہا۔ اس مقدس گروہ کی ساری کوشش اس میں صرف ہوتی تھی کہ سائنس کی ترقی کو روکا جائے اور اس کی راہ میں جہاں تک ممکن ہو روڑے اٹکائے جائیں اور ان کا یہ طرز عمل ذرا بھی حیرت انگیز نہیں۔ علوم طبعی کی عمارت انسان کو ہر شے میں ثبوت و شواہد قطعی طلب کرنے کا عادی کر دیتی ہے اور ظاہر ہے کہ ارباب کلیسا اپنے دعاوی کا کوئی مشاہد ثبوت نہیں دے سکتے تھے۔ دوسرے یہ کہ علوم طبعی روز نئے نئے مسائل انسان کے سامنے پیش کرتے ہیں جن کی دلآویزی و کشش لامحالہ انسان کی توجہ دینی مباحث کی طرف سے ہٹا کر اپنی جانب منعطف کر لیتی ہے اور پھر یہ موثرات صرف مخصوص علمائے سائنس تک محدود نہیں رہتے بلکہ وسیع ہو کر عام خلقت پر بھی محیط ہو جاتے ہیں۔ ان اسباب کے ہوتے ہوئے حاملانِ شریعت کا سائنس کے نام سے خوف کھانا بالکل بجا تھا اور یہ ایک دلچسپ داستان ہی۔

حقیقت یہ ہی کہ جس قوم پر علوم طبعی سے جتنی زیادہ جہالت چھائی ہوگی اُسی نسبت سے وہ اپنے گرد و پیش کے واقعات کو غیر طبعی اسباب کی جانب منسوب کرنے پر آمادہ و مستعد رہا کرے گی، اور جوں جوں علوم طبعی کو ترقی ہوتی جائے گی، مادی علل و اسباب کا سلسلہ اس کی نظروں میں وسیع ہوتا جائے گا اور مافوق الطبیعی اسباب کا دائرہ محدود ہوتا جائے گا۔ جاہل دہقانیوں کے یہاں جب تپ و لرزہ کی فصل آتی ہے تو وہ اس کو قہر الٰہی خیال کر کے دعاؤں میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ لیکن

انھیں کے ہم جنس جب پڑھ لکھ کر یہ مشاہدہ کرنے لگتے ہیں کہ جہاں صفائی رہتی ہے اور غلاظت و رطوبت نہیں رہنے پاتی، وہاں کے لوگ پوری طرح صحیح و تندرست رہتے ہیں تو لامحالہ وہ دعا تعویذ کو بے اثر سمجھکر حفظان صحت کی مادی تدابیر کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں یہی سبب ہے، کہ جوں جوں علم کو ترقی ہوتی جاتی ہے انسان کے دل سے عجائب پسندی مٹتی جاتی ہے اور اُسے نظر آنے لگتا ہے کہ ہر شے قوانین وضوابط کی پابند ہے۔ سائنس انھیں قوانین کو دریافت کر کے واقعات حوادث کے وقوع سے پیشتر ان کی بابتہ پیشین گوئی کر دیتا ہے اور جب لوگ ان پیشینگوئیوں کو برابر صحیح اُترتے دیکھتے ہیں تو لامحالہ اُن کی قوت متخیلہ روحانی اسباب کی طرف سے سمٹ کر صرف مادی طبعی اسباب پر جم رہتی ہے یہیں سے یہ بھید بھی کھل جاتا ہے کہ ایک تعلیم یافتہ قوم ہی نہیں غیر تعلیم یافتہ قوم کے مقابلہ میں زیادہ روشن خیال ہوتی ہے بلکہ ایک ہی قوم کے مختلف طبقات میں بھی یہ فرق مراتب بالکل صاف موجود ہوتا ہے اس مسئلہ کا حل صرف یہ ہے کہ جن جماعتوں کے مشاغل زیادہ قطعی طور پر سائنس سے متعلق ہوتے ہیں وہ روشن خیال بھی زیادہ ہوتی ہیں، اور جن جماعتوں کے مشاغل سے ابھی سائنس کا ایک بعید تعلق ہے وہی زیادہ اوہام پرست و تاریک خیال ہوتی ہیں مثال کے لئے ہم ملاحوں اور سپاہیوں کا مقابلہ کرتے ہیں، ملاحوں کی اوہام پرستی ہمیشہ سے اور ہر جگہ مشہور رہی ہے، ہر زبان میں ان کی ضعیف الاعتقادیوں کے قصص و روایات ملتے ہیں۔ لیکن اس کی وجہ کیا ہے؟ صرف یہ کہ مطریات ابھی سائنس کے درجہ تک نہیں پہنچتا ہے اور موسمی تغیرات کے قوانین جو طوفان، سیلاب، ابر باد، وغیرہ کو وجود میں لاتے ہیں ابھی علم انسانی میں پوری طرح نہیں منضبط ہو چکے ہیں۔ برخلاف اس کے زمین بمقابلہ سمندر کے، انسان کے تصرف و اقتدار میں زیادہ آچکی ہے، خشکی سے متعلق صدہا قوانین کو سائنس منضبط کر چکا ہے۔ اسی لیے خشکی کے سپاہیوں میں مافوق الفطرت قوتوں کے اوہام بہت ہی کم پائے جاتے ہیں۔ دوسری مثال کاشتکاروں اور تاجروں کی

ہے۔ کاشتکاری کا دارمدار تقریباً تمامتر موسم اور بارش پر ہے اور چونکہ اس کے قوانین ابھی تک بہت کم منضبط ہو چکے ہیں اس لئے اہل زراعت طرح طرح کے اوہام اور ڈھکوسلوں میں گرفتار رہتے ہیں اور خشک سالی یا باران شدید کو روکنے کے لئے دُعائیں مانگتے ہیں، نمازیں پڑھتے ہیں وغیر ذالک۔ حالانکہ یہ نہیں سمجھتے ہیں کہ آج جس طرح ہم اپنے اسلاف کی وہم پرستی پر ہنستے ہیں کہ وہ کسوف وخسوف اور دُمدار ستاروں سے اس قدر خائف رہتے تھے اور ان کے لئے نمازیں پڑھتے تھے اُسی طرح آیندہ نسلیں ہماری اس حماقت وجہالت پر مضحکہ کریں گی کہ یہ لوگ ایسے سیدھے سادھے طبعی واقعات کی روک تھام کے لئے غیر طبعی قوتوں سے استمداد کرتے تھے اور بجائے اس کے کہ علم اور اسباب ترقی کی دریافت میں ترقی کرتے اپنی جہالت کو مذہب کے پردہ میں چھپاتے تھے۔ کاشتکاروں اور دہقانوں کے برخلاف چونکہ اہل تجارت بلکہ جملہ اہل شہر کے وسائل معاش کا دارومدار تمامتر خودانھیں کی جدوجہد، ذہانت وقابلیت، اور محنت وصناعت پر ہوتا ہے اس لئے یہ لوگ لازمی طور پر زیادہ روشن خیال اور اپنے آپ پر بھروسہ کرنے والے ہوتے ہیں۔ اس موقع پر ہم یہ بتا سکتے تھے کہ تجارت وصنعت وحرفت کے پھیلاؤ سے تمدن کی مادی ترقی کتنی ہوتی ہے، ملک میں ثروت ودولت کی کیسی افزائش ہوتی ہے انسان میں خوداعتمادی کیونکر بڑھ جاتی ہے، مختلف مشاغل کے نکل آنے سے اوہام پرستیوں کی طرف سے توجہ کیونکر ہٹ جاتی ہے لیکن چیزوں کی تفصیل ہمارے موضوع سے خارج ہے اور جو کچھ اوپر گزر چکا ہے وہ اس حقیقت کے اظہار کے لئے بالکل کافی ہے کہ علوم تجربی نے چارلس دوم کے عہد میں پھیل کر مذہب کے غلو کو کس قدر دبا دیا۔

صفحات بالا میں ہم نے ناظرین کے سامنے وہ نقطۂ نظر تفصیل سے پیش کر دیا ہے جس کے سُلجھے ہوئے بغیر کسی عہد تاریخی سے متعلق ہم صحیح نتائج پر پہنچ ہی نہیں سکتے۔ عام طور پر جس انداز پر ملکی تاریخیں لکھی جاتی ہیں ان کے لکھنے والے چارلس دوم کے عہد کو از سر تا پا

تاریخ کے صفحات میں غیر متعلق مباحث کو کیوں درج کیا۔ بے شبہ اگر تاریخ کے معنی محض سلاطین و امرا کی سنین ولادت و وفات و تخت نشینی کے اندراج کے لئے جائیں تو میں اقبالی مجرم ہوں۔ لیکن اگر اس کے مفہوم میں کسی دور کی رفتار ترقی یا تنزل کو پوری طرح پر سمجھنا بھی داخل ہو تو میں نہیں جانتا کہ سوا اُس طریقہ کے جو میں نے اوپر اختیار کیا ہی اور کیونکر چارلس کے زمانہ سے متعلق ہم کسی صاف اور سُلجھے ہوئے نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں۔

چارلس کا زمانہ درحقیقت مجموعہ تناقضات ہوا ہے۔ ایک طرف انتہا سے زیادہ ابتریاں تھیں، دوسری طرف عظیم الشان اصلاحات ہو رہی تھیں۔ پہلے نقائص کو لیجئے بہ لحاظ سیاست و خارجی حکمت عملیوں کے چارلس کا زمانہ بدترین زمانہ ہوا ہی سلطنت کی کمزوری رعایا و اغیار سب پر ظاہر ہو گئی تھی، وزرائے سلطنت، بہ استثنائے کلیرنڈن جو خود بادشاہ کی نظروں میں اپنے فضائل کی بنا پر مبغوض تھا، تمام تر رشوت خوار تھے اصول سیاست سے بیگانہ تھے اور فرانس سے وظیفہ پاتے تھے۔ خود فرماں روائے وقت عیاشی سیہ کاری، دناءت، و کم ظرفی کا مجسمہ تھا، جسے مسیحیت کیا، معنی انسانیت ہی سے کچھ واسطہ نہ تھا۔ رعایا پر ٹیکس کے روز افزوں اضافے ہوتے تھے اور جان و مال کی حفاظت روز بروز خطرہ میں پڑتی جاتی تھی۔ مختلف شہروں کے چارٹروں (فرامین) کے ضبط ہو جانے سے میونسپل حقوق و آزادیاں سلب ہو رہی تھیں۔ خزانہ کے بند ہو جانے سے قومی سے ہماری ساکھ اُٹھتی جاتی تھی اور باوجود محکمۂ جنگ پر فوق الحد مصارف کے ہماری بے بسی اور کمزوری کی یہ نوبت پہنچ گئی تھی کہ ہالینڈ جیسی معمولی سلطنت نے جب ہم پر حملہ کیا تو ہم مدافعت کے بھی قابل نہ نکلے اس نے ہمارے ساحلوں کو تاخت و تاراج کیا اُس کے بیڑے نے دہانۂ ٹیمس میں گھس کر ہمارے جہازوں میں آگ لگا دی اور ہمارے دار السلطنت پر گولے برسا دئے۔ ایک طرف تو یہ سب اندھیر تھا، لیکن دوسری طرف یہ حال تھا کہ جتنے

اصلاحات چارلس کی عہد میں ہوئیں اتنی اس قدر مدت میں کبھی اس سے پیشتر سرزمین انگلستان پر نہیں ہوئی تھیں۔ ملک پر اس وقت دو استبدادی قوتیں حکمرانی کر رہی تھیں۔ ایک مقتدایان کلیسا دوسرے اُمراء، چارلس کی حکومت نے ان دونوں قوتوں کا خاتمہ کر دیا پادریوں کے متعلق ایسے قوانین باضابطہ طور پر نافذ ہو گئے، جن سے نہ انھیں اپنے سے مختلف العقاید اشخاص کو جلا دینے کا کوئی حق حاصل رہا نہ اپنے اوپر خود ٹیکس تشخیص کرنے کا کوئی حق باقی رہا بلکہ عام افراد کی طرح اُن پر بھی حکام سرکاری ٹیکس تشخیص کرنے لگے اور پھر نہ مذہبی عدالتوں کے ہاتھ میں یہ اختیار رہ گیا کہ کسی مشتبہ شخص کو اقبال جُرم پر مجبور کر سکیں۔ رہے امراء، تو ان کا اقتداریوں تشریف لے گیا کہ دارالامراء کو مقدمات دیوانی میں جو خاص اختیارات حاصل تھے سلب کر لئے گئے۔ نیز ٹیکس کی تشخیص تمام تر نمایندگان جمہور پر چھوڑ دی گئی اور مالیہ سے متعلق اکثر قوانین کا نافذ کرنا دارالعوام ہی کے ہاتھ میں آگیا۔ دارالامراء کے لئے محض ایک ضابطہ کی منظوری رہ گئی۔ غرض اس طرح کلیسا و امراء دونوں کا زور توڑا گیا۔ پھر اس قدر قوانین ایسے نافذ کئے گئے جن سے خود جہاں پناہ کے اختیارات بھی بہت کچھ محدود ہو گئے مثلاً وہ قانون جس کا منشاء یہ تھا کہ ہر شخص قانوناً آزاد ہے اور اگر اس پر کسی جرم کا الزام لگایا جائے گا تو بجائے فوراً قید میں ڈال دینے کے اُس پر باضابطہ مقدمہ چلایا جائے گا، اس کی کامل تحقیقات ہوگی، اور اسے اپنے بریت کا پورا موقع دیا جائے گا، اسی طرح بعض اور قوانین کی بنا پر اب رعایا کی جائدادیں زیادہ محفوظ رہنے لگیں، مطابع کو آزادی نصیب ہو گئی جس سے زیادہ تمدن و روشن خیالی کی اشاعت میں کوئی شے نہیں معین ہو سکتی تھی اور اس کے صدہا اور قانونی سختیاں اور قیدیں اُٹھا دی گئیں، جو صدیوں سے چلی آرہی تھیں مگر ان کے ذکر سے ناظرین کے ذہن کو وحشت ہوگی۔

یہ تین اصلاحات، جو ایسے زمانہ میں ہوئیں جبکہ فرماں روائے وقت نااہلیت کا پتلا

جبکہ ارکانِ دربار بدمستی و عیش کاری
میں غرق تھے جبکہ ملک اندرونی و بیرونی دشمنوں کی سازشوں کا ہدف ہو رہا تھا اور جبکہ طاعون کی وبائے عظیم اور آتش زدگی نے ملک کی آبادی اور تجارت و حرفت کے کاروبار کو یکساں برباد کر رکھا تھا۔ اب سوال یہ ہے کہ ایسی نامساعد زمانہ میں یہ اصلاحات ممکن کیونکر ہوئیں؟ رسمی تاریخ نگاروں کے یہاں اس سوال کا کوئی جواب نہیں۔ وہ لوگ جو ہر شے کو افراد کی شخصیتوں کا معلول سمجھتے ہیں، اس سوال کے جواب میں قطعاً عاجز ہیں۔ ایسے موقع پر ان نام نہاد مورخین کی آنکھیں کھلنا چاہیئے اور انھیں نظر آجانا چاہیئے کہ اصل قابلِ لحاظ شے، زمانہ کی ہوا ہوتی ہے۔ جس کی قوت کے سامنے بڑے بڑے مقتدر اشخاص کی قوتیں بھی ہیچ ہیں۔ بارش کے وقت ہوا چلتی ہے تو دریا کی سطح پر بڑے بڑے بلبلے اٹھتے ہیں مگر کتنی دیر قایم رہتے ہیں؟ اور ان سے دریا کی روانی پر کیا اثر پڑتا ہے۔ بعینہٖ یہی حال سیلِ زمانہ کا ہے۔ بڑے بڑے مقتدر سلاطین مُدبّرین، مصنفین، علماء، امراء، ان میں سے کسی کی اتنی بساط نہیں کہ زمانہ کی قوت کو روک سکے۔ بادشاہ تاریک خیال ہو، تو ہوا کرے اگر قوم روشن خیالی کے لئے تیار ہے تو روشن خیال ہو کر اور تاریک خیالی بندشوں کو توڑا کر رہے گی۔ کسی شے کی ہوا بندھ جاتی ہے تو بندھ جاتی ہے اور اُکھڑ جاتی ہے تو اُکھڑ جاتی ہے، اس کی روک تھام کسی ایک فرد، یا چند افراد کے بس کی بات نہیں۔

یہ تو ایک عام جواب تھا۔ اس خاص مسئلہ کا حل یہ ہو کہ یہ تمام قانونی اصلاحات اس عام زبردست اصلاحی تحریک کا محض ایک جزو تھیں، جس کی بنیاد تو عرصہ دراز ہوا پڑ گئی تھی، مگر اب تین پشتوں سے وہ علانیہ قایم ہو گئی تھی۔ میری مُراد اس تحریک سے وہی تحریک عقلیت یا تشکیک ہو۔ جس کا مفہوم یہ تھا کہ روایات، زود اعتقادی و تقلید کورانہ کے راستہ کو چھوڑ کر عقل، اجتہاد درایت و ذاتی تفحص و تحقیق سے کام لینا

چاہیئے اور جواب سائنس مذہب اور سیاست کے دائرہ میں اپنا یکساں اثر دکھارہی تھی۔ اس تحریک کا کھلا ہوا مقصود یہ تھا کہ مخصوص طبقات کے مقتدرانہ امتیازات مٹیں اور ان کے مٹنے کے معنی لازمی طور پر نکلتے تھے کہ جمہور کے حقوق میں اضافہ ہو۔ چنانچہ عملاً یہی ہوا اور یہی اس مسئلہ کا حل ہے جو بعض تاریخ نگاروں کو لاینحل معلوم ہوتا ہے۔ اصلاحات مذکورۂ بالا براہ راست تمامتر اسی تحریک عقلیت کا نتیجہ تھیں۔ رہا یہ امر کہ بادشاہ وقت کی اوباش مزاجیوں کا اس پر کیا اثر پڑا، تو گو عام خیال یہ ہے کہ ان کے علی الرغم اس تحریک کو ترقی ہوتی رہی، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ نفس الامر اس کے برعکس ہے میرے نزدیک واقعہ یہ ہوا کہ شاہی رندی و رنگینی اس تحریک کی اشاعت میں معین ہوئی۔ ایک ربع صدی تک ایسے شخص کو اپنا فرماں روا دیکھکر جس میں غیرت و حمیت کا شائبہ تک نہ تھا جو خفیف الحرکتی و سخافت کا منتہا تھا اور جس کی بدمستی و منافقت طشت از بام ہو چکی تھیں رعایا کا دل اس کی طرف سے لامحالہ ہٹ گیا اور اسی کے ساتھ تخت و تاج کیساتھ جو وفاداری چلی آرہی تھی وہ بھی رخصت ہو گئی۔ ایک طرف تو یہ فائدہ ہوا۔ دوسری طرف یہ ہوا کہ چارلس کو مذہبی زہد و تقویٰ سے طبعاً وحشت تھی اور اپنی عیاشیوں میں ہارج دیکھکر (نہ کہ کسی روشن خیالی کی بنا پر) اسے اہل کلیسا کی طرف سے ایک نفرت سی سما گئی۔ چنانچہ وہ ان کی تذلیل و توہین میں ذرا بھی تامل نہ کرتا تھا اور اس کے احباب ان لوگوں پر طرح طرح کے ذلیل کُن فقرے اور آوازے کسا کرتے تھے اور گو پھبتیاں عموماً بازاری اور مبتذل ہوتی تھیں تاہم ارکان دربار کے نزدیک اعلیٰ قسم کی ظرافت میں داخل تھیں۔ یہ الفاظ لٹریچر میں محفوظ ہیں اور انھیں دیکھکر ہر شخص معلوم کر سکتا ہے کہ اب زمانہ کی ہوا کیا ہو رہی تھی۔ ان تمام شواہد کے علاوہ ایک اور دلچسپ شہادت بھی ہمیں زمانہ کے اس رُخ سے متعلق، ہابس کی زندگی میں ملتی ہے۔ یہ مشہور فلسفی سترھویں صدی میں کلیسا کا سب سے بڑا دشمن ہوا ہے۔ اس نے

اپنی تحریروں میں ہمیشہ کلیسا کی مخالفت کی اور علانیہ اس کے اصولوں و تعلیمات کی تردید
کرتا رہا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ اہل کلیسا ہی اس سے متنفر اور دشمن ہو گئے انھوں نے
اس کے خلاف سخت سے سخت فتوے صادر کئے۔ اس کی تصانیف کو ممنوع المطالعہ
قرار دیا اور ان کی اصطلاح میں "اہل بدعت" اور "ہابسی" مرادف الفاظ ہو گئے لیکن ان کی
اس شدید مخالفت کا نتیجہ کیا ہوا؟ کیا یہ ہوا، کہ ہابس قتل کرا دیا گیا؟ کیا یہ کہ اُسے
جلاوطن ہونا پڑا؟ کیا یہ کہ سخت ذلتیں و رسوائیاں اُٹھانا پڑیں؟ نہیں یہ کچھ بھی نہیں ہوا
بلکہ یہ ہوا، کہ اُسے دربار سلطانی میں اور زیادہ تقرب حاصل ہو گیا، قصر سلطانی کے
ایک نمایاں مقام پر اُس کی تصویر آویزاں کی گئی اور اس کا ایک خاص منصب مقرر ہو گیا!!

پھر اگر اُن لوگوں کی فہرست اُٹھا کر دیکھئے جو چارلس کے زمانہ میں کلیسا کے مقتدر
مناصب پر سرافراز ہوئے تو وہ سب کے سب ایسے نکلیں گے جو بددیانت نالائق تھے۔
چارلس چُن چُن کر نااہلوں ہی کا تقرر کرتا تھا۔ یہ تو قطعی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ چارلس
بالارادہ ایسا کرتا تھا، تاہم عملاً ہوا بھی کہ جس قدر افراد ان مناصب پر مقرر ہوئے
بلا استثناء سارے کے سارے ایسے تھے کہ ان کی ذات سے کلیسا کا وقار لوگوں کے
دلوں سے اُٹھ گیا اور خود کلیسا کی بے اعتباری عام طور پر پھیل گئی۔ اس بادشاہ کے عہد
حکومت میں تین شخص آرچ بشپ آف کنٹربری کے عہدہ پر ممتاز ہوئے، جکسن، شلڈن
وسینکرافٹ اور تینوں نااہلیت میں ایک سے ایک بڑھکر تھے، جن کی وجہ سے گرجا کی
خوب بدنامی ہوئی۔ ان سے نیچے کے عہدہ داروں کو لیجئے تو ان کا بھی یہی رنگ نظر
آئے گا۔ بشپ آف یارک، یہ تین شخص ہوئے تھے، فریون، اسٹرن، وڈالین، اور یہ تینوں
ایسے مجہول الحال تھے کہ آجتک کوئی ان کا نام بھی نہیں جانتا اور پھر کچھ یہ نہیں کہ بہتر لوگ ملتے
نہ تھے اور مجبوراً شاہ کو انھیں نااہلوں کا تقرر کرنا ہوتا تھا۔ ایسا ہرگز نہ تھا بلکہ حقیقت حال
اس کے برعکس ہی یعنی بہتر سے بہتر لوگ ملتے تھے، اور بادشاہ اُن کا تقرر نہیں کرتا تھا،

کہ کہیں ان کی شخصیت از سر نو اقتدار کلیسا قایم کرانے میں معین نہ ہو۔ اس کے معاصرین میں جرمی ٹیلر و اسحاق بیروز سے بڑھکر کس میں ان مناسب جلیلہ کی اہلیت ہو سکتی تھی اخلاقی و علمی صفات حسنہ کی جامعیت ان دونوں میں موجود تھی۔ پھر اگر ذاتی تعلقات کو دیکھئے تو جرمی ٹیلر شاہ کا عزیز خاص یعنی حقیقی بہنوئی تھا۔ اور بیروز کیا سارے خاندان نے خاندان شاہی کے پیچھے اپنی جان تک کو خطرہ میں ڈال دیا تھا۔ لیکن یہ دونوں ہمیشہ گمنامی و کس مپرسی کی زندگی بسر کرتے رہے ان کی مطلق قدر نہیں ہوئی بلکہ ٹیلر کا تقرر آیرلینڈ کے ایک گرجا میں کر دیا گیا تھا جو اس زمانہ کے لحاظ سے ایک طرح کی جلاوطنی تھی، اور بیروز جو اس سے بھی قابل تر تھا اُسے آخری عمر (یعنی موت سے پانچ سال قبل) میں کہیں جا کر کیمبرج کے ٹرنٹی کالج کی پرنسپلی ملی۔

ان تمام مختلف اسباب و حالات سے کلیسا کے قوت و اقتدار کو جو صدمہ پہنچا ہوگا اور تحریک عقلیت کو جو تقویت حاصل ہوئی ہوگی، اس کا اندازہ ناظرین خود کر سکتے ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی موثرات اس میں معین ہوئے مگر اُن کی تفصیل اس مقدمہ میں نہیں بلکہ کہیں آگے بیان ہوگی۔ تاہم جو کچھ اوپر بیان ہو چکا ہے اُس سے ناظرین اب اُن زیادہ پیچیدہ واقعات کو بخوبی سمجھ سکیں گے، جو اس سترھویں صدی میں پیش آتے رہے اور جن کا ذکر آگے آتا ہے۔

چارلس دوم کی وفات سے ابھی چند سال باقی تھے کہ پادری صاحبان نے نیابت الٰہی واطاعت بیچون وچرا کے قدیم مسایل کو از سر نو زندہ کر کے اپنے گم شدہ اقتدار کو دوبارہ حاصل کرنے کے لئے پھر ایک آخری زور لگایا اور یہ ان کی حرکت مذبوحی تھی۔ لیکن اب انگلستان کی دماغی سطح بہت بلند ہو چکی تھی اور اب انگریزی قوم اس منزل سے بہت آگے بڑھ چکی تھی کہ اس طرح کا کوئی دباؤ سہہ سکتی۔ چنانچہ اس کا نتیجہ صرف یہ ہوا کہ قوم کلیسا کے درمیان مخالفت اور زیادہ قوی و شدید ہو گئی۔ پادری صاحبان کو اس معرکہ میں شکست

ہو ہی چکی تھی کہ دفعتہ چارلس کا انتقال ہو گیا اور زمام حکومت ایک ایسے تاجدار (جیمس)
کے ہاتھ میں آگئی جو کیتھولک گرجا کا دل وجان سے شیدا تھا اور اُس فرقہ کا متبع تھا
جو عقل انسانی کی حکومت ومغلوبیت پر علانیہ فخر کرتا ہے۔ یہ تغیر حکومت بہ اعتبار اپنے
نتائج بعیدہ کے ملک کے لئے نہایت مفید ثابت ہوتا۔ انگلستان کے پادری باوجود
تخالف مذہب کے جیمس کو اس کی شہزادگی ہی کے زمانہ سے بیحد پسند کرتے تھے وہ
اس کی مذہبیت پر گرویدہ تھے اور جانتے تھے کہ اگر اُس کی مذہبیت کا ذرا سا رُخ بدل
جائے یعنی وہ کیتھولک سے پروٹسٹنٹ ہو جائے تو ہمیشہ ان کا بندہ بے درم ہو کر
رہے گا اور ان کا اقتدارِ رفتہ پھر از سرِ نو عود کر آئے گا۔ چنانچہ انھوں نے اُس کی
تخت نشینی کے لئے اپنی ساری کوشش صرف کر دی اور جب چارلس کے زمانہ میں جیمس کے
محروم الارث ہونے کی تحریک انھیں لوگوں کی کوشش سے نامنظور ہوئی تو انھوں نے
شاہ چارلس کے سامنے جا کر باضابطہ تہنیت نامہ پیش کیا۔ پھر اُس کے بعد جب وہ
تخت نشین ہو گیا تو بھی ان لوگوں کی حمایت وتائید برابر قایم رہی اسی اُمید میں کہ شاید
وہ پروٹسٹنٹ ہو جائے اور حکومت وکلیسیا کے اس اتحاد سے ملک کو جن مظالم واخلاق
شکن مناظر کا نظارہ کرتے رہنا پڑا اُن کے ذکر سے تاریخ کے صفحات لبریز ہیں۔ لیکن
بالآخر یہ اتحاد ٹوٹا اور اس طرح پر کہ بادشاہ نے رعایا کو کسی قدر مذہبی آزادی دینا چاہی
اور اسی پر سارا کلیسا بگڑا تھا۔ ایک قدیم قانون کی رو سے اس وقت سارے ملازمین
سرکار کے لئے لازمی تھا کہ ملازمت میں داخلہ کے لئے کلیسائے انگلستان میں شامل
ہونے کا عہد کریں۔ اس قانون کو جیمس نے منسوخ کرنا چاہا اور اس کا یہ گناہ کلیسائے
انگلستان کے نزدیک ناقابل عفو تھا۔ پادریوں نے دیکھا کہ اُن کی رہی سہی قوت اسی
قانون کے دم سے وابستہ ہے اور انھوں نے اسے منسوخ ہوتے دیکھکر بلا تامل علم بغاوت
بلند کر دیا۔ غور کرو کہ یہ وہی پادری تھے جنھوں نے جیمس کو بڑے سے بڑے معاصی کا

مرتکب ہوتے دیکھا تھا مگر کبھی لب نہ ہلایا تھا وہ "اہلِ خلاف" (ڈسنٹرز) پر طرح طرح کے جور و تشدد کرتا تھا اور یہ اس کی تائید کرتے تھے وہ رعایا کی آواز کو دبا کر استبدادی حکومت قایم کرنا چاہتا تھا اور یہ اس کی اعانت پر کمر بستہ تھے۔ قید خانہ مظلوموں سے بھرتے اور بے گناہ پھانسی پر چڑھتے چلے جاتے تھے لیکن ان اساطین مسیحت کے کان پر جوں تک نہ رینگتی تھی۔ قابل سے قابل لوگ اور وہ بھی محض بے گناہ قید و جلا وطنی بھگت رہے تھے مگر جبہ پوشان شریعت کے نزدیک ظلِ سبحانی کے خلاف لب کشائی کرنا ایک معصیت عظیم تھی۔ غرض یہی پادری جواب تک اطاعت و وفاداری کی تصویر تھے، جونہی انھوں نے دیکھا کہ بادشاہ مذہبی رواداری پر تُلا ہوا ہے فوراً بغاوت پر آمادہ ہو گئے۔ یہ دنیا کے سارے جرایم سارے معاصی، سارے ذمایم برداشت کر سکتے تھے لیکن یہ تو نہیں ہو سکتا تھا کہ یہ اپنے سے مخالف عقیدہ رکھنے والوں کو جبر و تشدد کے قیود سے آزاد دیکھ سکیں آرچ بشپ آف کنٹربری کا اشارہ پا کر ساری جماعت ایک ہو گئی اور چند مستثنیات کو چھوڑ کر سب نے متفق اللفظ ہو کر گرجاؤں میں بادشاہ کے جدید فرمان کے پڑھنے سے انکار کر دیا۔ اور صرف اتنے ہی پر بس نہ کیا، بلکہ یہ جی میں ٹھان لی کہ جو کچھ ہو، اس بادشاہ کو معزول کر ہی کے رہنا چاہیئے چنانچہ وہی "اہلِ خلاف" جو کل تک ہدف مظالم و مطاعن ہو رہے تھے آج بہ کمال منت والتجا سازش میں شریک کئے جانے لگے اور گو وہ لوگ کبھی اس فریب میں نہ آئے کہ ان پادریوں کو اپنا دوست سمجھنے لگتے تاہم کیتھولک مظالم کے مقابلہ میں تو وہ کلیسائے انگلستان کو پھر مغتنم سمجھتے تھے اور اس لئے وہ بھی باغیوں کی اعانت پر مستعد ہو گئے۔ عام رعایا میں تو پیشتر ہی سے برہمی پھیل رہی تھی۔ ان سب کے اتفاق و اتحاد کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت کا تختہ بات کہتے ہیں اُلٹ گیا۔

اس انقلاب حکومت کے جلو میں جو جنگی و سیاسی واقعات پیش آئے ہمیں ان سے

غرض نہیں۔ اس سلسلہ میں جو بات ہمارے کہنے اور آپ کے یاد رکھنے کی ہے وہ فقط اتنی ہے کہ اس انقلاب عظیم کی علت قریبہ صرف حکومت کی یہ کوشش تھی کہ ملک کو رواداری نصیب ہو۔ آج ہم کو یہ بات ذرا سی معلوم ہوتی ہے لیکن یاد رکھئے کہ سترھویں صدی کے رُبع آخر میں اسی بات کے پیچھے ایک تاجدار کو تخت حکومت سے دست بردار ہونا پڑا۔ یہ بے شبہ سچ ہے کہ رعایا میں برہمی کے اسباب پیشتر سے بھی موجود تھے لیکن انقلاب حکومت کی علت قریبہ صرف یہی واقعہ ہوا۔ ہمیں اس سے بھی انکار نہیں کہ جیمس کا یہ فرمان قانوناً ناجائز تھا لیکن وہ اس سے پیشتر صدہا فرامین جاری کر چکا تھا جو اس سے بدرجہا زائد ناجائز و ظالمانہ تھے۔ لیکن اُن پر کبھی کسی نے سانس تک نہیں لی تھی۔ "ظل سبحانی" اُسی وقت تک ظل سبحانی تھا، جب تک اقتدار کلیسا سے اس نے تعرّض نہ کیا تھا، لیکن جونہی اس کے احکام سے کلیسا کو اپنے اقتدار واثر کو صدمہ پہنچنے کا اندیشہ ہوا، وہی پیشانیاں جو تخت ظل سبحانی کا سجدہ اپنے لئے باعث نازش وافتخار سمجھتی تھی معاً بلند ہوگئیں اور ایسی سرکشانہ بلند ہوئیں کہ بالآخر تاج شاہی کو اپنی ٹھوکروں سے پامال کر کے چھوڑا۔ ۱۶۸۸ء کا یہ انقلاب بے شبہ تاریخی نتائج کے لحاظ سے ثابت ہے اور جبّارانہ استبداد کے مقابلہ میں جمہوریت کی فتح مبین کے لحاظ سے تاریخ عالم کا ایک یادگار واقعہ ہے۔ لیکن کیا ہمیں اس کے بانیوں کا بھی ممنون ہونا چاہیئے؟ کیا ہمیں خودغرضیوں اور اقتدار پسندیوں کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہیئے؟ دنیا میں کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ فاعل مجرم ہوتا ہے لیکن فعل ایک عمل حسنہ ہوتا ہے۔ اس کلیہ کی کوئی نظیر اس سے صحیح تر و واضح تر شاید ہی مل سکے۔

اس انقلاب حکومت اور خاندان اسٹورٹ سے (جو اب تک حکمراں تھا) حکومت نکل جانے سے جو مفید واہم اثرات تمدن انگلستان کو حاصل ہوئے وہ درحقیقت حد و شمار سے خارج ہیں۔ تاہم ہم چند نمایاں و عاجل نتائج کو ذیل میں درج کرتے ہیں:-

(۱) اختیارات شاہی محدود ہو گئے۔ یعنی اب بادشاہ بجائے مطلق الاختیار کے محدود الاختیار ہو گیا۔

(۲) مذہبی آزادی ملک کو حاصل ہو گئی۔ نئے تاجدار، ولیم ثالث کے تخت نشین ہوتے ہی جیمس کا بنایا ہوا قانون رواداری پاس ہو گیا (۱۶۸۹ء)

(۳) عدل و عدالت میں مستقل و نمایاں اصلاحات ہو گئیں۔

(۴) مطابع کا احتساب منسوخ ہو گیا۔

(۵) مالی مسائل و معاملات کا پھیلاؤ، جو ایک بہت بڑی حد تک اوہام شکنی میں معین ہوا۔

یہ ساری اصلاحات ولیم ثالث کے زمانہ کی یادگار ہیں۔ مگر ہمیں ان کی تفصیل سے اس وقت سروکار نہیں۔ سردست تو ہمیں صرف یہ دیکھنا ہے کہ جو کلیسائی قوت اس ہنگامہ کے برپا کرنے کا باعث ہوئی تھی۔ خود اس پر اس کا کیا اثر پڑا۔ اور یہی ہے بھی اس داستان کا دلچسپ ترین باب۔

جیمس کی عزل و اخراج کی لے ابھی پوری طرح بلند بھی نہیں ہونے پائی تھی اور ابھی وہ برسرِ حکومت تھا کہ پادری صاحبان کو اپنے طرزِ عمل کی غلطی محسوس ہونے لگی۔ اُس نے اپنے آخری زمانہ میں ان لوگوں کے ساتھ شفقت و تلطّف کا برتاؤ شروع کر دیا تھا۔ آرچ بشپ آف یارک کا عہدہ مدّت سے خالی چلا آرہا تھا، اور لوگوں کو یہ پورا یقین ہو چلا تھا کہ وہ اس پر یا تو کسی کیتھولک کا تقرر کرے گا اور یا اس منصب کا خود ضبط کر لے گا، لیکن اُس نے بالآخر ایک ایسے راسخ الاعتقاد پروٹسٹنٹ کا تقرر کر دیا جس سے لوگوں کے تمام اندیشے باطل ثابت ہو گئے۔ اسی زمانہ میں اُس نے بشپ آف لنڈن کو جو عرصہ سے معطل تھا پھر بحال کر دیا۔ اس کے علاوہ اور بھی اُس نے بہت سے مراعات پادریوں کے ساتھ کیے، اور بعض کی بابت مشہور ہوا

کہ وہ اپنی پریوی کونسل میں شامل کرے گا۔ ایک طرف یہ سب تھا۔ دوسری طرف پادریوں کو یہ بھی معلوم ہو چلا تھا کہ ولیم چنداں راسخ الاعتقاد نہیں بلکہ بہ حیثیت روادارئ عام کے حامی ہونے کے کلیسیا کے اقتدار کو نقصان پہنچانے والا ہے۔ نیز یہ کہ وہ فرقہٴ (پریسبٹیرین) کا ہمدرد ہے، جس کو کلیسیاے انگلستان اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھتا تھا پھر سب سے بڑھکر یہ کہ وہ عقیدہ نیابت الٰہی کا منکر تھا، جو اقتدار کلیسیا کا اصل منشا ہے۔

یہ سارے اخبار و روایات ملک میں گشت کر رہے ہیں اور لوگوں کی نگاہیں قدرتی طور پر اپنے روحانی مقتداؤں کی طرف اُٹھ رہی تھیں کہ باوجود انحلال قوّت کے اب بھی یہ طبقہ کافی اثر رکھتا تھا۔ لیکن ان حضرات پر خودغرضی کا جن ایسا سوار تھا کہ انھیں نہ اپنی بدنامی کا خوف ہوا نہ مصلحت بینی کام آئی بلکہ اپنے رہے سہے اقتدار کو بھی ہاتھ سے جاتے دیکھکر انھوں نے چھوٹے ہوئے تیر کو پھر واپس کرنا چاہا یعنی بغاوت کو جو تحریک خود ہی پھیلائی تھی، اب اُسے مسترد کرنے کی فکر میں ہوئے۔ ان میں اگر ذرا سی بھی ملک و قوم کی محبّت باقی ہوتی تو وہ نہایت خندہ جبینی سے ولیم کا استقبال کرتے جو بغیر کشت و خون کے ملک کو استبداد کے پنجہ سے نجات دلا رہا تھا۔ لیکن حد سے بڑھی ہوئی خودغرضی بڑے بڑے دانشمندوں کو اندھا کر دیتی ہے ان پادریوں نے ولیم کی مخالفت کا پورا تہیّہ کر لیا۔ کیا تاریخ تناقض عمل، بلکہ سراسر خودغرضی کی اس سے زیادہ کھُلی ہوئی مثالیں پیش کر سکتی ہے، کل تک جو بزرگانِ دین و ائمہ مذہب ولیم کے لئے فرش راہ بن رہے تھے۔ آج دفعتہً اس کے اعدءِ عدو ہو گئے۔ آرچ بشپ آف کنٹربری جو اپنے منصب کو قایم رکھنے کی طمع میں سب سے پہلے ولیم کو لبّیک کہنے پر آمادہ تھے اب علانیہ اس کے دشمن ہو گئے اور اسے فرماں روائے جائز تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ صور حضرت نے اس بلند آہنگی سے پھونکا کہ کلیسیائے انگلستان کے ہر در و دیوار اس کی صدائے بازگشت سے گونج اُٹھے۔ باتھ، ویلز

چسٹر، چچیسٹر، الائی، گلوسسٹر، ناروچ، پیٹر بارو، دورسٹر، ان سب مقامات کے بڑے بڑے پادریوں نے لاٹ پادری کی تائید کی اور چھوٹے درجہ کے پادریوں میں بھی تقریباً چھ سو نے ان کا ساتھ دیا۔

اور پھر لطف یہ کہ ان بزرگوں نے یہ جو کچھ کارروائی کی وہ اس بھونڈے پن سے کی کہ کسی کو بھی اب ان کی بے لوثی وخلوص نیت کا یقین کیا معنی، شک تک باقی نہ تھا، بلکہ ہر شخص کے دل پر ان کی انتہائی خودغرضیوں کا سکّہ بیٹھ گیا اور اس کا عملاً جو کچھ اثر ہوا وہ محتاج تصریح نہیں۔ اب ملک میں علانیہ دو باہم مخالف گروہ پیدا ہو گئے۔ ایک طرف ارباب کلیسیا کی جماعت اور ان کی خودغرضیاں تھیں۔ دوسری طرف عام قوم تھی۔ اس کشمکش کی حالت کے باوجود بھی اگر تخت کے لئے جنگ شروع نہیں ہوئی تو اسے کسی اور سبب پر محمول نہ کرنا۔ اس کی کھلی ہوئی وجہ اقتدار کلیسیا کی کمزوری تھی، جس باعث اب اُن میں مرنے کی ہمت ہی نہیں باقی رہی تھی۔ ورنہ انھوں نے اپنی والی کوئی بات ولیم کی مخالفت میں اُٹھا نہیں رکھی۔ یہ لوگ برابر جیمس کی واپسی کی تمنائیں کرتے، دعائیں مانگتے، اس کے لئے سازشیں کرتے۔ بلکہ اس سے مراسلت تک کرتے۔ حالانکہ یہ خوب جانتے تھے کہ اس کے قدم رکھنے کے معنی یہ ہیں کہ ملک میں ایک محاربہ عظیم برپا ہو جائے گا۔ بایںہمہ یہ اپنی کوششوں سے باز نہ آتے، گو اس کا نتیجہ عملاً صرف یہ ہوتا تھا کہ یہ اپنے تئیں جمہور کی نظر میں اور زیادہ غیر مقبول بلکہ مبغوض، بناتے جاتے تھے۔

لیکن ان کا نقصان اسی حد تک نہیں قایم رہتا تھا۔ جمہور کی نظر میں تو گرتے جاتے ہی تھے، اس سے بڑھکر یہ تھا کہ فرماں روائے وقت کی نافرمانی کر کے قدرتی طور پر عتاب شاہی کے بھی مورد ہوتے تھے اور اپنے مناصب سے برابر محروم ہوتے چلے جاتے تھے۔ یہ اپنی جگہ پر اس کا انتقام یوں لیتے تھے کہ اپنی معزولی کو تسلیم ہی نہیں

کرتے تھے بلکہ سرے سے اسی کے منکر تھے کہ دنیوی حکمراں کو کسی حیثیت سے روحانی فرماں رواؤں کے عزل و نصب کا اختیار حاصل ہے۔ چنانچہ جب آرچ بشپ آف کنٹربری کو معزولی کا حکم ملا تو اس نے معزول ہونے سے انکار کر دیا بلکہ اپنی جگہ پر بشپ آف نارچ لائیڈ، کو (جو خود بھی معزول شدہ پادری تھا) قایم مقام بنا کر اس عہدے سے دست بردار ہو گیا۔ اب اس ساری جماعت نے جیمس سے خفیہ مراسلت کرکے ایک گہری سازش کھڑی کی جس کی قوت کے اعتماد پر ان میں کا کوئی فرد اپنے تئیں معزول نہیں سمجھتا تھا۔ اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہوا کہ اکثر ایک ایک عہدہ پر دو دو شخص ممتاز ہونے کے مدعی رہتے تھے، ایک بادشاہ کا مقرر کردہ، اور دوسرا لاٹ پادری کا نامزد کردہ، گویا اب دنیاوی و روحانی حکومت کے علٰحدہ علیحدہ سلسلے قایم ہو گئے اور دونوں میں علانیہ کشمکش قایم ہو گئی اور اس کا حاصل کیا تھا؟ دنیا کی نظروں میں کلیسا کا استخفاف کلیسا کی سبکی۔

اس ضمن میں ایک لطیفہ سننے کے قابل ہے۔ کل بزرگان کلیسا میں تو اتنی ہمت ہو نہیں سکتی تھی کہ بادشاہ کی علانیہ مخالفت کرکے اپنے منصب، اپنے عہدے اور اپنی جاگیر سے دست بردار ہو بیٹھیں۔ اتنی جرأت تو صرف ایک تعداد قلیل کو ہو سکتی تھی۔ باقی حضرات نے تقیہ کی ایک صورت اختراع کی۔ ان کا ارشاد تھا کہ ہر شے کی طرح بادشاہ بھی دو تسلیم کئے جا سکتے ہیں، ایک موجود فی الخارج، ایک معہود فی الذہن۔ ہم بیعت گو امام حاضر کے ہاتھ پر کرتے ہیں، گو زبان سے اُسی کی اطاعت کا حلف اُٹھاتے ہیں، لیکن باطنی بیعت ہم امام غائب کے ہاتھ پر کرتے ہیں، اور دل سے اُسی کی روحانی قوت کی فرمان داری کریں گے۔ اس منطق کی عملی تفسیر یہ ہوتی تھی کہ وہی ہستیاں جو کلیسا کے میزول پر ولیم کے لئے دعائیں مانگتی تھیں، اپنے حجروں کے اندر جا کر جیمس کے حق میں سربسجود ہو جاتی تھیں۔ زمانہ کی ہوا کے اقتضا سے لوگ تو اب بات بات میں کلیسا کی گرفت کرنا چاہتے

تھے۔ جہاں اس کی طرف سے بے اعتباری و بدظنی کے صدہا اسباب اور تھے وہاں ایک سبب قوی ان حضرات کی روباہ کاری بھی ہوگئی۔

غرض سترّھویں صدی میں انحطاط و انحلال قوت کلیسیا کے جو متعدد و گوناگوں اسباب فراہم ہوگئے تھے اور جو بیشتر خود بزرگان کلیسیا ہی کے پیدا کردہ تھے اُن سے ناظرین اب بخوبی روشناس ہوگئے ہوں گے۔ اٹھارھویں صدی کے آغاز ہوتے ہی اس تحریک کو اور زیادہ وسعت و تقویت حاصل ہوگئی۔ کلیسیا کے ہاتھ میں ایک بڑا زبردست و قوی آلہ، ان کا سالانہ اجتماع تھا جہاں یکجا ہوکر یہ اپنی قوت کا پورا مظاہرہ کرتے تھے اپنے اقتدار کو ترقی دینے کے لئے باہمی مشورت سے طرح طرح کی تدابیر سوچتے اور اکثر اپنے مخالفین کو مرعوب کرنے میں کامیاب ہوجاتے تھے۔ مثلاً اگر کوئی کتاب ردّ تقلید میں لکھی گئی ہوتی تو اس کا ممنوع المطالعہ قرار دینا ہمیں منظور ہوتا تھا، وقس علیٰ ہذا مگر اٹھارھویں صدی کی آمد نے یہ زبردست حربہ بھی ان کے ہاتھ سے چھین لیا۔ ۱۶۸۶ء کے انقلاب حکومت کے چندہی سال بعد سے اس مجلس سالانہ کی کساد بازاری ہونے لگی یہاں تک کہ ۱۷۱۷ء میں اس کا آخری اجلاس ہوکر اس کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہوگیا بے شبہ ابھی چند سال ہوئے لوگوں نے اس کا از سرِ نو احیا رکیا ہے لیکن اب اس کا عدم وجود یکساں ہے۔ قالب مُردہ بس کبھی بھی جان پڑسکی ہے جو اسی میں پڑتی؟ در حقیقت اب بجز نام کے اور کوئی شے قدیم و جدید مجالس میں مشترک نہیں ہے۔ وہ زور، وہ عظمت، وہ زعم، وہ تشدد، وہ تقشف، وہ اثر، وہ اقتدار، وہ احتساب، غرض کوئی شے اب اُس قدیم مجلس کی یاد دلانے والی نہیں۔

اور اکیلی اس مجلس پر کیا موقوف ہے۔ انقلاب کے بعد سے ہر شے میں کلیسیا کی کس مپرسی نظر آنے لگی تھی۔ لوگ پہلے مذہبی مجالس و انجمنوں کی شرکت اپنے لئے باعث فخر و اعزاز سمجھتے تھے۔ مگر اب یہ حالت تھی کہ اس میں شرکت کا اشتیاق تو الگ رہا وہ ان سے

بچنے کی کوشش کرنے لگے تھے اور ان کے بجائے عام دنیوی جلسے اُن کے لئے کشش کی قوت رکھنے لگے تھے۔ اسی طرح خود بزرگان کلیسا کو بھی اپنی جگہ پر محسوس ہونے لگا کہ اقتدار و بیش بہا مشاہرہ کے تمام عہدے جو پندرھویں صدی تک گویا انھیں کے لئے مخصوص تھے اب ایک ایک کر کے ان کے ہاتھ سے نکلتے چلے جا رہے ہیں۔ یہ حالت ایک دن میں نہیں پیدا ہوئی بلکہ عرصہ سے تدریجاً پیدا ہو چلی تھی۔ چنانچہ سترھویں صدی سے کوئی پادری لارڈ چانسلر کے عہدہ پر سرافراز نہیں ہوا۔ اور اٹھارھویں صدی سے کسی بڑے عہدہ پر ان کا تقرر نہیں ہوا۔ انتظامی عہدوں کو جانے دیجے۔ اور تو اور خود پارلیمنٹ میں ان بزرگوں کی کتنی تعداد ہے؟ ایک وہ زمانہ تھا جب دارالامراء میں ان کی تعداد پوری نصف ہوتی تھی۔ اٹھارھویں صدی میں یہ ان کا تناسب ۱/۸ رہ گیا یہاں تک کہ ہوتے ہوتے آج یعنی اُنیسویں صدی کے وسط میں ۱/۱۴ رہ گیا ہے اور روحانی قوت کا یہ انحطاط ترقی تمدن کی ایک خاص علامت دارالعوام نے اس سے بھی زیادہ ترقی کی۔ اس نے ۱۸۰۱ء سے سرے سے اِن لوگوں کا منتخب کرنا ہی باضابطہ طور پر بند کر دیا۔ اور مجھے تو یقین ہے کہ دارالامراء میں ان کو بھی وہ دن عنقریب پیش آنے والا ہے کہ یہ لوگ بہ لحاظ عادات و خصائل، مذاق و افتاد طبیعت، روایات، غرض ہر حیثیت سے سیاسی زندگی میں نیابت و نمایندگی کے ناقابل ہیں۔

عین اس زمانہ میں جبکہ کلیسا کی قوت ان صدمات سے رخصت ہوئی اُس پر ایک نئے اور خاص قسم کا حملہ اور ہوا۔ جو فی الاصل تو غیر متوقع نہ تھا لیکن اُس وقت لوگوں کو ایسا معلوم ضرور ہوا۔ یہ حملہ عقل و علم کی جانب سے نہیں بلکہ خود مذہب ہی کے ایک گوشہ سے ہوا۔ میرا مطلب روحانی انقلاب سے ہے۔ جو سیاسی انقلاب کا ایک لازمی ضمیمہ تھا۔ غیر مقلدین اتنی مدت دراز سے کلیسائے انگلستان کے ظلم و جور سہتے چلے آ رہے

تھے کہ ان میں برداشت کی طاقت نہیں باقی رہ گئی تھی اور اب انتقام گیری کے لئے وہ صرف موقع کے منتظر تھے۔ جیمس کے عہد حکومت میں ان پر جو ستم ایجاد یاں روا رکھی گئی تھیں ان کے زخم ابھی بھرنے بھی نہ پائے تھے کہ ولیم کی وفات کے بعد ان کی جانشین ملکہ این نے پھر شدید متعصبانہ قوانین جاری کر کے ان کے زخموں پر نمک چھڑک دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ادھر ملکہ این کی آنکھیں بند ہوئیں اور اُدھر مظلوموں کا شعلۂ انتقام بھڑکا اور مظلومانہ کینہ کی پوری قوت کے ساتھ بھڑکا۔ اٹھارھویں صدی کے دو قابل ترین اشخاص یعنی ہیوایٹ فیلڈ جو مذہبی گروہ میں سے ہی پہلا خطیب ہوا ہے اور وہیلی جو مذہبی حلقہ میں سب سے پہلا مُدبّر ہوا ہے ایک نئے نظام دینی کے شارع ہوئے، جیسے کلیسائے انگلستان سے اسی قسم کا تعلق تھا۔ جیسا کلیسائی انگلستان کو کلیسائی روم سے تھا۔ گویا اس طرح پر یہ دوسری مذہبی اصلاح ہوئی۔ پہلی اصلاح وہ تھی جب سولھویں صدی میں انگریزی کلیسا نے رومہ کی غلامی سے آزادی حاصل کی تھی اور دوسری اصلاح یہ ہوئی جب اٹھارھویں صدی میں ان غیر مقلدوں نے کلیسائے انگلستان کی غلامی سے آزادی حاصل کی۔ البتہ فرق یہ تھا کہ یہ نئے غیر مقلدین اپنے علمی وقار کو عرصہ تک قایم نہ رکھ سکے حالانکہ پروٹسٹنٹ مصلحین نے دماغی حیثیت سے بھی اپنا سکہ ملک پر بٹھا دیا تھا مگر یہ دماغی انحطاط جس کا ایک مظہر یہ ہی کہ ایڈم کلارک کے بعد سے ایک بھی ایسا عالم اُن میں نہ پیدا ہو سکا جس کا علم و فضل تمام یورپ میں مسلّم ہوتا غالباً کچھ اسی فرقہ کے ساتھ مخصوص نہیں ہی بلکہ تمام فرقوں میں مشترک ہی اور اس عام ذہنی انحطاط میں سب فرقہ برابر کے حصّہ دار ہیں۔ خیر یہ جو کچھ بھی ہو اس میں شبہ نہیں کہ جتنا نقصان اصلاح اوّل نے کلیسائے رومہ کو پہنچایا تھا اس سے بدرجہا زاید نقصان اس اصلاح ثانی نے کلیسائے انگلستان کو پہنچایا۔ نہ صرف بہ لحاظ تعداد جس کی یہ حالت ہے،

کہ ولیم کے عہد میں مقلدین و غیر مقلدین میں تقریباً ۳۲ اور ۱ کی نسبت تھی اس کے بعد ۴۸ سال بعد جو حساب لگایا تو صرف ۴ اور ایک کا تناسب رہ گیا تھا یہاں تک کہ ۳۱ مارچ ۱۸۵۱ء کو جو مردم شماری کی گئی اُس کی رو سے مقلدین و غیر مقلدین میں صرف ۱½ اور ۱ کی نسبت ہے اور اگر یہی شرح رہی تو مجھے اُمید ہے کہ ایک صدی کے بعد مقلدین کا نام و نشان بھی نہ رہے گا۔ ہاں تو اس تحریک نے اپنے حریفوں کو زک صرف اسی حیثیت سے نہیں دی کہ ان کی قطاروں کو ہلکا کر دیا بلکہ حکومت کے مذہب کے خلاف فرقۂ پروٹسٹنٹ ہی کی ایک شاخ کا کھُلّم کھلا قائم ہو جانا اور اپنے عقاید کی تبلیغ و اشاعت کرنا بجائے خود ایک خطرناک امر ہے خصوصاً ایسی حالت میں جب غیر مقلدین کی یہ جماعت بہ لحاظ اپنے نظام، انضباط اور اپنے تعلیمات کے اعلان عام کے غیر معمولی شہرت رکھتا ہو۔

لیکن یہ واقعات بھی باایں اہمیت و دلچسپی بجائے خود پوری اہمیت نہیں رکھتے بلکہ اس عظیم الشان تحریک کا صرف ایک مظہر تھے جس کا مدعا کلیسا کی اقتدار شکنی اور قوم کو مذہبی رواداری دلانا تھی اور رواداری بھی ایسی جو گو بجائے خود کامل نہیں کہی جا سکتی تاہم نسبتہً دوسری قوموں سے یقیناً بدرجہا زاید تھی۔ اس تحریک کا ایک مظہر تو یہ تھا جو ابھی بیان ہو چکا۔ دیگر مظاہرین سے دو اور چیزیں خصوصیت کے ساتھ اہم تھیں۔ ایک مذہب و اخلاق کی تفریق دوسرے مذہب و سیاست کی تفریق۔ مذہب سے اخلاق کی علٰحدگی تو سترھویں صدی ہی کے آخر سے شروع ہو گئی تھی اور سیاست نے اپنے تئیں اٹھارھویں صدی کے وسط سے علٰحدہ کرنا شروع کر دیا اور لطف یہ کہ ان دو تحریکات کا آغاز مقتدایان کلیسا ہی کے ہاتھوں ہوا۔ اخلاقیات خالص یعنی بلا آمیزش مذہب کی تدوین کا فخر کمبرلینڈ بشپ آف پٹربارو کو حاصل ہے اور اس حقیقت کی تعلیم و تلقین کا سہرا واربرٹن

بشپ آف گلوسٹر کے سر ہے کہ حکومت کو مذاہب کی حقانیت و بطالت سے کوئی سروکار نہیں بلکہ صرف ان کی حیثیت افادی کو پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ دونوں اصول محض تحریری و نظری نہیں تھے بلکہ مل برے، ہیوم، پیلی، بنتھم و جیمس مل یہ سب کمبرلینڈ ہی کی تخم ریزی کے برگ و بار ہیں، اور وار برٹن کی تعلیمات تو اس قدر عام ہو گئیں کہ آج ہر در و دیوار سے انھیں کی صدائے بازگشت آ رہی ہے اور وہ لوگ جو آج سے نصف صدی پیشتر اس تصور سے لرز اُٹھتے آج بے دھڑک ان کا اظہار کر رہے ہیں کوئی کہاں تک گنائے۔ صدہا اسباب و موثرات اس کی تائید میں پیدا ہو گئے اور عرصہ تک پیدا ہوتے رہے۔ اس زمانہ میں جو صدہا مناظرے خود کلیسیا کے اندر تفسیر انجیل سے متعلق چھڑ گئے وہ بھی سب کے سب ایسے تھے کہ بالآخر اُن سے روشن خیالی کی فتح اور اوہام شکنی ہی ہوتی گئی پھر گبن کی تاریخی تحقیقات اور ارضیات کے محقق مسائل متعلق بہ طبقات الارض سے جنھوں نے انجیلی طریق آفرینش عام کا واضح بطلان کر دیا اقتدار کلیسیا کو جو دھکّا پہنچا وہ میری تصریح کا محتاج نہیں۔ اور پھر یہ تمام مختلف و کثیر التعداد واقعات پے بہ پے اس تواتر سے اور اتنی مدّت تک پیش آتے رہے کہ اقتدار کلیسیا کی سر بفلک عمارت بالکل بیٹھ گئی۔ لیکن اس نتیجہ کو پوری طرح پر سمجھنے کے لئے بعض معاصرانہ حالات کا علم بھی ضروری ہے۔

روشن خیالی یہ تمام تدابیر تقریباً بے اثر رہتیں اور اوہام پرستی بدستور قایم رہتی اگر اٹھارھویں صدی خصوصیات ذیل کی جامع نہ ہوتی جو اس حقیقت کی ایک کھُلی ہوئی اور قطعی دلیل ہیں کہ اب روشن خیالی اہل فضل و کمال کے دائرہ میں مخصوص نہیں رہی تھی بلکہ ساری قوم پر چھا گئی تھی۔

(۱) تحصیل علم کی خواہش عام ہو گئی۔

(۲) عوام و مزدوری پیشہ لوگوں کے لئے ایسے مدارس و مکاتب قایم ہوئے جو

اتوار کو سکتے تھے تاکہ وہ ان سے فائدہ اٹھا سکیں (غالباً ۱۷۶۵ء سے)

(۳) انھیں کے استفادہ کے لئے اتوار کے روز اخبارات شائع ہونے لگے۔ (غالباً ۱۸۰۰ء سے)

(۴) عام کتب خانے قایم ہونے لگے (اٹھارویں صدی کے وسط سے)

(۵) مطابع لنڈن سے نکل کر باہر بھی جاری ہونے لگے۔

(۶) لوگوں نے سائنس کے مختلف عنوانات پر آسان وسلیس زبان میں رسالے لکھنا شروع کئے۔

(۷) انسائیکلوپیڈیاؤں کی اشاعت سے لوگوں کو تمام متفرق و مختلف النوع معلومات یکجا حاصل ہونے لگیں۔

(۸) علمی ماہوار رسایل وجرائد شائع ہونے لگے۔

(۹) مختلف دارالاشاعت کتب قایم ہونے لگے۔

(۱۰) عام اور کاروباری لوگ اپنی اپنی علمی انجمنیں، کلب، اور دارالمباحثہ قایم کرنے لگے۔

(۱۱) ۱۷۶۹ء سے ایسے جلسوں کا انعقاد ہونے لگا، جن کا مقصد جمہورکو ان کے سیاسی حقوق کی تعلیم دینا تھا۔

(۱۲) روزانہ اخبارات نے اہم عدالتی کارروائیاں اور سیاسیات پر بحث شروع کردی۔ اسے دارالامرار دارالعوام، اور خود تخت و تاج نے روکنا چاہا لیکن بالآخر ناکام رہے۔

(۱۳) شخصی نیابت ونمایندگی کے مسئلہ پر جمہور نے زور دینا شروع کیا۔

(۱۴) سب سے بڑھکر یہ کہ جمہور کو مذہبی مسائل کے فیصلہ کا حق حاصل ہو گیا اور اس کی پہلی نظیر قایم ہوگئی۔

(۱۵) علمی زندگی میں خاص تغیر یہ ہوا کہ مصنفین کا انداز تحریر بالکل بدل گیا۔ قدیم طرز تحریر کو اپنی پیچیدہ ترکیبوں رنگین عبارتوں مغلق الفاظ اور ژولیدہ بیانی پر ناز تھا، جسے عام افراد مطلق نہیں سمجھ سکتے تھے۔ بخلاف اس کے جدید اسلوب ادا کا اصلی زیور سادگی قرار پایا۔ عبارت زود فہم، سلیس، و سادہ ہوتی گئی اور روزمرہ کی زبان اعلیٰ عالمانہ تصانیف میں بھی استعمال ہونے لگی۔

اٹھارھویں صدی کی ان خصوصیات کا نتیجہ یہ ہوا کہ علوم کی اشاعت عام ہوگئی اور حکمت و معارف کے جو حقایق اب تک علم سینہ سمجھے جاتے تھے اور جنھیں قدماء نے سربمہر رکھا تھا اب وقف عام ہوگئے، اور عوام و خواص سب ان سے یکساں مستفید ہونے لگے۔ علمی کتابوں کی اشاعت اب عام ہوگئی اور ان کے پڑھنے والے اور قدر کرنے والے تعداد کثیر میں پیدا ہوگئے۔ اس کا ایک اہم اثر یہ ہوا کہ مصنفین جو اب تک تمام تر امراء و روساء کی فیاضیوں پر تکیہ کئے ہوئے تھے اب ان کی سرپرستی سے مستغنی ہوکر آزادانہ اپنے خیالات کی اشاعت کرنے لگے۔ رئیسوں کی رضاجوئی تقریباً ہمیشہ انسان کو مجبوراً خوشامد و تملق پر لے جاتی ہے جو آزادیٔ تحقیق کے بالکل منافی ہے۔ مگر اب جبکہ یہ قید اُٹھ گئی اہلِ تصنیف علانیہ اپنی تحقیقات کی اشاعت کرنے لگے اور بجائے ہر جدید شے سے نفرت کرنے اور ہر قدیم شے کی پرستاری کرنے کے نئے نئے حقایق و معارف کا انکشاف کرنے لگے۔

اس صورت حال کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ لوگوں میں خود بُرے بھلے کھوٹے کھرے کی شناخت ہوگئی نحن رجالٌ و ھم رجال کی حقیقت اُن پر آئینہ ہوگئی۔ انھیں یہ صاف نظر آنے لگا کہ وہ بھی انھیں جیسے انسان ہیں، جیسے اُن کے مقتدا ہوتے ہیں اور اب وہ بے دھڑک اُن مسایل پر رائے زنی کرنے لگے، جنھیں اب تک اپنے فہم سے مافوق سمجھتے تھے۔ اب انھیں یہ بھی نظر آیا کہ مذہب و سیاست دونوں میں جو معرکہ آرائی

گرم ہے اس میں ایک فریق جہالت اوہام تقلید و تعصب کا حامی ہے اور دوسرا علم، عقل، اجتہاد، و روشن خیالی کا موید ہے اور ہم دو فریق کے درمیان ما بہ النزاع چند واقعات نہیں، بلکہ اصول اساسی ہیں۔ اٹھارھویں صدی کے آغاز و وسط میں یہ تحریک بڑے زور شور سے جاری رہی اور اگر اس کی ترقی کی بھی رفتار برقرار رہتی تو کچھ ہی روز بعد کلیسیا و حکومت کی اصلاح تکمیل ہو جاتی۔ لیکن بدقسمتی سے وسط صدی کے بعد ہی سیاسی انقلابات ایسے اہم و عظیم الشان پیش آنے لگے جنھوں نے اس ہوا کا رُخ ہی پھیر دیا اور وہ تو کہیے کہ انگلستان ہی ایسا تھا جو اس ٹکر کو سنبھال لے گیا ورنہ کسی دوسری قوم کو اگر ایسی زبردست مخالفت کا سامنا کرنا ہوتا تو اس کی ساری ترقی تمدن کالعدم ہی ہو گئی ہوتی۔ میں اس سیاسی انقلاب کو جو تمدنی حیثیت سے سرتاسر ایک رجعت پسندانہ تحریک تھی کسی قدر تفصیل سے بیان کرنا چاہتا ہوں کہ بغیر اس کے ذہن نشین کیے آیندہ واقعات پوری طرح سمجھ میں نہ آئیں گے۔

اسے دراصل خوش نصیبی سے تعبیر کرنا چاہیے کہ این کے بعد جو دو فرماں روا یکے بعد دیگرے پچاس سال تک سریر آرائے حکومت رہے یعنی جارج اوّل و جارج ثانی وہ اس ملک کے رسم و رواج، کیفیات و حالات سے بالکل ناآشنا تھے اور خیر جارج اوّل تو انگریزی زبان ٹوٹی پھوٹی بول بھی لیتا تھا مگر جارج ثانی اتنی بھی نہیں جانتا تھا۔ ایسے حکمرانوں کو ظاہر ہے کہ اپنی محکوم قوم سے کسی قسم کی ہمدردی نہیں ہو سکتی تھی اور نہ رعایا انھیں عزیز و محبوب رکھ سکتی ہے۔ اس بنا پر یہ لوگ باوجود استبداد و خود مختاری پسند ہونے کے اپنے اثر کو کچھ زیادہ وسیع و مضبوط نہ کر سکے اور پھر اجنبی ہونے کے باعث انھیں کلیسائے انگلستان کے ساتھ یوں بھی اس کے اقتدار گم گشتہ کے واپس دلانے میں کسی خاص ہمدردی کی توقع نہیں ہو سکتی تھی اس پر طرّہ یہ ہوا کہ متعدد

بزرگان کلیسا نے اپنے تمرد و سرکشی سے ان کی ہمدردیاں اور اپنی طرف سے ہٹا دیں۔ ان وجوہ سے یہ نصف صدی ترقی پزیر گروہ کو بہترین فرصت کی مل گئی۔ بہتر سے بہتر قوانین اس زمانہ میں پاس ہوتے رہے اور قدیم رجعت پسند گروہ کو باوجود تائید سلطانی کے انتظام حکومت میں کسی طرح غلبہ حاصل نہ ہو سکا۔

لیکن جارج ثانی کی وفات کے ساتھ ہی یہ پانسہ پلٹ گیا۔ نیا تاجدار جارج ثالث انگلستان ہی کی سرزمین پر پیدا ہوا تھا اسی کو اپنا اصلی وطن سمجھتا تھا انگریزی گویا اس کی مادری زبان تھی اسی کے ساتھ یہ بھی ہوا کہ عین اسی زمانہ میں قدیم خاندان کا شہزادہ چارلس اسٹوارٹ جو مدت سے تخت انگلستان کا دعویدار چلا آتا تھا وفات پا گیا اور اس طرح اب کسی رقیب کا بھی خوف باقی نہ رہ جانے سے حضرت کی جرأت اور بڑھ گئی۔ اب وہ تاج کی مطلق الاختیاری کی دقیانوسی و فرسودہ تعلیمات جنھیں مدت ہوئی انقلاب مٹا چکا تھا دوبارہ زندہ ہوئیں اور علانیہ اشاعت پانے لگیں۔ خود کلیسا نے یہ دیکھکر کہ خاندان اسٹورٹ کی تائید قطعاً لاحاصل ہے اب اپنی حمایت و اعانت کا رُخ خاندان ہنور کی جانب پھیر دیا اور شاہ جدید کے فضائل و مناقب اس کے ذاتی محاسن اس کے ورع و تقویٰ اور سب سے بڑھکر کلیسا کے ساتھ اُس کی خوش عقیدگی کے داستان سرائیوں سے ہر گرجا کے منبر و محراب گونج اُٹھے۔ نیتجہ یہ ہوا کہ تاج و کلیسا کے درمیان اتحاد و اتفاق کا ایسا مضبوط رشتہ قایم ہو گیا جس کی نظیر چارلس اوّل کے بعد اور کسی زمانہ میں نہیں ملتی قدیم حزب المحافظین مدت کی گمنامی کے بعد پھر اُبھرا۔ اور اُمراء کو شکست دے کر پھر برسرِ حکومت ہو گیا۔ بڑی مدد رجعت پسندوں کو خود شاہ جارج ثالث کی ذاتی سیرت سے پہنچی۔ یہ آپ کی ذات، استبداد و وہم پرستی، دونوں کی جامع تھی۔ علوم و فنون سے آپ کو کسی طرح کی نہ واقفیت تھی، نہ مذاق تھا۔ وسعت معلومات کا

یہ عالم تھا کہ سوا اپنی سلطنت کے اور کہیں کے جغرافیہ و مالیہ کے مبادیات تک سے حضرت کا دماغ بیگانہ تھا اور خود اپنے ہی ملک کے حالات سے آپ کو بالکل ہی اچٹتی سی واقفیت تھی۔ اس بادشاہ کی خانگی و سیاسی زندگی کا ایک خط وخال تاریخ میں محفوظ ہے اور انھیں دیکھکر ہر شخص اس کا اطمینان کر سکتا ہے کہ حضرت ظلِّ سُبحانی کسی علم وفن یا خود فرض جہانبانی سے واقفیت حاصل کرنے کی معصیت کے کبھی مرتکب نہ ہوئے تھے۔

اس دل و دماغ کے جہاں پناہ سے جو توقعات قایم کئے جا سکتے تھے وہ جی بھر کے پورے ہوئے۔ تخت کے گرد و پیش ہر وقت قدامت پرستوں اور دقیانوسی خیال والوں کا حلقہ رہتا تھا، یہاں تک کہ ساٹھ سال کی طویل مدّت حکمرانی میں صرف پٹ کی ایک استثنائی مثال ہے جو بایں قابلیت وکمال اراکین سلطنت میں داخل ہو سکا لیکن یہ تماشہ بھی دیکھنے کے لایق ہے کہ پٹ اتنے دنوں نباہ کیونکر کر سکا۔ اس شخص نے جس زور سے قلمدان وزارت ہاتھ میں لیا حریت و آزادی کے سارے اصول پس پشت ڈال دئے اور فراخ دلی و وسیع الخیالی کے سبق جو دوسروں کو پڑھاتا تھا انھیں خود بخیر بھُلا بیٹھا۔ جارج عدو اصلاح تھا لیکن اُسے خود کسی جد وجہد کی ضرورت نہیں ہوئی ولیم پٹ اُس کا کمربستہ غلام اس کی فرماں برداری کے لئے حاضر تھا۔ اُس نے اپنے جہاں پناہ کی تائید کرنا کافی نہیں خیال کیا بلکہ اصلاح پسندوں کو دار پر چڑھانا بھی شروع کر دیا چنانچہ اس جماعت کے متعدد ارکان ولیم پٹ کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ جارج رسم غلامی کا حامی و موید تھا لیکن اُسے خود کبھی اس کی تائید میں سعی نہیں کرنا پڑی اس لئے ابن الوقت ولیم پٹ اپنے آقائے نامدار کی خدمت گزاری کے لئے کمربستہ ہو گیا۔ جارج اپنی جہالت و نا واقفیت کی بنا پر فرانس کا دشمن تھا اس کا اشارہ پاتے ہی وزارت اعظم کی کٹھ پتلی نے حرکت شروع کر دی۔ ولیم پٹ نے اپنے ضمیر کے خلاف فرانس سے جنگ چھیڑ دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلطنت قرض کے بار سے سرتا پا لد گئی اور خود حکومت خطرہ میں آ گئی

لیکن باوجود اس تعبدانہ اطاعت و فرماں برداری کی جب پٹ نے اپنی وفات سے چند سال پیشتر آیرلینڈ کو کچھ حقوق دینا چاہیے تو فوراً وزارت سے معزول کردیا گیا اور تمام ارکان دربار نے متفق اللفظ ہو کر طعنہ زنی شروع کردی کہ خادم ہو کر آقا کی مخالفت کرتا ہے! اور پھر کچھ عرصہ کے بعد جب پٹ نے از سر نو برسر اقتدار ہونا چاہا تو صرف اسی شرط پر دوبارہ بستہ وزارت تفویض ہوا کہ آیرلینڈ کے حقوق کے معاملہ میں لب کشائی نہ کرنا اور اس طرح یہ قابل ترین شخص ایک نظیر قایم کر گیا کہ آزاد حکومت کا وزیر تک بادشاہ کی غلامی کرسکتا ہے۔

لیکن ہر قابل شخص تو ولیم پٹ کی طرح غلامی نہیں کرسکتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے وزرا اور ارکان سلطنت بدترین اشخاص مقرر ہوتے تھے اور بادشاہ چن چن کر ایسے ہی لوگوں کا تقرر کرتا تھا۔ لارڈ چیتھم (یہ ولیم پٹ کا والد تھا) جو جارج ثانی کے زمانہ میں کامیاب ترین وزیر تھا اور جس کی اہلیت و قابلیت نے انگلستان کی شہرت کو تمام عالم میں پھیلا دیا تھا، جارج ثالث کو اس کے نام تک سے نفرت تھی۔ اور ایسی شدید نفرت جو جنوں کے حد تک پہنچ گئی تھی یہ کیوں؟ صرف اس لئے کہ یہ مشہور مدبر حقوق رعایا کا حامی، حریت دوست، اور استبداد شکن تھا۔ فاکس اٹھارھویں صدی کا بزرگ ترین مدبر ہوا ہے جو ممالک غیر کی سیاسیات پر عبور کامل رکھنے کے ساتھ ہی نہایت ہی معقول پسند و خوش مزاج واقع ہوا تھا لیکن بایںہمہ جارج کو اس سے اس درجہ نفرت ہوئی کہ پریوی کونسل کے عہدہ داروں کی فہرست سے اس کا نام اپنے ہاتھ سے خارج کردیا اور بہ کمال غیظ و غضب یہ ارشاد ہوا کہ میں تخت و تاج سے دست بردار ہونے پر تیار رہوں لیکن فاکس کو انتظام سلطنت میں شریک ہونے کا روادار نہیں ہوسکتا۔ اس برہمی کا کوئی سبب؟ یہ اور صرف یہ کہ فاکس بھی دینی و سیاسی آزادی و رواداری کا حامی تھا۔

[illegible]

پارلیمنٹ مرکب ہے، دارالامراء و دارالعوام سے۔ دارالامراء ہمیشہ سے آزادی و روشن خیالی میں نسبتہً ممتاز چلا آتا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارے موجودہ معیار تعصب و وہم پرستیوں میں دونوں گرفتار ہوتے تھے تاہم طبقۂ امراء میں نسبتہً تعلیم یافتہ و شریفانہ اخلاق کے لوگ ہوتے تھے۔ بہ خلاف اس کے عوام کی تعلیم چونکہ کچھ بھی نہیں ہوتی تھی اور تربیت ایسی گری ہوتی تھی کہ دناوت، پستی، و تنگ نظری ان میں لازمی طور سے آجاتی تھی اس لئے دارالعوام تعصب و تاریک خیالی کا مرکز تھا اور پھر اگر کہیں روشن خیالی پائی جاتی تھی تو دارالامراء ہی میں۔ ہومرس و والپول جو اٹھارھویں صدی کے آغاز و وسط میں رواداری کے علم بردار ہوئے ہیں، دارالامراء ہی کے ارکان تھے اور یہ تو بارہا پیش آیا کہ دارالعوام نے اگر کوئی بیجا تشدد یا تعصب کے قوانین پاس کردئے تو دارالامراء نے یا تو انھیں سرے سے مسترد کردیا اور یا ان میں کافی ترمیم کردی۔ یہ کیفیت شروع سے جارج ثانی کی وفات تک رہی۔

لیکن جارج ثالث کے اورنگ نشین ہوتے ہی صورت حال بالکل برعکس ہوگئی اب دارالامراء کی صفیں بڑے بڑے مصنفوں، خطیبوں، و مدبروں سے یکسر خالی ہونے لگیں اور جارج چھانٹ چھانٹ کر ایسے لوگوں کا تقرر کرنے لگا جن کی سفارش کرنے والی کوئی شے بجز دولت یا استبدادپسندی کے نہیں ہوتی تھی۔ اب یا تو وہ لوگ مقرر ہوتے ہیں جن کی دیہات میں زمینداریاں و جائدادیں ہوتی تھیں اور یا ہر وہ قانون پیشہ حضرات جو حریت کشی اور استبدادپسندی میں خاص امتیاز رکھتے تھے تجارت پیشہ اصحاب و مالکان بنک سترھویں صدی کے بعد سے ملک میں واقعتہً ایک خاص اثر و اقتدار رکھنے لگے تھے اور اس کے علاوہ بھی اپنے فواید ذاتی کی

بنا پر دارالامراء میں شرکت کا پورا حق رکھتے تھے اس سے بالقصد علیحدہ رکھے جانے لگے۔ نتیجہ ہوا کہ چندہی روز میں شعلہ خاکستر میں تبدیل ہوگیا اور دارالامراء بجائے آزادی و روشن خیالی کے مرکز ہونے کے جہالت، تعصب و تنگ خیالی کا اکھاڑہ ہوکر رہ گیا۔

خصوصیات بالا منجملہ اُن متعدد علامات کے ہیں جن سے اس زمانہ کے انگلستان کے سیاسی انحطاط کا اندازہ کیا جاسکتا ہے اور یہ انحطاط اس لئے اور بھی حیرت انگیز نظر آتا ہے کہ یہ ملک کے عام ذہنی و تمدنی ارتقار کے علی الرغم ہو رہا تھا۔ اس حقیقت کی گرہ تو ہم کہیں آگے چل کر کھولیں گے کہ کچھ روز کے بعد اس عام ارتقار نے سیاسی انحطاط کی رفتار کیونکر روک دی تاہم ایک شے کا ذکر تو اسی مقام پر ضروری ہے جس سے ایک طرف تو رفتار زمانہ کی جہت متعیّن کرنے میں مدد ملے گی۔ دوسری طرف اعاظم رجال عالم کے ایک ممتاز فرد کی سیرت پر روشنی پڑے گی۔ اس سے ہماری مراد ایڈمنڈ برک کے تذکرہ سے ہے جو انگلستان میں بکین کے بعد سے بڑا حکیم سیاست، اور دنیا کا ایک بزرگ ترین انسان ہوا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ بغیر برک کے تذکرہ کے جارج سوم کے عہد کی تاریخ سرسری طور پر بھی مکمل نہیں کہی جاسکتی۔ یہ عجیب و غریب شخص نہ صرف سیاسیات کے اصول و فروع پر حاوی تھا بلکہ کہہ سکتے ہیں کہ جملہ علوم و فنون کی ایک زندہ دائرۃ المعارف تھا۔ اس کے بڑے بڑے نامور معاصرین اس کے کمالات کی جامعیت کے قایل تھے اور ہمیں تو رابرٹ ہال کا یہ قول حرف بہ حرف سچ معلوم ہوتا ہے کہ

"برک کے کمالات لاتعد ولاتحصیٰ تھے۔ اس کا دماغ عامۃ الورود تھا اور وہ ہر علم و فن سے بہرہ رکھتا تھا"

قانون و فنون لطیفہ بظاہر باہم متناقض نظر آتے ہیں لیکن برک کی ذات ان دونوں

کی جامع تھی چنانچہ جہاں ایک طرف وکلا اہلِ فن کی جماعت اسے اپنا پیرومرشد مانتی تھی وہاں دوسری طرف اہلِ صناعت بھی اُسے اپنا ہادی و رہبر تسلیم کرتے تھے تاریخ وعلم الالسنہ کو ہم بالکل جدید علم سمجھتے ہیں لیکن برک ان علوم میں امام کا درجہ رکھتا تھا اقتصادیات کا آدم ہم اپنے خیال میں آدم اسمتھ کو سمجھے ہوئے ہیں حالانکہ خود آدم اسمتھ کو اعتراف ہے کہ جب وہ لنڈن آیا تو یہ دیکھکر نقشِ حیرت ہو گیا کہ جن نتائج پر وہ سالہا سال کی مشقت وریاضت کے بعد پہنچا تھا اور جن نظریات کو وہ تمام تر اپنے اجتہاد فکری کے ثمرات سمجھ رہا تھا برک وہ سب منازل طے کرچکا تھا۔ سب سے بڑھکر یہ کہ وہ سائنس کے متعدد اصناف کا بھی پورا عالم تھا۔ اور یہ تمام علوم اس کے خزانۂ دماغ میں صرف محفوظ ہی نہ تھے بلکہ ایک خاص خوش سلیقگی کے ساتھ مرتب تھے۔ نظم و ترتیب اس کے ذہن کا خاص جوہر تھی۔ گویا اس کے دماغ میں متعدد خانے تھے اور ہر خانہ میں ایک ایک علم موجود تھا جس میں سے وہ جب چاہتا کام کے لئے نکال سکتا تھا۔

پھر لطف یہ ہے کہ تدبر، عاقبت اندیشی وعملیت سے گویا اس کا خمیر تھا باوجود سخت اصولی و فلسفی ہونے کے وہ سیاسیات میں یہ کبھی نہیں کرتا تھا کہ لفظی اصول کے پیچھے عملی ضروریات کا خون کردے۔ وہ عمل کو ہمیشہ اصول نظریات پر مقدم رکھتا تھا۔ وہ اس حقیقت کو خوب سمجھے ہوئے تھا کہ سیاسیات کا مقصود حقیقت شناسی نہیں بلکہ مصلحت بینی ہے وہ اس رمز پر پوری طرح مطلع تھا کہ فلسفۂ سیاست تو خود تجربہ ومشاہدہ سے استقراءً ماخوذ ہے تو اگر کبھی تجربہ واصول میں تناقض ہو، تو بجائے اس کے ہم ضد سے اصول پر اڑے رہیں اصول کو جدید تجربات کے مطابق بنانا چاہیئے۔ اس کو دوسرے پیرایہ میں یوں سمجھئے کہ سیاسیات نظری کی بنا زیادہ سے زیادہ عقل انسانی ہی ہو سکتی ہے حالانکہ سیاسیات عملی کو جذبات انسانی سے سابقہ رہتا ہے۔ اس بنا پر ایک دانشمند مُدبّر کو کبھی وسایل کو اصلی مقاصد پر مقدم نہ سمجھنا چاہیئے۔ اس کا اصلی فرض

ملک کی خواہشات کے مطابق اس کی راحت رسانی کا سامان کرنا ہے نہ یہ کہ اپنے ذاتی خیالات کا ملک کو تابع بنانا۔

ان خصایص اور اپنی غیر معمولی قوّت کے ساتھ برک کی ذات ہماری سیاسی تاریخ میں ایک ناقابل فراموش اہمیت رکھتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ اس سے پیشتر بھی بعض مُدبّرین کا یہ قول ہوا ہے کہ سیاسیات میں عملی مصالح کو اصولی نظریات پر مقدم رہنا چاہیے لیکن دراصل ان لوگوں کا یہ قول کسی حجت واستدلال پر مبنی نہ تھا بلکہ ایک جاہلانہ تخیل تھا۔ خلاف ازیں اس فاضل عصر کا یہ اعتقاد نتیجہ تھا اس کے غور وفکر وعاقبت اندیشی کا اس کو نظری وخیالی اصول پر پابند رہنے کے پورے مواقع حاصل تھے لیکن اس نے عملی ضروریات کے مقابلہ میں کبھی ان مواقع سے فائدہ نہیں اُٹھایا کبھی نظامات پارینہ کی پاس داری نہیں کی اور ان کم رُتبہ سیاسیئین کی ہمیشہ مخالفت کرتا رہا (جن کی آج بھی کمی نہیں) جو رفتار زمانہ وروشن خیالیوں کی ناکام سعی انسداد کے بعد اپنے ملک وقوم پر برس پڑتے ہیں کہ اُس نے ان کے مواعظ نہ سُنے اور صدہا سال کی قدیم وآبائی مراسم کو تبدیل کر کے اپنے تئیں تباہی وبربادی کے غار میں ڈھکیل دیا۔ برک اصلاح کا ساتھی تھا۔ وہ زمانہ کا رُخ پھیرنے کی حماقت میں کبھی مبتلا نہیں رہا۔ وہ ہمیشہ زمانہ کا رُخ پہچانتا اور اپنے تئیں اسی روش پر چلاتا رہا۔ "چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی" اس کا اصل الاصول تھا۔

جو لوگ جارج سوم کے عہد کے خصوصیات سے واقف ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ اس زمانہ کے اوہام کی تردید کے لئے برک جیسی عظیم الشان ہستی کی کس قدر ضرورت تھی اور اوہام بھی ایسے اوہام جو بیسوں تمدنوں کو غارت کر چکے ہیں اور خود ہمارے ہی تمدن کو غارت کر دینے میں انھوں نے کیا کسر اُٹھا رکھی تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ بزرگ و برتر ہستی بادشاہ کے نظروں میں کیونکر مقبول ہو سکتی تھی۔ جہاں پناہ کی نگاہ میں اکی

[illegible]

ساتھ ہوتا تھا۔ یہ مانا کہ یہ تینوں قابل و ذہین افراد تھے لیکن بھلا اس قدر ان میں ظرف کہاں تھا کہ ظلِّ سُبحانی کے مشیر بن سکتے۔ چنانچہ برک اپنی سی ۳۰ سالہ پبلک زندگی میں ایک بار بھی وزارت میں داخل نہ ہو سکا اور دو چار بار جب پست تر مناصب پر اُس کا تقرر مجبوراً کرنا پڑا بھی تو محض عارضی طور پر۔

ہم آج تصوّر کر سکتے ہیں کہ ایسے شخص کے متعلق اس کا بادشاہ کا کیا طرزِ عمل ہوگا جو ہمہ تن قدامت پرستی تھا اور جو اسلاف کے آثار قدم سے ایک انچ ہٹنا معصیت عظیم سمجھتا تھا۔ اس کے اور برک کے درمیان بعد المشرقین تھا۔ برک وہ شخص تھا جو نہ صرف اپنے زمانہ کا مُصلحِ اعظم ہوا ہے بلکہ آج بھی جو جو اصلاحات جاری ہوتے ہیں تقریباً ان سب کی بنا اسی کے ہاتھوں پڑ چکی ہے۔ تجارت کی آزادی اسی کے مساعی سے نصیب ہوئی، کیتھولک فرقہ کو جائز حقوق اسی کی پُرجوش وکالت نے دلائے (گو یہ حقوق اس کی وفات کے عرصہ کے بعد ملے) غیر مقلدوں کے ساتھ رواداری کا برتاؤ اسی کی جد و جہد سے ہوا۔ دیوالیوں کے لئے جو ظالمانہ قوانین نافذ تھے اُنھیں اسی نے منسوخ کر دیا۔ ضابطۂ تقریرات کے تشدد و سخت گیریوں کے خلاف اسی نے پُرزور صدائے احتجاج بلند کی سپاہیوں کی دوامی ملازمت کی اسی نے پرقوت مخالفت کی۔ یہ اسی کا جگر تھا کہ باوجود بادشاہ وقت کی حمایت و سرپرستی کے اس نے بردہ فروشی کا سدّباب کرانا چاہا۔ یہ اسی کی ہمّت تھی کہ سارے ملک کی مخالفت کے باوجود اس نے ازالۂ حیثیت عرفی کے مقدمات میں حکام کے غیر محدود اختیارات کو محدود کرانا چاہا اور پھر یہ اسی کی سرگرم مساعی اصلاح اور پارلیمنٹ میں مبہم مسودات قانون پیش کرنے کا یہ نتیجہ ہوا کہ بہت سے فضول مصارف تخفیف میں آ گئے یہاں تک کہ صرف ایک بخشی سلطنت کے محکمہ میں ۲۵۰۰۰ پونڈ (۳۷۵۰۰۰ روپیہ) سالانہ کی بچت نکل آئی

... میں کامیاب ہونا ناممکن تھا تاہم اس نے سب کی بناڈالدی اور اکثروں میں کامیاب بھی ہوگیا۔

ظاہر ہے کہ ایسے شخص سے بادشاہ کیونکر خوش رہ سکتا تھا جس کا قدامت پرستی سے خمیر تھا اور جسے ہر جدّت سے نفرت تھی اس پر مستزاد یہ ہوا کہ بادشاہ اہل امریکا پر مظالم کرنے پر تُلا ہوا تھا چنانچہ جنگ امریکا و انگلستان "سلطانی جنگ" سے موسوم تھی اور جو لوگ اس جنگ کے مخالف تھے وہ بادشاہ کے ذاتی دشمن سمجھے جاتے تھے۔ برک کا طرز عمل اس معاملہ میں ہر فریق سے جداگانہ تھا۔ اس کا نقطۂ نظر بالکل عملی تھا وہ اپنے قدیم اصول مصلحت بینی پر عامل تھا۔ وہ ان لاحاصل مباحث میں پڑنا تضییع وقت سمجھتا تھا کہ نوآبادیوں کو خود اپنے اوپر ٹکس لگانے کا حق حاصل ہے یا یہ حق صرف اصلی ملک کے باشندوں کو حاصل ہے اس کے پیش نظر صرف یہ عملی مسئلہ تھا کہ قیمت مال کے مناسب ہے یا نہیں؟ وہ صرف اس حقیقت پر زور دیتا تھا کہ امریکی نوآبادیوں کے بُعدِ عظیم اُن کی قوت اور حالت جنگ میں فرانس کی اغلبؔ ان کی معاونت کو ملحوظ رکھکر ان سے جنگ کا خیال کرنا بے سود تھا اور اس میں حق و غیر حق کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ اس مصلحت اندیشی کے اصول پر (نہ اس اصول پر کہ اس کی نظیر میشر نہیں)، اس نے امریکی نوآبادیوں پر اضافۂ ٹکس کی مخالفت کی اور اکیلے اسی تحریک پر کیا موقوف ہے اس نے ہر تجویز کی جو شرفائے امریکا کا زور توڑنے کے لئے بادشاہ نے پیش کی، اسی بنا پر مخالفت کی۔

جارج ثالث کے عہد کی نیرنگیوں کا اس سے بہتر مظہر اور کیا ہوسکتا ہے کہ برک جیسا شخص اپنی پبلک زندگی کے پورے ۳۰ سال میں حکومت کی طرف سے بالکل بے نام و نشان یعنی "صلہ و ستایش" دونوں سے محروم رہا اور ایک برک ہی پر کیا موقوف ہے یہ تو اس عہد کی امتیازی خصوصیت تھی کہ نا اہلوں کو فروغ ہوتا تھا

عبداللہ

[illegible] جس
عہد میں ایڈنگٹن مُدبّر اور پیٹ فلسفی سمجھا جاتا ہو ظاہر ہے کہ غریب برک کو کون پوچھ سکتا تھا؟

غالبؔ سوختہ جاں را چہ بہ گفتار آری
بہ دیارے کہ نہ دانند نظیریؔ ز قتیل

ناظرین کو ان واقعات سے سخت تاسف ہو رہا ہوگا، لیکن داستان کا زیادہ تاسف انگیز ٹکڑا ابھی باقی ہے اور ان لوگوں کے لئے تو یہ خاص طور پر دلچسپی رکھتا ہے جو اکابر رجال کی خصایص ذہنی کے مطالعہ کرنے کا شوق رکھتے ہیں۔ آج جبکہ برک کی اولاد تک زندہ نہیں ہے ہمیں اس حقیقت کے اعلان میں تامل نہ کرنا چاہیئے کہ اس بزرگ شخص کو آخر عمر میں اختلال حواس ہو گیا تھا۔ کبرسنی کی حالت میں اکلوتے لڑکے کی جسے ضعیف العُمر باپ اپنی واحد نشانی سمجھتا تھا وفات کا صدمہ ایسا نہ تھا جو بوڑھے باپ کے ہوش و حواس بجا رہنے دیتا۔ دیکھو کس درد و حسرت کے ساتھ اس جگر خراش صدمہ کا ذکر کرتا ہے:
"میرے نظام زندگی کی ترتیب معکوس سی ہو گئی جنھیں میرا وارث ہونا چاہیئے تھا وہ میرے مورث ہو گئے۔ جن کا شمار میرے اخلاف میں ہونا چاہیئے تھا وہ اب میرے اسلاف میں گنے جائیں گے۔ طوفان کی شدّت نے میرے گرد و پیش کے تمام درختوں کو برباد کر دیا اور میں ایک ٹوٹے ہوئے پُرانے درخت کی طرح زمین پر پڑا رہ گیا ہوں اب جینے کا مزا نہیں۔"

اختلال حواس کی ابتدا اس واقعہ سے ہوئی۔ اس زمانہ میں انقلاب فرانس کا زلزلہ انگیز واقعہ پیش آیا۔ برک نے پہلے تو ضبط سے کام لیا لیکن جب انقلاب خواہوں کے جرایم روز افزوں ترقی کرنے لگے اور سکون امن و آشتی کی جگہ قتل و غارت، درندگی و بربریت کے مناظر رونما ہونے لگے۔ تو بالآخر اس فرزانۂ روزگار کا دماغی توازن قایم

نہ رہ سکا اور جذبات عقل پر غالب آ گئے۔ اس گھڑی سے یہ تحریک انقلاب وانقلاب پسندوں کا قلبی دشمن ہو گیا اور جب انقلاب نے ہزاروں صحیح الحواس اشخاص کو دیوانہ بنا دیا افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ برک بھی اسی وبائے دیوانگی کا شکار ہو گیا۔

گو اس یگانۂ عصر کی دیوانگی کے شواہد پیش کرنا ہمارے لئے انتہا سے زاید درد انگیز ہے اور سچ یہ ہے کہ روایت سے اس کا ثبوت بہم پہنچانا ہے بھی مشکل کیونکہ اعزہ واحباب وتلامذہ قدرتی طور پر اپنے مخدوم کے ہر پہلو سے ذم کو مخفی رکھنا چاہتے ہیں تاہم ہیں تو اس کا سب سے بڑا ثبوت خود برک کی تصنیفات سے ملتا ہے۔ اس غرض کے لئے اس کی تصانیف ذیل لایق مطالعہ ہیں

(۱) انقلاب فرانس پر اظہار خیال (Reflections on the French Revolution)

(۲) اتحادیین کی پالسی پر ایک نظر (Remarks on the Policy of the Allies.)

(۳) خط بنام ایلیٹ (Letter to Ellot)

(۴) خط ایک شریف امیر کے نام (Letter to a Noble Lord.)

(۵) خطوط (Letters)

ان کے مطالعہ سے برک کی دیوانگی کے تدریجی مراتب پیش نظر ہو جاتے ہیں فاکس برک کا عزیز ترین شاگرد اور محبوب ترین دوست تھا دونوں کو ایک دوسرے سے بیحد محبت تھی لیکن محض اس بنا پر کہ اس معاملہ میں شاگرد اُستاد کا ہم آہنگ نہیں ہو سکتا تھا برک ہمیشہ کے لئے اس سے قطع تعلق کر لیتا ہے اور سر عام اس کا اعلان کر دیتا ہے کہ "میرے لئے بالکل ناممکن ہے کہ ایسے شخص سے کوئی لگاؤ باقی رکھوں جو فرنچ قوم کو دوست رکھتا ہے"۔ اُسی روز شب کو دوسرا واقعہ اس سے بڑھکر پیش آتا ہے۔ نصف شب گزر چکی ہے موسلا دھار بارش ہو چکی ہے۔ برک کا ایک عقیدتمند دوست اسے اپنے ہمراہ اپنی گاڑی میں بٹھا کر لے چلتا ہے کہ اس کے مکان تک پہنچا دے

میں انقلاب فرانس کا تذکرہ چھڑتا ہے اور برک کو اس ضمن میں یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کا ہم نشین انقلاب پسندوں سے ہمدردی رکھتا ہے۔ اس پر وہ معاً اس درجہ برافروختہ ہوتا ہے کہ بلا کسی خیال کے اور اپنی مشہور و مُسلّم شائستگی کو پس پشت ڈال کر گاڑی پر سے یہ کہتا ہوا کود پڑتا ہے کہ میں ایسے شخص کے ساتھ ایک گھڑی کی ہمنشینی بھی نہیں برداشت کر سکتا۔

اور پھر یہ مجنونانہ عداوت فرانس کے اس طبقہ تک محدود نہ تھی جو واقعتہً جرائم کا مرتکب ہوتا تھا بلکہ فرانسیسی قوم کے بہتر سے بہتر افراد بھی اس کی زد سے محفوظ نہ تھے کونڈورسے اور لافائے دونوں بہ لحاظ پاکیزگیٔ اخلاق دنیا میں بے نظیر ہوئے ہیں۔ کونڈورسے اپنے زمانہ کا ایک اعلیٰ ترین حکیم ہوا ہے۔ لافائے گو اس پایہ کا حکیم مفکّر نہ تھا تاہم اس کی دیانت داری و استقامت مُسلّم ہے۔ یہ واشنگٹن کا دوست امریکا کے آزاد کرنے میں اس کا رفیق و شریک تھا اور اگر برک اپنے ہوش و حواس میں ہوتا تو وہ خود اس کا بہت بڑا معترف و قدرشناس ہوتا۔ لیکن اس وقت صرف اس جرم میں کہ یہ دونوں اس بدنصیب ملک کے باشندے تھے جو اپنی حصول حرّیت کے لئے جدوجہد کر رہا تھا اور جس میں یہ دونوں بھی شریک تھے یہ دونوں برک کے درشت ترین سب و شتم کے ہدف رہے۔ کونڈورسے اُس کی نظر میں محض ایک ناپاک اخلاق کا سوفسطائی" ایک پُرجوش دہریہ" ایک پرغضب جمہوری تھا جو دنیا کی پست ترین و اعلیٰ ترین بدمعاشیوں و بدافعالیوں کا مرتکب ہو سکتا تھا۔ رہا لافائے تو جب جرمن حکومت اس پر مشق شقاوت کرنے لگی اور انگلستان کے دارالعوام میں اس محبوس مظلوم مُصلح کی تائید و حمایت میں صدائے احتجاج بلند ہوئی تو جانتے ہو کہ برک نے کیا کیا؟ یہی نہیں کہ اس تحریک کی تائید نہیں کی بلکہ علانیہ اس کی پرزور مخالفت کی اور وہ بھی ان الفاظ میں "میں ایک ایسے ذلیل و بیہودہ بدمعاش کی حمایت اپنی

انسانیت کے لئے باعث تحقیر سمجھتا ہوں"۔

خود ملک فرانس برک کے نقطۂ خیال سے کیا تھا؟ قاتلوں اور خونیوں کا درہ، مردم خواروں کا قلعہ، جہنم جس کے ارکان حکومت ذلیل ترین، مکار ترین اور بدترین افراد ہیں۔ جس کی قومی مجلس بدمعاشوں کی سازش گاہ ہے اور جس کے باشندے۔ دنیا کے ذلیل ترین ملاحدہ، ڈاکو، قزاق، خونی اور جرایم پیشہ ہیں۔ ایسی قوم جو کتوں سے نچوائے جانے کے قابل ہے ایک لمحہ کے لئے اس کی مستحق نہیں کہ اس کے ساتھ کسی قسم کی رواداری و مراعات کا سلوک کیا جائے۔ یہ ملک اس قابل نہیں کہ یورپ میں اس کا وجود قایم رہے اس قابل نہیں کہ نقشہ میں اس کا نام باقی رہے۔ اس قابل نہیں کہ لوگوں کے ذہن و دماغ میں اس نام کی کبھی یاد آئے۔ اسے فنا کر دینا چاہیئے یورپ سے، نقشہ سے اور ذہن و دماغ سے۔ جو لوگ ایسے ناپاک ملک میں سفر و سیاحت کرتے ہیں۔ جو لوگ اس ملک کی زبان سیکھتے ہیں جو سلاطین اپنے سفراء وہاں بھیجتے ہیں سب کے سب کبایر معاصی کے مرتکب ہوتے ہیں۔

زمانہ کی نیرنگیوں کی اس سے واضح تر شان اور کیا ہو سکتی ہے کہ کل تک جو خضر کا کام دے رہا تھا وہی آج خود کشتی غرق کر رہا ہے وہی برک جو عمر بھر عدل و انصاف، عقل و دوربینی امن و صلح کا دیوتا رہا کیا اور جس نے چند ہی سال پیشتر جنگ امریکا کے روکنے میں اپنی انتہائی قوت صرف کر دی اب وہی فرانس کے ساتھ جنگ برپا کرانا چاہتا ہے اور جنگ بھی ایسی جو حد درجہ مہیب، طویل و قیامت خیز ہو۔ اس کی مدۃ العمر کی رفیق مصلحت اندیشی نے اس وقت اس کا بالکل ساتھ چھوڑ دیا ہے۔ وہ ایک قوم سے جبراً اس کی رائیں عقائد و خیالات تبدیل کرا رہا ہے اور جو حکومتیں اس حد تک تشدد و درشتی کو جائز نہیں رکھتیں اُن پر وہ اظہار غیظ و غضب کرتا ہے وہ کہتا ہے اور صاف صاف کہتا ہے کہ فرانس کے خلاف جنگ شروع ہو اور اس

جوش انتقام وغضبناکی سے ہو جو محاربات صلیبی کا حصہ تھیں اور پھر شروع ہو کر اس کے خاتمہ کی عجلت نہ کرنا چاہیئے بلکہ

"میں کہتا ہوں، اور بآواز بلند کہتا ہوں کہ اس جنگ کو طویل وممتد ہونا چاہیئے"

خلاصہ یہ کہ بیرونی سلطنتیں متحد ہو کر ایک قوم سے زبردستی اس کا نظام حکومت تبدیل کرائیں۔ اس جنگ کو ایک کار ثواب سمجھ کر اس میں جہاد کے غلو وانہماک کے ساتھ شریک ہوں۔ اس میں پورے جوش انتقام وغضبناکی سے کام لیں اور اسے مدت دراز تک جاری رکھیں۔ یہ وہ خیالات تھے جن کا اظہار اگر کسی اور سیاسی یا مدبر سے ہوتا تو دنیا میں ہمیشہ اس کا نام بدنامی ورسوائی کے ساتھ قایم رہتا لیکن یہ خیالات اُس شخص کی زبان سے ادا ہو رہے تھے جو ایک وقت میں بہترین و عادل ترین مدبر اور نوع انسانی کا سب سے بڑا دوست ومحسن تھا مگر اس وقت اختلال حواس کے ہاتھوں مجبور تھا۔ ایسی صورت میں بجز اظہار قلق وتاسف کے اور کچھ کہنے کا حق نہیں رکھتے! ع

عید ہوئی ذوق ولے شام کو

حالات کی بے اعتباری دیکھو کہ وہی برک جب تک ملک وقوم نہیں بلکہ دنیا کا مخلص و دانشمند ترین خادم ومشیر رہا حکومت کی طرف سے اس کی بات بھی نہ پوچھی گئی لیکن جب اس کے دماغ میں انحطاط، عقل میں فتور اور حواس میں اختلال پیدا ہو گیا تو بادشاہ کو اس کی طرف توجہ ہوئی۔ اب دربار کی نظر لطف اس غریب کے حال پر مبذول ہوئی۔ یہ تجویز ہونے لگی کہ اُسے لارڈ کا خطاب عطا کر کے دار الامراء میں شامل کیا جائے اور خیر یہ تجویز تو اس کی وفات کے باعث قوت سے فعل میں نہ آسکی تاہم اتنا تو ہوا کہ موت سے دو سال پیشتر اسے گرانبہا سرکاری وظائف ملنے لگے جن کی مجموعی رقم سب سے چھوٹے تخمینہ کے مطابق ۳۷۰۰ پونڈ (۵۵۵۰۰ روپیہ) سالانہ تک

پہنچتی ہے بلکہ غالباً اس سے بہت زیادہ تھی۔

برک کا ذکر جو میں نے ذرا تفصیل سے کیا ہے اُمید ہے کہ ناظرین نے بھی اسکی اہمیت کو نظر انداز نہ کیا ہوگا۔ اس سے ایک طرف تو ایک عظیم الشان شخصیت پر روشنی پڑتی ہے جو بجائے خود غیر دلچسپ نہیں دوسری طرف اس سے اس کا پورا اندازہ ہو گیا کہ جارج کے عہد میں عروج و فروغ حاصل کرنے کی کیا صورتیں تھیں اور کن خیالات کی پابندی لازمی تھی۔ ان خیالات کا ملک کی ترقی پر بہ حیثیت مجموعی کیا اثر پڑا؟ اس کی تفصیل تو آیندہ آئے گی۔ البتہ اس موقع پر اس اثر کی دو ایک مشہور و غیر مختلف فیہ نظیروں سے استشہاد کرنا ضروری ہے۔

سب سے پہلے اس عہد کے مشہور ترین واقعہ یعنی جنگ امریکا کو لیجئے جارج ثانی کے عہد میں ایک تحریک یہ پیدا ہوئی تھی کہ ملک کے محاصل کو نوآبادیوں میں ٹکس کے اضافہ سے بڑھانا چاہیئے۔ مگر چونکہ امریکا کی نیابت پارلیمنٹ میں بالکل نہ تھی اس لئے اس کے معنی یہ تھے کہ ٹکس دینے والوں کی رضامندی رسمی طور پر لئے ہوئے بغیر بھی ان پر ٹکس کا اضافہ ہو رہا تھا۔ انگلستان کا وزیر اعظم اُس وقت ایک قابل و عادل شخص سر رابرٹ والپول تھا۔ اس نے بالکل بجا طور پر قزاقی کی اس شاہانہ صورت کو دبا دیا اور کسی نے اس ناقابل عمل تجویز کی طرف اعتنا ہی نہ کیا۔ لیکن جس شئے کو جارج ثانی کی حکومت انصاف کُشی سمجھی تھی یہ ضرور نہ تھا کہ اُسے جارج ثالث کی حکومت بھی ایسا سمجھتی۔ جارج ثالث اپنی خودسری، جہالت و غیر منصفانہ طرز فرماں روائی کی بنا پر اس طرح کی انصاف شکن تجاویز پر عمل کرنے پر تلا ہوا تھا اور جب اس تحریک کے از سر نو زندہ ہونے پر اہل امریکا نے اس کے مقابلہ کا ارادہ ظاہر کیا تو جارج ثالث کو اور زیادہ ضد آگئی اور اُس نے خیال کیا کہ ایسی سرکش رعایا کا زور توڑنے کے اس طرح کے احکام کا نفاذ لازمی ہے۔ آئین و استبداد آزادی و غلامی کا اب پورا

مقابلہ تھا۔ واقعات نہایت تیزی سے حرکت کرنے لگے۔ جنگ کا وقوع ناگزیر ہو گیا اور اب دیکھنے کی بات صرف یہ رہ گئی کہ جنگ کی صورت کیا ہو گی اور فتح کس فریق کے نصیب میں رہے گی۔ اہل امریکہ اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے سرفروشی و جانبازی پر تو طیار ہی تھے ادھر انگریزی حکومت نے بھی انتہائی سرعت سے کام لینا شروع کر دیا۔ جارج ثالث کی تخت نشینی کے پانچ سال کے اندر ہی اندر یہ قانون پارلیمنٹ میں پیش ہو کر بلا اختلاف منظور ہو گیا۔ زمانہ کے انقلاب کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جارج ثانی کے عہد میں یہ خیال صرف بعض دماغوں میں گونج کر رہ گیا کسی کی اتنی ہمت ہی نہیں ہوئی کہ اسے پارلیمنٹ میں پیش کرتا اور بالفرض پیش ہوتا بھی تو اس کی ناکامی یقینی تھی۔ لیکن چند ہی سال کے عرصہ میں حالات اس قدر بدل گئے تھے کہ یہ قانون بلا دقت و زحمت پاس ہو گیا اب اختلاف کرتا تو کون کرتا؟ کلیسیا کا غیر معمولی اقتدار جو اس بادشاہ نے بڑھایا تھا اس کا اظہار شکر اس کی طرف سے یہ ہوا کہ ساری جماعت کلیسیا بادشاہ کے ساتھ تھی۔ حزب المحافظین تو روز ازل سے حلقہ بگوش رہا ہے۔ اُمراء نے اس خیال سے اس تجویز کا ساتھ دیا کہ خود اُن پر ٹکس ہلکا ہو جائے گا۔ حزب الاحرار میں بھی اب کسی پر قوت مخالفت کی تاب نہ تھی۔ رہی وزارت، تو یہ معلوم ہے کہ بادشاہ نے تمامتر ایسے ہی لوگوں کو چُن چُن کر وزارت میں رکھا تھا جو اس کے اشاروں پر کام کرنے والے تھے اور اگر کوئی چون و چرا کرتا تو اُسے معزول کر دینا جارج ثالث کے نزدیک کتنی بڑی بات تھی۔

ان حالات کے اجتماع سے جو نتیجہ قدرتی طور پر نکلنا چاہیئے تھا وہ نکلا۔ واقعات و رفتار جنگ کی تفصیل ہمارے موضوع سے خارج ہے اس کے لئے ناظرین کو ملکی تاریخ کی کتابوں کی ورق گردانی کرنا چاہیئے۔ ہمارے لئے صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ عہد سابق کے تحمل، دانشمندی، و عدل کی پالسی کو چھوڑ کر جاہل و بے غور دماغوں نے جبر و

استبداد کی بنیاد پر عمارت قایم کرنا چاہی اور ایک بڑے پیمانہ مگر نہایت مہمل طریقہ پر امریکا سے جنگ شروع کر دی گئی۔ جس کا نتیجہ صرف یہی نہیں ہوا کہ اس میں شکست نصیب ہوئی بلکہ ساری متمدن دنیا کے سامنے ہم اپنی شقاوت وظلم کے باعث رُسوا و ذلیل ہوئے۔ اور تجارت جو برباد ہوگئی وہ علٰحدہ۔ ہمارے تجارتی مرکز مانچسٹر میں ۹۰ فی صدی کاریگر بیکار ہو گئے۔ ہماری دھاک دنیا سے اُٹھ گئی دنیا کی بیش بہا زمین و نوآبادیاں جو ہمارے پاس تھیں ہم اُنھیں کھو بیٹھے اور جنگ میں جو مصارف ہمیں برداشت کرنا پڑے اُن کا شمار ۱۴۰۰۰۰۰۰۰ پونڈ (۲۱۰۰۰۰۰۰۰۰ روپیہ) دو ارب دس کروڑ تک پہنچتا ہے !!

مگر مصائب کا خاتمہ یہیں نہیں ہوتا۔ آگ سے آپ اپنے دشمن کا مُنہ جھُلس رہے ہیں لیکن اس سے نہیں ڈرتے کہ کہیں خود آپ بھی اس کی لپیٹ میں نہ آجائیں۔ جبر و استبداد کی جو تعلیم امریکا پر مظالم توڑنے کے جواز میں دی گئی تھی یہیں تک محدود نہیں رہ سکتی تھی۔ آگ کے شعلے لپکے اور آگ لگانے والوں کو یہ نظر آنے لگا کہ وہ خود بھی اسی کا شکار ہو رہے ہیں۔ استبداد جبر کی حمایت میں جو دلایل امریکا کے مقابلہ میں استعمال کئے جاتے تھے اب وہ خود انگلستان کے مطالبہ حقوق کے مقابلہ میں صرف کئے جانے لگے۔ انگلستان کو اپنی آزادی حقوق پر ناز تھا لیکن اب جبکہ وہ دوسروں کے حقوق غصب کرنے کی کوشش میں تھا کیا وجہ تھی کہ خود اس کے حقوق برقرار رہتے دارالامرا و دارالعوام دونوں میں خود انگلستان کی آزادی معرض بحث میں آنے لگی خصوصاً ارکان کلیسیا کی زبانوں سے ہمارے معاصرین و تاریخ کے اس حصہ سے غالباً زیادہ باخبر نہیں۔ لیکن اس کی وجہ یہ ہے کہ اس قسم کے خیالات کا پتہ عموماً صرف مباحثات پارلیمنٹ کے مجلدات و ارکان کلیسیا کے مواعظ کے مطالعہ سے چلتا ہے اور ظاہر ہے کہ آج کل ان چیزوں کی ورق گردانی کی تکلیف صرف معدودے

تاہم ان ماخذ کے اعتماد پر جو عام مؤرخوں کی نظروں سے مخفی ہیں میں یقینی طور پر کہہ سکتا ہوں کہ یہ اندیشہ بجا طور پر اس سے بہت زیادہ اہم تھے، جتنا ہمارے معاصرین سمجھے ہوئے ہیں۔ یہ ناقابل انکار حقایق ہیں کہ اب تاج کو از سرِ نو وہ وسیع قومی اختیارات حاصل ہو گئے تھے (اور اس حالت میں سالہا سال تک رہے) جو کئی صدیاں ہوئیں مٹ چکے تھے۔ کلیسا اس استبداد سلطانی کی تائید پر ہو رہا تھا دار الامراء رفتہ رفتہ خوشامدیوں اور "جی حضور" کہنے والوں سے بھرا جا رہا تھا اور اعلیٰ دنیوی و روحانی مناصب پر وہی لوگ سرافراز ہوتے تھے جو اقتدار تاج کے مؤید ہوتے تھے۔ یہ حقایق سب کو مسلّم ہیں اور ان کے تسلیم کئے جانے سے یہ لازم آتا ہے کہ جنگ بہم امریکا تاریخ انگلستان کا ایک نہایت اہم باب تھی اور اگر نو آبادی کو شکست ہو جاتی تو خود رعایائے انگلستان کی حرّیت کی بھی خیر نہ تھی۔ اس خطرہ سے ہمیں نجات دلانے والے ہمارے برادران امریکی تھے جنھوں نے جانبازانہ و سرفروشانہ عزم و اقدام کے ساتھ عساکر سلطان کو ہر معرکہ میں قطعی شکست دی اور اپنے تئیں اس غلامی سے آزاد کر کے ۔۔ سال ہوئے کہ اپنی وہ دلآویز و سبق آموز خود مختاری قایم کر لی ہے جسے دیکھ کر ہر شخص یہ سمجھ سکتا ہے کہ ایک حر قوم خارجی اعانت سے بے نیاز رہ کر کہاں تک ترقی کر سکتی ہے۔

اس محاربۂ عظیم کے سات سال بعد جو حق کی فتح اور امریکیوں کی کامل خود مختاری پر ختم ہوا ایک دوسری قوم یعنی فرانس نے اپنے فرماں رواؤں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ انقلاب فرانس کے اسباب کی تفصیل کہیں آگے ملے گی۔ یہاں صرف اس کے اُن نتایج و اثرات پر نظر کرنا ہے جو اس نے انگریزی سیاست پر پیدا کئے۔ فرانس میں یہ تحریک نہایت سُرعت سے پھیلی اور چشم زدن میں اُسی نے تمام دقیانوسی و از کار رفتہ نظامات کو منہدم کر دیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ رعایا نے جوش انتقام میں بیخود ہو کر ناگفتہ مظالم کا ارتکاب کر ڈالا اور اس طرح اپنی شریفانہ ناموری میں ہمیشہ کے لئے ایک داغ لگا لیا۔ لیکن درحقیقت اس میں

... کی بات ... ہمیشہ کا سب قایم رہتا ہے۔ گیند جس زور سے
زمین پر ٹپکے گا اُسی زور سے وہ اُچھلے گی۔ یہی حال قوت انتقام کا ہے جس شدّت کا آپ ظلم کیجئے گا اُسی کے مساوی قوت کے ساتھ جوش انتقام بھی مشتعل ہوگا۔ ایسی حالت میں اگر انقلابیین فرانس کو اُن کے حال پر چھوڑ دیا جاتا تو کچھ روز کے بعد یہ لوگ خود اپنی زیادتیوں پر نادم ہوتے اور اپنے مناسب حال اپنا جدید نظام حکومت قایم کر لیتے؛ اب یہ کہنا دشوار ہے کہ اس نظام حکومت کی کیا شکل ہوتی، تاہم وہ جو کچھ بھی ہوتی بہر حال یہ انھیں کے سمجھنے اور طے کرنے کی بات تھی، باہر والوں کو اس سے ذرا بھی واسطہ نہ تھا۔ کسی بیرونی سلطنت کو یہ ذرّہ بھر بھی حق حاصل نہ تھا کہ وہ فرانس کو یہ تعلیم دے کہ اپنا نظام حکومت فلاں فلاں اصول پر اختیار کرے اور بالفرض یہ ہوتا بھی تو فرانس اس بیرونی مداخلت کو گوارا کیوں کرنے لگا تھا۔ جو ملک خود اپنی حکومت کی تاب نہ لاسکا، ظاہر ہے کہ دوسروں کی کارفرمائی کیوں کر برداشت کر سکتا تھا؟

لیکن جارج ثالث اور اُس کے مشیروں کی عقل میں یہ موٹی باتیں بھی نہ آئیں۔ اور ان لوگوں نے بیٹھے بٹھائے ایک نیا جھگڑا اپنے سر لے لیا۔ ان لوگوں نے پہلے تو فرانس کے خلاف اُسی طرح درشت کلامیوں بدزبانیوں کا مینہ برسانا شروع کر دیا، جیسا چند سال پیشتر امریکا کے لئے کیا تھا۔ اُس کے بعد انگریزی سفیر کو فرانس کے دربار سے اس بنا پر واپس بُلا کر، کہ ایسے ملک میں جس نے بادشاہت کے بجائے جمہوریت کو اختیار کیا ہو وہ نہیں قیام کر سکتا، فرانس سے کھُلے خزانہ عداوت مول لے لی۔ پھر چند ماہ کے بعد جب فرانس نے اس عمل کی تقلید میں جو خود انگلستان ایک صدی پیشتر کر چکا تھا اپنے بادشاہ پر مقدمہ چلایا اور بالآخر اُسے سزائے موت کا حکم سنا کر اُسی کے تخت گاہ میں اُسے قتل کر ڈالا، تو تاج انگلستان اس قدر برافروختہ ہوا کہ فرانس کو بغیر اپنی صفائی کا موقع دیئے بغیر اُس سے کسی قسم کا جواب لئے فوراً اپنے ملک سے فرانسیسی سفیر کا اخراج کر دیا۔ فرانس اپنے بادشاہ کے بیرحمانہ

قتل کے بعد یقیناً نادم ہوتا اور تلافی مافات کی قطعاً کوشش کرتا، لیکن انگلستان کی اس عاجلانہ مداخلت کا نتیجہ یہ ہوا کہ فرانس کو بھی ضد آگئی اور اس کے یہاں کے نرم و گرم، سب فریق بیرونی دست اندازیوں کا مقابلہ کرنے کے لئے متحد ہوگئے۔ یہ ایک کھلی ہوئی بات تھی جسے بچّہ بھی سمجھ سکتا تھا کہ فرانس نے غلطی، حماقت، سفاکی، معصیت جو کچھ بھی کی اپنے لئے اور اپنے حق میں کی کسی دوسرے ملک کو تو اس نے نقصان نہیں پہنچایا تھا، لیکن انگلستان کے اہل حلّ وعقد اس بدیہی حقیقت کو بھی نہ سمجھے اور فرانس پر دھاوا بول دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ایسی جنگ چھڑ گئی جس میں سارے یورپ کو شریک ہونا پڑا جو مسلسل ۲۰ سال تک جاری رہی، جس میں لاکھوں آدمی کام آگئے اور جس نے ترقی تمدن کی رفتار پیچھے کی طرف پھیر دی۔

اس جنگ کے (جو انگلستان نے نہایت ہی ظالمانہ، نہایت ہی نامنصفانہ اور نہایت ہی نفرت انگیز طریقہ چھیڑی) یورپ پر جو کچھ اثرات ہوئے وہ تو ہوئے مگر ہمیں اس وقت دیکھنا یہ ہے کہ خود انگلستان پر اس کا کیا اثر پڑا۔ اس خونریز جنگ کی سب سے زیادہ نفرت انگیز خصوصیت یہ ہے کہ یہ جنگ ملک و مال، زر و زمین کی طمع میں نہیں چھڑی تھی، بلکہ صرف آزادیٔ رائے کو پامال کرنے کے لئے برپا کی گئی تھی۔ تحریک اصلاح کا قدم اب آگے بڑھ رہا تھا، لیکن دول یورپ کا استبداد و تعصب اسے نہ دیکھ سکا اور سب نے مل کر یہ ٹھان لی کہ اس جذبہ کو کچل ڈالنا چاہیئے۔ چنانچہ جونہی مبادیات جنگ کا آغاز ہوا، انگلستان نے یہ دو فرایض اپنے ذمہ لے لئے: خارجی جمہوریت شکنی، داخلی اصلاح کشی۔ یعنی بیرون ملک سے جمہوریت، اور اندرون ملک سے حرّیت، فنا کر دی جائے۔ پہلے فرض کی انجام دہی یوں ہوئی کہ انگلستان دیوالیہ ہوگیا اُمراء کا کیا ذکر ہے خود سرکاری خزانہ میں خاک اُڑنے لگی، ہزار ہا خانماں بے چراغ ہوگئے اور ہر گھر ماتم سرا بن گیا۔ دوسرے مقصد کے پورا کرنے کی تدبیر یہ نکالی گئی کہ رعایا کی زبان بندی کے لئے جدید قوانین کا نفاذ ہوا جو اس قدر وسیع و ہمہ گیر تھے کہ اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب ہو جاتے اور باشندگان اظہار خیال کے تمام ذرایع سے محروم ہو کر ایک بے زبان قوم بن جاتے،

[illegible]

کے قوانین عملاً کالعدم نہ کر دیتے۔

قوم میں روح حریت پیدا کرنے اور برقرار رکھنے کے بڑے ذریعہ دو ہی ہیں۔ ایک پریس (اخبارات) کی آزادی، دوسرے عام جلسوں میں اجتماع کا حق۔ ہمیں فخر ہے کہ ہماری حریت سیاسی کے بھی دو نشان ہمیں سارے یورپ سے ممتاز کیے ہوئے ہیں اور سچ یہ ہے کہ جب تک اجتماعی مجالس و اخبارات کی آزادی پوری طرح قایم ہے ہم بڑے سے بڑے جابر و مستبد فرماں روا سے بیخوف رہ سکتے ہیں اور پھر ان سے قومی ترقی کے لئے ضمنی فوائد جو حاصل ہوتے ہیں وہ مستزاد ہیں۔ مثلاً ایک فائدہ یہی کیا کم ہے کہ ہر شخص کا دماغ ملکی مسائل کو سمجھنے اور ان پر غور کرنے کا خوگر ہوتا ہے۔ اور اس طرح قوم میں غور و فکر کرنے والوں کی تعداد بڑھتی ہے یا یہ کہ ہر ملکی مسئلہ پر بہت سے دماغ اور بہت سی عقلیں مل کر کسی نتیجہ پر پہنچتی ہیں۔

اس بنا پر عہد زیر نظر کے ارباب حلّ و عقد نے سب سے پہلے آزادیٔ رائے کے انھیں ذرائع کو پامال کرنا چاہا۔ اس معرکہ کی تفصیل، جو حکومت و رعایا کے درمیان سالہا سال قایم رہا، گو نہایت دلچسپ ہے لیکن اس مقدمہ میں ہم اسے پھیلا نہیں سکتے۔ اس وقت صرف ناظرین کو یہ جتا دینا ہے کہ وہ مندرجۂ ذیل اشخاص کے حالات تاریخ میں پڑھیں کہ انھیں کن کن مظالم کا ہدف بننا پڑا تھا اور کس کس طرح قید جرمانہ و جلاوطنی کی سزائیں بھگتنا پڑی تھیں۔ یہ کس جرم میں؟ صرف اس جرم میں کہ انھوں نے اپنے حقوق جائز کا مطالبہ کرتے تھے اور مطالبہ بھی اسی زبان میں جو آج ہر سیاسی مقرر و اخبار نویس استعمال کرتا ہے۔ ان شہدائے حریت میں سے چند کے نام یہ ہیں:۔ آڈمس[1] بونی[2]، کراس نیلڈ[3]، فروسٹ[4]، جیرالڈ[5]، ہارڈی[6]، ہولٹ[7]، ہڈسن[8]، ہولکرافٹ[9]، جوائس[10]

کڈ، لیمبرٹ، مارگیرٹ، مارٹن، میور، پامرا، پری، اِسکرونک، اسٹینبارڈ، تھلوال[21]، ٹمک، ویک فیلڈ[22]، وارڈِل[23]، ونٹربوتھم[24]۔

گرجُوریون نے چونکہ بعض مواقع پر حکومت کے علی الرغم دامن انصاف کو ہاتھ سے چھوڑنا گوارا نہ کیا تھا، اس لئے حکومت کو اب اور شدید تر قوانین کے نفاذ کی ضرورت محسوس ہوئی چنانچہ ۱۷۹۵ء میں ایک قانون نافذ ہوا جس کے ماحصل کو ہم ذیل کی شکل میں رکھ سکتے ہیں

(۱) کوئی عام جلسہ خواہ کسی غرض سے ہو اُس وقت تک منعقد نہیں ہو سکتا، جب تک اُس کے انعقاد سے پانچ روز پیشتر اُس کا اعلان اخبارات میں مع اُس کے مقاصد اور وقت مقام و تاریخ انعقاد کے نہ کر دیا جائے۔

(۲) اس اعلان پر صاحب خانہ کے دستخط ہونا چاہئیں اور اعلان کا اصل مسودہ مجسٹریٹ کے پاس اطلاع کے لئے بھیجدینا چاہیئے۔

(۳) ہر مجسٹریٹ اس کا پوری طرح مجاز ہو گا کہ اگر وہ کسی جلسہ میں کسی شخص کی تقریر کو زیادہ سخت سمجھے تو فوراً جلسہ کو منتشر اور سرغنایان جلسہ کو گرفتار کر سکتا ہے۔

(۴) اگر کسی جلسہ میں بارہ یا اس سے زاید اشخاص شریک ہوں اور وہ جلسہ یا اُس کا کوئی جزو مجسٹریٹ کے حکم کے باوجود بھی منتشر نہ ہو تو تمام شرکا رجلسہ ماخوذ ہوں گے اور اس عدول حکمی کی پاداش میں انھیں سزائے موت دی جا سکتی ہے۔

ظاہر ہے کہ اس قانون سے سارے اختیارات مجسٹریٹ کے ہاتھ میں آگئے تھے۔ اس کا فیصلہ ناطق تھا۔ وہ ایک غیر مسئولانہ انداز سے ہر جلسہ کو روک سکتا تھا اور اس طرح کے احکام سے رعایا پر جو دباؤ قایم ہو جاتا ہے اس کا اندازہ ناظرین خود کر سکتے ہیں۔ لیکن حکومت کے

ذوق استبداد کو اس سے بھی تسکین نہ ہوئی اور ۱۷۹۹ء میں ایک قانون اور پاس ہوا جس کا مفاد یہ تھا:-

(۱) کوئی لکچر، کوئی تقریر، کوئی مباحثہ اُس وقت تک نہیں ہو سکتا ہے، جب تک مجسٹریٹ سے اس کے لئے باضابطہ لیسنس (اجازت نامہ) نہ حاصل کر لیا گیا ہو۔

(۲) اسی طرح دار المباحث، کتب خانہ، کلب، وغیرہ کوئی بغیر مجسٹریٹ کی منظوری کے نہیں نکل سکتے۔

(۳) کوئی شخص خود اپنے گھر میں بھی کسی کو بغیر مجسٹریٹ کی اجازت کے کتاب رسالہ یا اخبار معاوضہ پر قرض نہیں دے سکتا۔

(۴) لیسنس (اجازت نامہ) پر دو مجسٹریٹوں کے دستخط ہونا چاہیئے، اور ہر سال ان کی تجدید ہوتے رہنا چاہیئے۔ دوران سال میں بھی مجسٹریٹ مجاز ہوں گے کہ جب چاہیں اجازت نامہ کو منسوخ کر سکتے ہیں۔

(۵) ان احکام کی خلاف ورزی کرنے والے ۱۰۰ پونڈ (۱۵۰۰ روپیہ) روزانہ جرمانہ کے مستوجب ہوں گے اور ان کی اعانت کرنے والے ۲۰ پونڈ (۳۰۰ روپیہ) روزانہ جرمانہ کے۔ اس کے علاوہ صاحب خانہ کو اپنے مکان پر مجمع ناجائز کرنے کی جو سزا دی جائے گی وہ علیحدہ۔

موجودہ ناظرین ممکن ہے کہ اٹھارھویں صدی کے ان قوانین کو حیرت و استعجاب کی نظر سے دیکھتے ہوں۔ لیکن دراصل اس میں حیرت و استعجاب کی کوئی بات نہیں۔ حکومت نے جو مقصد اپنے پیش نظر رکھا تھا، یعنی رعایا کے دل سے جذبۂ حریّت کا مٹا دینا اس کے لئے یہ تدابیر لازمی تھیں، بلکہ اگر حکومت نے یہ طریقہ اختیار نہ کیا ہوتا تو البتہ تعجب کا مقام تھا۔ اس طرح کے تمام احکام و قوانین و مختلف کڑیاں تھیں ایک سلسلۂ استبداد، زبان بندی، حریت کشی کی ہر اخبار نویسی اور ہر مصنف کی جو ذرا بھی اپنے خیالات کی آزادی سے اشاعت کرنا چاہتا تھا جان ہر وقت خطرہ میں تھی اور سب کی زبانیں بند کر دی گئی تھیں۔ قوم پر

مستقبل سے مایوس ہو گئے تھے جس کے شواہد ان لوگوں کی پرائیوٹ (خانگی) مراسلت میں بہ کثرت ملتے ہیں۔ تاہم اس جماعت میں کم از کم ایک فرد ایسا ضرور تھا جس کی حق پرستی کسی خوف سے مغلوب نہ ہو سکی۔ یہ جوانمرد سابق وزیر اعظم فاکس تھا جس نے بکمال بیخوفی تمام خطرات کو برداشت کر کے سنہ ۱۷۹۵ء میں پارلیمنٹ میں علی رؤس الاشہاد کہہ دیا کہ اگر اس قسم کے شرمناک قوانین مدافعی نافذ ہو گئے تو اپنے حقوق و حریت کی تحفظ میں رعایا کے لئے حکومت سے سرکشی کرنا بالکل جائز ہو گا اور اس کے آغاز کا سوال، تحریک بغاوت جواز و عدم جواز پر نہیں بلکہ صرف رعایا کی قوت و استطاعت پر موقوف رہیگا۔ فاکس کے اصل الفاظ سننے کے لایق ہیں:-

"مجھے کامل توقع و یقین ہے کہ یہ مجوزہ قوانین، جن کا منشا سوا اس کے کچھ نہیں ہے کہ ہمیں ہمارے حقوق سے محروم کر دیں، ہمارے آئین و دستور کا قلع و قمع کر دیں اور ہماری آئینیت کو استبداد و غیر مسؤلیت میں یکسر تبدیل کر دیں۔ ہرگز پارلیمنٹ میں قوم کی عام رائے کے علی الرغم منظور نہ ہو سکیں گے۔ لیکن اگر بالفرض وزرائے سلطنت نے اسے قوم کے علی الرغم اپنے ناجائز وسائل کو کام میں لا کر منظور کرا لینے اور آفس کے عملی نفاذ کا تہیہ کر لیا ہے، اور اگر اس صورت حال میں رعایا مجھ سے مسئلہ وفاداری و اطاعت کے بارہ میں دریافت کرتی ہے تو میرا جواب یہ ہے کہ اب اخلاقی فرض کا سوال نہیں رہتا، بلکہ صرف موقع مناسب کا سوال آجاتا ہے۔ اس میں کسی کو شبہ نہیں کہ بغاوت صرف آخری تدبیر اور صرف حالات کے انتہائی حدود تک پہنچ جانے کے وقت جائز ہو سکتی ہے اور ایسی حالت میں صرف موقع مناسب کا انتظار رہتا ہے۔"

لیکن اس قسم کی تقریریں بالکل بے اثر رہیں۔ رعایا ہرچند واویلا کرتی رہی لیکن وزارت

جو ارادہ کر چکی تھی اُسے پورا کر کے رہی اور پھر یہ نہ سمجھنا کہ پُر درد داستان انھیں قوانین پر ختم ہو جاتی ہے۔ نہیں بلکہ ان کے علاوہ جذبات حُرّیت و اصلاح کی پامالی کے جتنے طریقے ممکن ہیں وہ سب برتے جا رہے تھے۔ وزرا نے چُن چُن کر اپنے مخالفین سے قید خانوں کو بھرنا شروع کیا۔ جہاں اُن کے ساتھ ایسا ظالمانہ برتاؤ کیا جاتا تھا جو ہمارے تمدن کے لئے باعث شرم ہے۔ اصلاحی خیالات رکھنا ایک سخت ترین جرم تھا۔ ہر آزاد خیال و اصلاح پسند کی آزادی ہر وقت خطرہ میں تھی۔ اور اگر خوش قسمتی سے قید خانہ سے نجات رہی تو اتنا تو بہر حال ضروری تھا کہ اس کی نقل و حرکت پر نگرانی رہے اور اُس کی خانگی زندگی سے متعلق نہایت پوشیدہ مراسلتیں تک زیر احتساب رہیں۔ مجالس عمومی کا انعقاد تقریباً ناممکن ہو گیا تھا اور اگر کبھی ہوتیں بھی تو معاً فوجی طاقت کے مظاہرہ سے منتشر کر دی جاتیں۔ ہر وہ شخص جو پبلک میں اثر و وجاہت رکھتا تھا مشتبہ سمجھا جاتا تھا اور پریس پر تو اس قدر سختی تھی کہ اہل مطبع نے ان مصنّفین کی کتابیں طبع و شائع کرنا ہی بند کر دی تھیں جو حکّام کی نظر میں معتوب ہوتے تھے۔ حکومت پر کسی قسم کی نکتہ چینی، بغاوت کی مرادف سمجھی جاتی تھی اور صدہا اشخاص محض حکام و وزرا کی رائے سے بغیر اس کے کہ اُن کے خلاف کوئی باضابطہ عدالتی کارروائی ہو، قید کر دئے جاتے تھے۔ جاسوسی و مخبری کی وہ گرم بازاری تھی کہ الاماں کلب، ہوٹل، سرا، قہوہ خانہ، بلکہ نجی کے مکانات تک میں جاسوس گھسے ہوئے تھے۔ خود اپنے اعزہ بلکہ بعض دفعہ بھائی بھائی کی اور بیٹا باپ کی مخبری کرتا تھا۔

یہ تھے حالات اور یہ تھا طرز عمل اٹھارھویں صدی کے خاتمہ پر حکومت انگلستان کا اُن نظامات سے متعلق جن کا مقصد محض بہبود رعایا ہونا چاہیئے تھا، مگر جن کی آڑ میں یہ کام لیا جا رہا تھا۔ پھر حکمت عملی ممالک غیر (فارن پالیسی) کے نام سے ملک پر جنگ وغیرہ کے جو معمولی مصارف پڑ رہے تھے، اُن کا بار جو رعایا پر پڑ رہا تھا وہ ان مظالم

[illegible]
جو اب بہت زیادہ پُرمصارف ہو گئے تھے، اُن کے لئے بھی روپیہ غریب رعایا ہی سے وصول کیا جاتا تھا۔ طبقۂ امرا اس سے مُستثنےٰ تھا۔ اور اس طرح جہاں رعایا نہ صرف اپنے حقوق سے محروم کی جا رہی تھی بلکہ اسے اپنی جیبیں خالی کرنے پر بھی مجبور ہونا پڑتا تھا۔

ان حالات کے درمیان اگر اُس وقت کے بڑے بڑے علم بردارانِ حرّیت، تحریکِ اصلاح و حرّیت کی طرف سے مایوس ہو گئے تو ایک بڑی حد تک حق بجانب تھے، ہم خود جب اتنے عرصہ کے بعد ان واقعات کو پڑھتے ہیں تو ہمیں خود یہ نظر آنے لگتا ہی کہ جہاں تک سیاسی زندگی کا تعلّق ہے، چارلس اوّل کے بعد سے کوئی زمانہ اس کا اتنا تاریک نہیں ہوا ہے۔ لیکن دراصل ایسے موقع پر جو شے عموماً نظر انداز کر دی جاتی ہے، وہ یہ حقیقت ہی کہ سیاسی زندگی قومی زندگی کا صرف ایک جزو ہوتی ہے۔ قومی زندگی کے متعدد اصناف و مظاہر ہوتے ہیں ان میں سے ایک سیاسی زندگی بھی ہے اور بس۔ اس لئے کسی قوم یا ملک کے مستقبل سے متعلق کوئی نتیجہ نکالنے کے لئے محض اُس کی سیاسی زندگی پر اعتماد کرنا کافی نہیں۔ چنانچہ اسی عہد زیرِ نظر میں گو سیاسی زندگی قوم کو انحطاط و پستی کی جانب لئے جا رہی تھی لیکن علمی زندگی کا ارتقا بدستور جاری تھا، اور علم و تعلیم کی اشاعت قوم میں بیداری کی جو روح پھونک چکی تھی، وہ روز بروز ترقی پر تھی۔ سیاسی و علمی زندگیوں کے اس تناقض و کشمکش کا نتیجہ یہ ہوا کہ سیاسی انحطاط کے حضرات ماند پڑ گئے بلکہ انھیں کو دیکھ کر قوم میں یہ احساس پیدا ہوا کہ سرے سے اس نظام ہی کی اصلاح کرنا چاہیئے جس کی رو سے اہلِ استبداد کا برسرِ کار اور اس قدر مطلق الاختیار ہو جانا ممکن ہی۔ اس بنا پر رعایا میں یہ عزم پیدا ہو گیا کہ ایوانِ حکومت میں خود اس کی آواز کو بھی پورا دخل ہونا چاہیئے۔ یہ عزم روز

بروز راسخ ہوتا گیا، ہر روز اس میں عملیت بڑھتی گئی تاآنکہ اُنیسویں صدی میں آکر حریت واصلاح کو استبداد، تعصب، و فرعونیت پر کامل وقطعی فتح نصیب ہو گئی اور انگریزی پارلیمنٹ کا رنگ ہی بدل گیا۔

اس ساری سرگزشت کے ماحصل کو ہم دفعات ذیل میں رکھ سکتے ہیں:-

(۱) اٹھارھویں صدی کے جزو آخر میں انگلستان کی علمی وسیاسی زندگیوں میں سخت تناقض وکشمکش تھی۔ عام قومی زندگی کی رفتار ارتقا، ترقی اصلاح و روشن خیالی کی طرف تھی جس کا ایک مظہر یہ تھا کہ آج کلیسا، وامراء سب کے اختیارات محدود ومقید کیے جائیں۔ بخلاف اس کے جارج ثالث اور اس کے رفقاء ومشیروں کا رجحان استبداد، تاریک خیالی وجمود کی جانب تھا۔

(۲) حکومت کو اپنے مقصد میں ایک حد تک عارضی کامیابی نہ ہوئی یعنی کچھ روز ترقی واصلاح کا دروازہ بند رہا لیکن بالآخر میدان اصلاح پسندوں کے ہاتھ رہا۔ معرکہ کے اہم عظیم الشان ونازک ہونے میں شک نہیں، تاہم حریت واصلاح کا جذبہ ایسا نہیں، جو ایک مرتبہ پیدا ہو کر مٹ سکے۔ چنانچہ قوم کی عام رائے کے سامنے بڑے بڑے خود سروں کو سر خم کرنا پڑا۔

(۳) اس ضمن میں اس عام حقیقت کی بھی ایک تازہ نظیر مل گئی کہ حریت واستبداد اصلاح وجمود میں جب کبھی مقابلہ ہوتا ہے تو آخری کامیابی ہمیشہ طالبان اصلاح ہی کو ہوتی ہے خواہ مستعدین کی جماعت کتنی ہی ارباب اقتدار ونفوذ سے مرکب ہو۔ بات یہ ہے کہ افراد کی زندگی دائمی تو ہو نہیں سکتی۔ چند سال کے بعد وہ وفات پا جاتے ہیں اور ان کی وفات کے ساتھ اُن کے اقتدار، نفوذ ووجاہت کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے۔ بخلاف اس کے حریت واصلاح کے مطالبات ملک کی آب وہوا میں سرایت کر جاتے ہیں۔ ساری فضا ان سے گونجنے لگتی ہے۔ ان کا دار ومدار شخصی زندگی پر نہیں

ہوتا۔ جب ان کے مخالف زبردست و ذی اقتدار اشخاص فنا ہو جاتے ہیں تو یہ پھر از سرِ نو زور پکڑتے ہیں وہ اس طرح بالآخر یہی غالب ہو کر رہتے ہیں۔ اشخاص کتنے ہی ذی اقتدار و نفوذ ہوں اور پیدا ہوتے اور فنا ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن جو آزادانہ خیالات قوم کے خمیر میں رچ جاتے ہیں۔ وہ کسی کے مٹائے نہیں مٹتے بڑے سے بڑے گردن فراز کو بھی زمانہ کی ہوا کے آگے اپنے عجز کا اعتراف کرنا ہوتا ہے۔

یہ تاریخ کے حقایق مسلمہ ہیں جس شخص نے تاریخ پر غور و تدبر کیا ہے۔ اُسے یہ فوراً نظر آجانے چاہئیں۔ لیکن عہد زیر نظر میں ہمارے حکمرانوں کی عقل پر پردے پڑ گئے تھے۔ اُن کی نظر ان حقایق بالا کی طرف جا ہی نہیں سکتی تھی۔ اُن کے دماغوں میں سرے سے حکومت کا تخیل ہی غلط سمایا ہوا تھا۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ حکومت ایک محدود و مخصوص طبقہ کا حق ہے اور عوام کالانعام کا فرض ہے کہ اس کی قوت کے آگے سربسجود رہیں۔ حکمران طبقہ کا کام حکومت کرنا، اور محکوم جماعت کا کام حکومت سنبھالے۔ سلاطین و امراء کے احکام و فرامین میں رعایا کو چون و چرا کو مطلق دخل نہیں۔ اس کلیہ کی ایک لازمی تفریع یہ تھی کہ رعایا کو ہمیشہ جاہل رکھا جائے کہ مبادا تعلیم کی اشاعت سے اس میں مطالبہ حقوق کا احساس پیدا ہو۔ غرض اسی طرح کے اصول جن پر آج کوئی صاحب عقل ایک لمحہ کے لئے بھی اعتنا نہیں کرتا۔ اس زمانہ کے حکمران اہل حل و عقد کے عقاید میں داخل تھے اور ان پر برابر عملدرآمد ہوتا ناظرین ان خیالات کو یقیناً عجیب و غریب سمجھتے ہوں گے۔ لیکن دراصل ان سے عجیب تر یہ واقعہ ہے کہ یہ تمام خیالات یکسر مٹ گئے اور کیونکر؟ بغاوت و بلوہ کے زور سے نہیں غدر و بدامنی پیدا کر کے نہیں، قتل و خونریزی کے بعد نہیں بلکہ محض

دماغی ارتقاء سے۔ تمدن انگلستان کی عظمت و فضیلت کی اس سے بڑھکر اور کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ جو مقصد دوسروں نے خون کی ندّیاں بہا کر اور اپنے نام پر تاریخ کے صفحات میں ایک دائمی داغ لگا کر حاصل کیا وہ انگلستان نے اس خاموشی امن و سکون کے ساتھ حاصل کر لیا کہ کسی کی تکسیر تک نہ چھٹنے پائی۔ اس حیرت انگیز، اس معجزانہ، اس محیر العقول، کامیابی کا اصلی راز، علاوہ اُن اسباب کے جن کا ذکر آگے آئے گا قوم کے اس دماغی نشو و نما، اس علمی بیداری، اس اشاعت تعلیم میں ملتا ہے جو سولھویں صدی میں انگلستان کو نصیب ہو گئی ہے اور حق یہ ہے کہ اس خصوص میں انگلستان کو یورپ کے تمام دیگر ممالک پر تفوق و فضیلت حاصل ہی پھر اس میں ہمارے قومی خصایص بھی ایک بڑے حد تک مُعین ہوئے۔ اصلاح پسندی و آزاد خیالی کے ساتھ موقع شناسی و مآل اندیشی کے امتزاج نے ہماری قوم کو اس قدر محتاط بنا دیا کہ عجلت و اضطراب سے محترز رہ کر ہم سنجیدگی صبر و استقلال کے ساتھ مطالبۂ حقوق کیا کئے اور گو کامیابی لامحالہ ایک عرصۂ دراز میں ہوئی لیکن ہمارے فخر کے لئے یہ کیا کم ہے کہ بالآخر بغیر دنیا میں کوئی ہلچل ڈالے اور بغیر کوئی انقلاب برپا کئے ہمیں وہ شئے حاصل ہو گئی جس کے لئے دوسروں کو ہزاروں لاکھوں جانیں قربان کرنا پڑیں۔ ہمارا یہ مقصد نہیں اور نہ ہو سکتا ہے کہ کسی حصۂ ملک میں کبھی کسی گروہ نے سرکشی کی ہی نہیں یہ کیونکر ممکن تھا بلکہ ہمارا مقصود یہ کہنا ہی کہ قوم نے من حیث القوم نے کبھی بغاوت و شورش کا اقدام نہیں کیا، اور اصول اصلاح کو بجائے فوری و عاجل انقلاب کے ارتقاء تدریجی پر چھوڑ دیا جس کا نتیجہ ملک، قوم، بلکہ ساری دنیا کے لئے بہتر و خوشگوار رہا۔

اصلاحی تحریک کی طرف مستقل طور پر عملی اقدام اُنیسویں صدی کی ابتدا سے شروع ہوا اور اس نصف صدی کی مدت میں (یعنی کتاب ہذا کی تاریخ تصنیف تک

ذکر کافی ہی کہ اس تحریک کا قدم روز بروز بڑھتا رہا ہے اور کبھی پیچھے نہیں ہٹا۔ قوانین مندرجہ حاشیہ[1] نے ایک ایک کر کے استبداد کی ساری طاقتوں کو شکست کر دیا ہے۔ اب نہ دار العوام میں زمینداروں کا اقتدار رہی اور نہ پروٹسٹنٹوں کی اتنی مجال رہ گئی ہے کہ کیتھولکوں کو پامال کرسکیں۔ جمہوریت اب ایک حقیقت مسلّم ہے، جس کی قوت سے دوست دشمن کسی کو انکار نہیں ہوسکتا۔ فرق یہ ہے کہ موافقین اس کا خیر مقدم کرتے ہیں اور مخالفین کے ابرو پر بل پڑجاتے ہیں۔ مگر اس کی زبردست قوّت کے اعتراف سے انھیں بھی چارہ نہیں۔ زمانہ اس قدر بدل گیا ہی کہ ہمارے وہی اہلِ حل و عقد جو نصف صدی پیشتر اس کے پُرزور مخالف ہوتے، آج اس کے آگے اپنا سر خم کئے ہوئے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ کوئی کہتا ہی تو یہ کہتا ہے کہ جمہور کو ہمیں زیادہ صحیح معلومات بہم پہنچا کر اپنا ہمخیال بنانا چاہئے لیکن یہ کہنے کی کسی کو جرأت نہیں ہوتی کہ جمہور کے خیالات کو نظر انداز کر دینا چاہئے۔

یہ ہے فرق ہمارے زمانہ کے ارکان حکومت اور جارج سوم کے زمانہ کے اہل حل و عقد میں۔ ناظرین نے دیکھا کہ عام رائے کو یہ کامیابی کس قدر سخت جد و جہد و معرکہ آرائیوں کے بعد حاصل ہوئی۔ جارج سوم اور اُس کے رفقا، استبداد و زبان بندی کے قابل نفرت دستور کو زندہ و قایم رکھنا چاہتے تھے۔ لیکن نتیجہ یہ ہوا کہ خود ہی قایم نہ رہ سکے۔ کاش ہمارے موجودہ مدبرین سلطنت اس مثال سے عبرت حاصل کریں اور یہ خیال باطل اپنے دل سے نکال دیں کہ وہ زمانہ کی ہوا کو بدل سکتے ہیں۔ جارج سوم اور اس کے رفقا کی قوت و عظمت میں کس کو کلام ہو سکتا ہے۔ لیکن زمانہ کی طاقت ان سے بھی زیادہ زبردست تھی۔ جب اس سے مقابلہ پڑا، تو آخر انھیں شکست کھانا پڑی۔

[1] Emancipation of the Catholics

Repeal of the Corn Laws. Reform Bill.

ہمارے مغرور و برخود غلط مدبرین سلطنت کو سمجھنا چاہیے کہ اتفاقات سے انھیں جو چندروزہ قوت حاصل ہو جاتی ہے وہ کس قدر کم مایہ و بے حقیقت ہے! وزارت یا مجلس وضع قوانین کی رکنیت اُن کے لئے باعث فخر ہو تو ہو لیکن زمانہ کی زبردست قوت کے مقابلہ میں اس کی کیا اصل ہے! قانون بنا کر پاس کر دینا بیشک اُن کے اختیار میں ہے۔ لیکن کائنات کی رفتار جس رُخ پر ہے اُسے روکنا اُن کے امکان میں نہیں۔ واقعات و حوادث عالم کی روک تھام کرنا ان کے بس کی بات نہیں۔ وہ اپنے تئیں جمہور کا امام و رہبر سمجھنے لگتے ہیں حالانکہ حقیقت حال اس کے برعکس ہے۔ وہ پیرو ہیں، رہبر جمہور نہیں۔ اُن کے فخر و عظمت کے لئے اسی قدر کافی ہے کہ زمانہ کے رُخ کو پہچان کر اس پر چلیں زمانہ کی ضرورت و مقتضایات ہر گھڑی بدلتے رہتے ہیں۔ بس یہ کیسی بے عقلی کی بات ہے کہ بعض اکابر سیاسی اپنے چند "اصول" پر اڑے بیٹھے رہتے ہیں اور اس سعی ناکام میں اپنی عمر ضائع کر دیتے ہیں کہ آنکھ بند کر کے ہر موقع اور ہر محل پر انھیں پر عمل کریں۔

ارباب حل و عقد نے عام رائے کو یہ آزادی دی نہیں، بلکہ انھیں دینا پڑی وہ اس پر کسی طرح رضامند نہ تھے، لیکن خود عام رائے کی قوت نے ان کی گردن کو نیچا کر کے چھوڑا۔ اور ایسا ہر زمانہ میں ہوتا رہا ہے۔

تمت

مشاہیرِ یونان و روما

انجمن ترقی اُردو نے ترجمے کے واسطے جن کتابوں کو منتخب کیا ہے ان میں حکیم پلوٹارک یونانی کی کتاب السیر سب سے ضخیم اور بلند پایہ ہے۔ اس کے اُردو ترجمے کی پہلی جلد حال میں شائع ہوتی ہے اور مقدمۂ مترجم سمیت پانسو سے زیادہ صفحات پر مشتمل ہے۔ کتاب کا موضوع قدیم رُومی اور یونانی مشاہیر کے حالات زندگی ہے لیکن ان کو لکھنے میں مصنف نے سیرت نگاری کا وہ کمال دکھلایا ہے جس کی نظیر دنیا کے علم ادب میں کہیں نہیں ملتی اور اسی لئے یہ کتاب انسان کی اخلاقی تربیت کا ایک زبردست وسیلہ مانی گئی ہے جس کی منزلت کو اس کی تاریخی حیثیت نے بڑھا دیا ہے کہ دَورِ قدیم کے بہترین تمدن کی وہ بہترین تماشا گاہ ہے جس میں یونان و روما کے زندۂ جاوید اضعانِ قوانین، ملکی رہنما، مشاہیر رجال سیاسی، اور خداوندانِ لبت و کشاد معلوم ہوتا ہے کہ گویا ہمارے سامنے کھڑے ایکٹ کر رہے ہیں اور واضح رہے کہ عرصہ گزشتہ کا یہی وہ درخشاں زمانہ ہے اور یہی وہ عالی رتبہ اقوام ہیں جن کی تاریخ مترجم کے الفاظ میں "یورپ کی موجودہ تمدنی اور ذہنی ترقیوں کا پہلا باب ہے" انسانی تہذیب کے برگزیدہ باتیں اسی زمانے میں پھلے پھولے اور انہی ممالک میں سب سے اول حضریت۔ جمہوریت، عدل اور قانون کی نگاہ افروز روشنی پھیلی۔ ہمارے ملک میں رومۃ الکبریٰ کی کے حالات بہت ہی کم لوگوں کو معلوم ہونگے حال آنکہ یونانی آئین اور رومی جمہوریت کے اصول کی تعلیم جن بدنصیب قوموں کے لئے سب سے زیادہ ضروری ہے وہ اہل مشرق ہی ہیں۔ اس بے بہا کتاب کو اُردو داں طبقے سے روشناس کرنے میں انجمن ترقی اُردو مبارکباد کی مستحق ہے۔

قیمت بلا جلد دو روپیہ آٹھ آنے (عـہ) مجلد تین روپیہ (ـــعہ)

ملنے کا پتہ:۔

دار الاشاعت انجمن ترقی اُردو، اورنگ آباد (دکن)

بفضلِ خدا

انسٹی ٹیوٹ پریس میں (جو سر سید علیہ الرحمۃ کا قایم کیا ہوا اور محمڈن کالج کی مِلک ہونے کی وجہ سے حقیقی معنوں میں ایک قومی پریس ہی) لوہے اور پتھر دونوں قسم کے چھاپوں میں عربی وفارسی، اُردو و انگریزی ہر قسم کا کام بہت صحت اور کفایت سے ہوتا ہی اور وقت پر دیا جاتا ہی۔ جناب مولٰنا عبدالحق صاحب بی اے آنریری سکرٹری انجمنِ ترقی اُردو تحریر فرماتے ہیں :-

"میں جب کبھی کسی مطبع کی تعریف لکھی دیکھتا ہوں تو مجھے یقین نہیں آتا، اس لئے کہ مجھے جن جن مطبعوں سے سابقہ پڑا اُنھوں نے میری بدگمانی اور بڑھادی۔ البتہ آپ کا ایک مطبع مجھے مستثنیٰ نظر آتا ہی۔ آپکے مطبع نے انجمن کی کتابیں وعدہ کے مطابق جلد چھاپی، اچھی چھاپی اور صحیح چھاپی۔ یہ تین باتیں ایسی ہیں جو عموماً ہمارے اُردو مطابع میں (جہاں تک میرا تجربہ ہی) کم پائی جاتی ہیں۔"

ہر قسم کی خط وکتابت کے لئے پتہ :-

منیجر انسٹیٹیوٹ پریس علیگڑھ

٣٤١٠٣ ع

[illegible]

سلسلۂ انجمن ترقی اردو

نمبر ۲۱

تاریخِ تمدّن

حصّہ دوم

سر ہنری بکل کی مشہور عالم تصنیف "ہسٹری آف سویلزیشن"

مترجمہ

منشی احمد علی صاحب مرحوم بی اے ایل ایل بی کاکوروی

و

مولوی عبدالماجد صاحب بی اے ایم آر اے ایس ایم اے ایس بی

باہتمام محمد مقتدیٰ خاں شروانی

مطبع انسٹی ٹیوٹ علی گڈھ کالج میں طبع ہوئی

تاریخِ تمدن

(حصۂ اوّل)

یعنی اسی کتاب کا پہلا حصہ جس میں مصنف نے بڑے دعوے کا نظریہ قائم کیا ہے کہ اگر کافی غور و تحقیق سے مطالعہ کیا جائے تو انسان کی تاریخ علم نظری کے بجائے علوم تجربی یا حکمیات (یعنی سائنس) کا مرتبہ پا سکتی ہے۔ کیونکہ انسان کسی قدر ترقی کیوں نہ کر چکا ہو اس کے عقل و جذبات فطرت کے غیر متبدل قوانین کی ماتحتی سے آزاد نہیں ہیں۔ اس لئے اگر اور حالات یکساں ہوں تو انسان سے وہی افعال سرزد ہونگے جو اُن حالات میں پہلے سرزد ہو چکے ہیں۔ گویا دور گزشتہ کی مفصل رُوداد ہمارے سامنے ہو تو ہم ایسے کلیہ قاعدے قائم کر سکتے ہیں جن کا پورے یقین صحت کے ساتھ آئندہ اور موجودہ حالات پر انطباق کیا جا سکے۔ ان کلی نتائج تک پہنچنے کے واسطے سب سے پہلے ہمیں ان اسباب طبیعی کا تفحص کرنا چاہیئے جو کرۂ ارض کے مختلف منطقوں پر مختلف اثر ڈال رہے ہیں۔ یہی وہ اثرات ہیں جنہوں نے سرد و گرم اور خشک و مرطوب ممالک میں بالکل علیحدہ اور متضاد قسم کے تمدن کی بنیاد رکھی۔ چنانچہ مصنف ایشیا میں ہندوستان میں، افریقہ میں ملک مصر اور امریکہ میں ممالک پیرو و میکسیکو کی مثالیں پیش کرتا ہے جہاں آب و ہوا مرطوب و گرم اور زمین اتنی سیر حاصل ہے کہ اپنی آسان پیداوار سے کثیر آبادی کی پرورش کر سکتی ہے۔ لیکن معاش کی انہی سہولتوں کا ایک عجیب مگر لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کے قوائے دماغی کی سستی انہیں سخت قدامت پرست اور حد درجے غلامی پسند بنا دیتی ہے! اور اگر ایک طرف ملکی اختیار و اقتدار جمہور کے قبضے سے نکل کر مطلق العنان بادشاہوں یا جابر امیروں کا ورثہ ہو جاتے ہیں تو دوسری طرف خاص خاص عقاید اور اوہام باطلہ کی بنیاد پڑتی ہے۔ آگے چل کر مصنف نے یونان اور ہندوستان کے قدیم تمدن کا مقابلہ کیا ہے اور اپنے کلیات کی ایسی زبردست شہادتیں فراہم کی ہیں کہ ان پر حرف گیری کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ ساری بحث اتنی دل کش اور پُر لطف ہے کہ اس کے مطالعے میں محویت و سرور کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور ساتھ ہی ہر ورق پڑھ کر آدمی محسوس کرتا ہے کہ اس کے علم میں کچھ نہ کچھ اضافہ ہو رہا ہے۔

قیمت کتاب غیر مجلد ایک روپیہ چار آنے (عہ)

ملنے کا پتہ:-

دار الاشاعت انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد (دکن)

تاریخِ تمدّن

حصہ دوم

نوٹ:- باب ششم (صفحہ ۱۵۶) پر منشی احد علی صاحب مرحوم کا
ترجمہ ختم ہو جاتا ہی اور بابِ ہفتم (صفحہ ۱۵۷) سے
مولوی عبدالماجد صاحب کا شروع ہوتا ہی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تاریخ تمدّن

حصّۂ دوم

فہرست مضامین

باب	مضمون	صفحہ
سوم	ماہرین علم مابعد الطبیعیات جس طریقہ سے نوامیس ذہنی کا پتہ لگاتے ہیں اُس کی تنقید	۱
چہارم	نوامیسِ ذہنی یا اخلاقی ہیں یا عقلی۔ مقابلۂ نوامیس اخلاقی اور نوامیسِ عقلی کا اور اُس اثر کی تحقیق جو ان میں سے ہر ایک سوسائٹی کی ترقی پر ڈالتے ہیں	۱۴
پنجم	مذہب، علوم و فنون اور حکومت کے اثر کی تحقیق	۶۲
ششم	فنِ تاریخ کا آغاز اور قرونِ متوسطہ میں فنِ تاریخ کی حالت	۱۲۵
ہفتم	انگلستان کی اجمالی علمی تاریخ	۱۵۷

باب سوم

ماہرینِ علم مابعد الطبعیات جس طریقہ سے نوامیس ذہنی کا پتہ لگاتی ہیں اُس کی تنقید

میں نے جو شہادت مُہیّا کی ہے اُس سے دو اہم امور کا مُسلّم قرار پانا پایا جاتا ہی اور یہ امور جب تک کہ اُن کی تردید نہ کی جاوے تاریخ عالم کی لازمی بنیاد ہیں۔ پہلا امر یہ ہے کہ جو تمدن یورپ کے باہر قایم ہوئے اُن میں بمقابلہ یورپ کے اسباب طبیعی کا بہت زیادہ دخل تھا اور دوسرا امر یہ ہی کہ اُن اسباب طبیعی نے سخت نقصان بھی پہنچائے۔ درآنحالیکہ اُن کی ایک صنف نے دولت کو غیر مساوی طور سے تقسیم کیا اُن کی دوسری صنف نے توجہ کو ایسے امور پر مرکوز کر کے جو قوت متخیلہ کو برانگیختہ کرنے والے تھے تخیل کو غیر مساوی طور سے تقسیم کیا۔ جہاں تک کہ زمانہ گزشتہ کا تجربہ ہماری رہبری کر سکتا ہی ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یورپ سے باہر کے کل تمدنوں میں یہ رکاوٹیں ایسی تھیں جو دُور ہو نہیں سکتی تھیں! در واقعی یہ بات ہی کہ اب تک کسی قوم کو ایسی مزاحمتوں پر غلبہ نصیب نہیں ہوا لیکن چونکہ دنیا کے دیگر اقطاع کی بہ نسبت یورپ ایک چھوٹے پیمانہ پر بنا ہی، سرد تر اقلیم میں واقع ہی، وہاں کی زمین بھی کم زرخیز ہی صورت ظاہری بھی زیادہ شاندار نہیں ہی اور آثار طبیعی کا عمل بھی وہاں بہت ہی کمزور تھا اس لئے وہاں انسان کے واسطے یہ زیادہ آسان تھا کہ اُن اوہام و وساوس کو دل میں آنے نہ دے جو فطرت اُس کی قوت متخیلہ کے سامنے پیش کرتی تھی نیز اُس کے واسطے یہ بھی زیادہ سہل تھا کہ دولت کی تقسیم اگر بالکل برابر نہیں تو قریب قریب اس قدر برابر تو کر دے جتنی کہ ممالک قدیم میں ہونا ممکن نہ تھی۔

اسی بنیاد پر جب بحیثیت مجموعی تاریخ عالم پر نظر ڈالی جاتی ہی تو معلوم ہوتا ہے کہ یورپ میں

تو یہ میلان تھا کہ فطرت انسان کی مطیع و منقاد رہے اور یورپ سے باہر یہ میلان تھا کہ انسان فطرت
کا تابعِ فرماں رہے۔ اس کلیہ کے چند استثنا غیر مہذب ملکوں میں ہیں لیکن متمدن ملکوں میں یہ کلیہ
بالکل عام ہے۔ لہذا یورپ کے تمدّن اور یورپ سے باہر کے تمدن میں جو یہ بڑی بھاری تفریق
تھی وہ فلسفۂ تاریخ کی بنیاد ہے کیونکہ اُس سے یہ مفید نتیجہ نکلتا ہی کہ مثلاً اگر ہم ہندوستان کی
تاریخ کو سمجھنا چاہتے ہیں تو ہم کو سب سے پہلے عالم خارجی پر غور کرنا چاہیئے کیونکہ وہاں عالم خارجی
نے جو اثر انسان پر ڈالا ہے وہ اس اثر سے کہیں زیادہ ہی جو انسان نے عالم خارجی پر ڈالا ہے۔
برخلاف اس کے اگر ہم کسی ایسے ملک کی تاریخ سمجھنا چاہیں جیسا کہ فرانس یا انگلستان ہے تو ہم کو
وہاں خاص کر کے انسان ہی کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ کیونکہ وہاں فطرت کے نسبتہً کمزور ہونے کی
وجہ سے میدان ترقی میں جو قدم آگے بڑھا ہی اُس نے ذہن انسانی کی حکومت کارکنان عالم خارجی
پر بڑھائی ہی حتی کہ جن ملکوں میں انسان کی قوّت درجۂ کمال پر پہنچ گئی تھی وہاں اگرچہ فطرت کا
دباؤ پھر بھی بہت زیادہ ہی لیکن ہر ایک نسل مابعد میں یہ دباؤ گھٹتا چلا جاتا ہے۔ کیونکہ ہم کو اپنے
ترقی پذیر علم سے اتنی زیادہ قابلیت تو حاصل نہیں ہوتی کہ ہم فطرت کو بالکل اپنے قابو میں کر لیں
مگر اتنی قابلیت ضرور پیدا ہو جاتی ہی کہ ہم اُس کے اثرات کی بابتہ پیشین گوئی کر سکیں اور اس طور
سے ہم اپنے آپ کو اُن نقصانات سے محفوظ رکھ سکتے ہیں جو دوسری صورت میں (یعنی جبکہ ہم فطری
اثرات کی بابتہ پیشین گوئی کرنے کی قابلیت بھی نہ رکھتے) پیش آتے۔ اس بارہ میں ہماری کوششیں
کس قدر سرسبز ہوئی ہیں وہ اس بات سے واضح ہی کہ اوسط مدت عمر برابر بڑھتی اور ناگزیر خطرات کی تعداد
گھٹتی چلی جاتی ہے۔ اور پھر جس بات نے اس کو زیادہ تر قابل لحاظ بنا دیا ہی وہ یہ ہے کہ انسانوں کا
شوق تحقیق ترقی پر ہے اور اُن کے باہمی تعلقات کسی زمانہ سابق کے بہ نسبت زیادہ قریبی اور قوی
ہو رہے ہیں۔ اس لئے گو ظاہری خطرات بڑھ گئے ہیں لیکن تجربہ سے معلوم ہوتا ہی کہ بہیئت مجموعی اصلی
خطرات میں کمی ہو گئی ہے۔

پس اب اگر ہم تاریخ یورپ کو حتی الامکان وسیع ترین نظر سے دیکھیں اور اپنے آپ کو اُس اوّلین

سبب کی تحقیق میں کلیتہً مصروف کردیں جس نے یورپ کو اورکل اقطاعِ عالم پر فایق کردیا ہے
تو ہم اس جزیہ پر جا کے ٹھیریں گے کہ انسان کے قوائے ذہنی نے ہیولائی اور غیر ہیولائی قوائے فطرت
پر غلبہ حاصل کیا ہے اور تمام اسباب اسی سبب اوّلین کے تحت میں آتے ہیں کیونکہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ جہاں
کہیں قوائے فطرت کی ایک خاص حد تک رسائی ہوئی ہے وہاں ملکی تمدن بے قاعدہ طور پر ترقی پذیر
ہوا ہے اور تمدن کی باقاعدہ پیش قدمی رُک گئی ہے۔ لہذا سب سے پہلے جو شے ضروری و لابُدی تھی وہ
یہ تھی کہ اُن آثار طبیعی کی مداخلت محدود کردی جائے اور یہ کام وہیں زیادہ تکمیل کے ساتھ سرانجام
پاسکتا تھا جہاں آثار فطرت نہایت کمزور اور سب سے کم نمایاں تھے۔ یورپ کا حال یہی تھا۔ اس وجہ
صرف یورپ ہی میں انسان کو حقیقتاً قوائے فطرت پر قابو پانے، اُن کو اپنی مرضی کے مطابق بنانے،
اُنھیں معمولی راستہ سے علیحدہ کرنے اور اپنے لیے موجب مسرت ہونے پر مجبور اور حیات انسانی کے عام
اغراض کے موید کرنے میں کامیابی ہوئی۔

اس شاندار اور کامیاب کشمکش کی نشانیاں ہمارے گرد و پیش ہر طرف موجود ہیں اور بیشک یہ
معلوم ہوتا ہے کہ یورپ میں کوئی بات ایسی نہ تھی جس پر دست تصرف دراز کرنے میں انسان کو کچھ
خوف و خطر ہوتا۔ سمندر کی طغیانیاں روکی گئیں اور ملک کے ملک (مثلاً ہالینڈ) اُس کے چنگل سے
چھڑا لیے گئے۔ پہاڑ کاٹے گئے اور اُن کے بیچ میں ہموار سڑکیں نکالی گئیں۔ سنگلاخ اور سرزمینیں صرف
علم کیمیا کی ترقی کی بدولت سیر حاصل بن گئیں۔ پھر آثار برقی میں ہم دیکھتے ہیں کہ ایک تیز، سیال، نہایت
ہی زود رفتار اور سب سے بڑھکے پُراسرار قوت تبادلہ خیالات کا ذریعہ بن گئی اور انسان کے نہایت
ہی متلون احکام کی مطیع و منقاد ہو گئی۔

اور مقامات پر جہاں عالم خارجی کی پیداواریں غیر مطیع تھیں وہاں انسان ان اشیا کے
پامال کرنے میں کامیاب ہوا ہے جن پر اُس کو غلبہ حاصل کرنے کی اُمید مشکل سے ہوسکتی ہے۔ یورپ کے
متمدن حصص سے نہایت ہی مہلک بیماریاں (جیسے طاعون اور قرون وسطےٰ کا جذام) بالکل غائب
ہو گئی ہیں اور یہ مشکل ممکن ہے کہ وہ پھر کبھی وہاں دیکھی جائیں۔ وحشی درند اور شکاری پرند فنا کردیے گئے

اور اب اُن کو مہذب انسانوں کے مسکنوں میں کلبلیں مارنے اور منڈلانے کی اجازت نہیں دیجاتی وہ خوفناک قحط جو یورپ کو ہر صدی میں کئی مرتبہ پامال کیا کرتے تھے موقوف ہو گئے ہیں اور ہم لوگ ایسی کامیابی کے ساتھ اُن سے دست و گریباں ہوئے ہیں کہ اب ذرّہ برابر اس کا اندیشہ نہیں رہا ہی کہ وہ پھر کبھی اُسی سختی کے ساتھ واپس آئیں گے۔ درحقیقت اب ہمارے وسائل اس قدر وسیع ہیں کہ بد سے بدتر صورت میں بھی صرف ایک خفیف اور عارضی خشک سالی سے مقابلہ کرنا پڑے گا کیونکہ ہماری معلومات کی جو حالت اب ہی اُس کی وجہ سے ہم اوّل ہی اوّل اُس خرابی کا انسداد اُن تدبیروں سے کر دیں گے جو علم کیمیا سے مستفاد ہوتی ہیں۔

اب اس بات کا بیان کرنا چنداں ضروری نہیں ہے کہ کیونکر بہت سی دوسری صورتوں میں تمدّن یورپ کی ترقی بہت کم عالم خارجی سے متاثر ہوئی ہے۔ اس سے میرا مطلب بلاشبہ اُن خصوصیات سے ہی جن کا وجود خواہشات انسانی سے غیر متعلق ہی اور جن کو اُس نے پیدا نہیں کیا ہی۔ یورپ کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ قومیں بحالت موجودہ اصلی مظاہر فطرت کی (نسبتہً) بہت کم شرمندۂ احسان ہیں حالانکہ انھیں مظاہر فطرت نے یورپ سے باہر ہر ایک تمدن میں بے حد اثر کیا ہی۔ مثلاً ایشیا میں اور نیز اور مقامات میں تجارت کا رُخ، لین دین کی حد و غایت اور اسی قبیل کے اور حالات و معاملات دریاؤں کی موجودگی اور اُن میں کشتی رانی کی آسانیوں اور قریب کے بندرگاہوں کی تعداد اور عمدگی پر منحصر ہیں لیکن یورپ میں یہ طبیعی خصوصیات کے مقابلہ میں انسان کی ہنرمندی اور مستعدی سے زیادہ فیصلہ کُن سبب تھے۔ اگلے زمانہ میں سب سے زیادہ دولت مند ملک وہی تھے جہاں فطرت نے سب سے زیادہ فیاضی دکھائی تھی۔ اب سب سے بڑھکے تمول اُس ملک میں ہی جس میں انسان سب سے بڑھکے کارگزار ہی۔ کیونکہ ہمارے وقت کے دورۂ عالم میں اگر فطرت بے فیض ہوتی ہے، تو ہم جانتے ہیں کہ اُس کی اس بےفیضی (یا خسّت)، کی تلافی کیونکر ہو سکتی ہے۔ اگر کوئی دریا کشتیوں کے لئے ناقابل عبور ہی یا کوئی ملک ایسا ہی جس میں سفر کرنا دشوار ہی تو ہمارے انجنیر اُس کی اصلاح و درستی اور جو کچھ خرابی ہو اُس کا علاج کر سکتے ہیں۔ اگر ہمارے یہاں دریا نہوں تو ہم نہریں بنا لیتے ہیں

اگر ہمارے یہاں فطری بندر نہوں تو ہم مصنوعی بندرگاہیں قایم کر سکتے ہیں۔ یہ رجحان آثار فطری کی نقایص کی اصلاح کا ایسا نمایاں ہی کہ تقسیم آبادی کے معاملہ تک میں اپنی جھلک دکھارہا ہے کیونکہ یورپ کے سب سے زیادہ متمدن حصص میں شہروں کی آبادی دیہات کی حدود سے متجاوز ہوتی چلی جاتی ہے اور یہ بالکل بدیہی بات ہی کہ جس قدر زیادہ انسانوں کا اجتماع بڑے بڑے شہروں میں ہوگا اُسی قدر زیادہ وہ اس بات کے عادی ہوں گے کہ اپنے خیالات کا مواد انسانی زندگی کے کاروبار سے اخذ کریں اور اُسی قدر کم اُن کی توجہ فطرت کے اُن خصوصیات پر مبذول ہوگی جو اوہام و وساوس کے پیدا کرنے کا زرخیز ذریعہ ہیں اور جن کی بدولت یورپ سے باہر کے ہر ایک تمدن میں انسان کی ترقی میں مزاحمت ہوتی رہی۔

ان امور سے صاف صاف یہ قیاس کیا جاسکتا ہی کہ تمدن یورپ کی پیش قدمی ہمیشہ نوامیس طبیعی کے زور گھٹنے اور نوامیس ذہنی کے اثر بڑھنے سے وابستہ رہی ہے۔ اس استقراء کی مکمل شہادت صرف تاریخ سے مُہیّا ہو سکتی ہی اور اسی وجہ سے میں اس شہادت کا بڑا حصّہ جس پر وہ مبنی ہے اس تصنیف کی آیندہ جلدوں کے لئے اُٹھائے رکھتا ہوں۔ لیکن یہ بات کہ اصولاً یہ قضیہ صحیح ہی اسے ہر ایسا شخص قبول کرے گا جو علاوہ متذکرہ بالا دلایل کے ان دو مقدمات کو تسلیم کرلے گا جن میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں جس پر زیادہ چون وچرا کی جاسکے۔ مقدمۂ اولی یہ ہے کہ ہمارے پاس اس کا کوئی ثبوت نہیں ہی کہ کسی زمانہ میں بھی فطرت کی قوتیں مستقلاً بڑھ گئی ہوں اور یہ کہ ہم کو اس بات کی توقع کرنے کی بھی کوئی وجہ نہیں ہے کہ ایسی کوئی بیشی (یا ترقی) کبھی واقع ہوگی۔ مقدمۂ ثانیہ یہ ہے کہ ہمارے پاس اس کے بکثرت ثبوت موجود ہیں کہ نفس انسانی کے سروسامان زیادہ پرزور، زیادہ کثیر التعداد اور عالم خارجی کی مشکلات سر کرنے کے واسطے زیادہ قابل ہوگئے ہیں۔ کیونکہ ہماری معلومات میں جیسا جیسا اضافہ ہوتا جاتا ہی اُس سے ہم کو نئے نئے سامان ایسے ملتے جاتے ہیں جن کے ذریعہ سے یا تو ہم فطرت کے حرکات و افعال کو اپنے بس میں لاسکتے ہیں یا اگر یہ نہ کرسکیں تو اُس کے نتایج کو پیش از پیش جان سکتے اور اُن نتایج کو جان کر اُن سے

بچ سکتے ہیں بہرکیف جو دباؤ کارکنان خارجی کا ہم پر ہے ہم اُسے گھٹا سکتے ہیں۔

اگر یہ دونوں مقدمات مسلم ہیں تو ہم ایسے نتیجہ پر پہنچ گئے ہیں جو اس مقدمۃ الکتاب کے واسطے بڑا قابل قدر ہے۔ کیونکہ اگر تمدن کا معیار نفس انسانی کا کارکنان خارجی پر ظفرمند ہونا ہے تو یہ صاف وصریح بات ہے کہ جو نوامیس (یا قوانین) انسانی ترقی کے رہنما ہیں ان میں سے ذہنی قسم کے نوامیس بہ نسبت طبیعی قسم کے نوامیس کے زیادہ بکارآمد اور اہم ہیں۔ درحقیقت اس بات کو اہل نظر کے ایک گروہ نے بطور حقیقت نفس الامری کے فرض کر لیا ہے۔ اگرچہ مجھے اس کی خبر نہیں ہے کہ اُس کے تسلیم کر لینے کے واسطے اس قسم کی کوئی کوشش بھی کی گئی ہے جو ایک کامل تحلیل کے قریب پہنچی ہو۔ بہر نوع میری دلیل کے انوکھے پن کی نسبت جو سوال کیا جائے گا وہ کسی قدر قابل لحاظ ہوگا لیکن ہم کو جو بات دیکھنا ہے وہ یہ ہے کہ ہماری تحقیقات کی اس درجہ میں وہ مسئلہ جس سے ہم نے بحث کا آغاز کیا ہے حل ہو گیا ہے اور تاریخ یورپ کے قوانین کی تحقیقات سب سے پہلے نفس انسانی کے قوانین کی تحقیقات کی شکل اختیار کر چکی ہے اور جس وقت یہ نوامیس ذہنی تحقیق ہو جائیں گے اُس وقت وہ تو تاریخ یورپ کی صحیح بنیاد قرار دیئے جائیں گے اور نوامیس طبیعی کم اہم اور کم کارآمد سمجھ لئے جائیں گے کیونکہ وہ (نوامیس طبیعی) صرف کچھ اختلال ہی پیدا کرتے رہتے ہیں اگرچہ اب اُن کے اختلال کا زور اور اُن کا بار بار واقع ہونا بھی کئی صدیوں سے محسوس طور پر گھٹتا چلا جاتا ہے۔

اب اگر ہم نفس انسانی کے قوانین کے دریافت کرنے کے ذرائع کی چھان بین کرتے ہیں تو اس کے جواب میں مابعد الطبیعیات والے سب سے پہلے ہم کو اپنی مساعی کی طرف لے جاتے ہیں کیونکہ اُن کے نزدیک اسی صورت سے یہ گتھی بہت قابل اطمینان طریقہ سے سُلجھ گئی ہے۔ اس لئے یہ بات ضروری ہوئی جاتی ہے کہ ہم پہلے اُن کے انکشافات کی قدر وقیمت کو جانچ لیں، اُن کے سازوسامان کی حدونہایت کی دیکھ بھال کر لیں اور سب سے بڑھکے یہ کہ اُس طریقہ کی عمدگی و خوبی کو پرکھ لیں جس پر وہ ہمیشہ چلتے ہیں اور جس کی بابتہ اُن کا یہ بیان ہے کہ صرف اُسی طریقہ پر چلنے

سے بڑے بڑے حقایق کا پتہ لگ سکتا ہی۔

مابعد الطبعیات کا طریقہ اگرچہ ضرورتاً (یا عملاً) دو صنفوں میں منقسم ہوتا ہے لیکن اپنی اصل (یا بدایت) میں ہمیشہ ایک ہی رہتا ہے اور اس پر مبنی ہوتا ہے کہ ہر ایک شخص خود اپنے نفس کی حرکات کا مطالعہ کرے۔ یہ طریقہ براہ راست تاریخی طریقہ کا جوڑ (یا جواب) ہی۔ کیونکہ اہل مابعد الطبعیات صرف ایک نفس کا مطالعہ کرتے ہیں اور اہل تاریخ بہت سے نفوس کا۔ اب سب سے پہلی بات جو اس بارہ میں کہنے کے قابل ہی یہ ہے کہ مابعد الطبعیات کا طریقہ ایسا نرالا ہی جس سے اب تک علم کی کسی شاخ میں کوئی انکشاف نہیں کیا گیا ہے اور ہم کو جو امور اس وقت تک معلوم ہوئے ہیں وہ صرف اُن آثار کے مطالعہ سے معلوم ہوئے ہیں جن سے (اُس وقت کہ جب کل اتفاقی خلل اندازیاں ہٹ جاتی ہیں) کوئی قانون یا کلیہ قاعدہ نمایاں طریقہ سے نظر آنے لگتا ہی۔ اور یہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ جب اتنے متعدد مشاہدات کئے جائیں کہ جن سے وہ خلل اندازیاں علیحدہ ہو جائیں یا جب ایسے نازک تجربے کئے جائیں کہ جن سے وہ آثار اپنے مرتبۂ ذات میں منفرد نظر آجائیں۔ ان دو شرائط میں سے ایک نہ ایک شرط (یعنی مشاہدات یا تجربے کرنا) کل حکمت استقرائی کے واسطے لابد ہے لیکن اہل مابعد الطبعیات ان میں سے کسی پر کاربند نہیں ہوتے۔ اُن کے واسطے یہ تو محال ہی کہ وہ آثار کو اپنے مرتبۂ ذات میں منفرد کر سکیں کیونکہ کوئی شخص بھی (چاہے وہ کیسے ہی خواب وخیال میں پڑا ہو) اپنے آپ کو اُن واقعات خارجی کے اثر سے الگ کر نہیں سکتا جو اُس کے نفس پر ضرور ہی ایک اثر ڈالیں گے اور یہ اثر اُس وقت بھی پڑے گا جب وہ اُن واقعات کے وجود سے بھی بے خبر ہو۔ اب دوسری شرط کو لیجئے تو اُسے اہل مابعد الطبعیات نے بالکل دُور پھینک دیا ہی۔ کیونکہ اُن کا کل منصوبہ اس خیال پر مبنی ہے کہ ایک نفس واحد کے مطالعہ سے وہ کل نفوس کے قوانین کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ لہذا ایک طرف تو وہ اس قابل نہیں کہ اپنے مشاہدات کو خلل اندازیوں سے پاک کر سکیں اور دوسری طرف وہ اُس باقیماندہ احتیاط کے (یعنی ایسے تجربے کرنا جن سے آثار اپنے مرتبۂ ذات میں منفرد نظر آسکیں) مرعی

رکھنے سے انکار کر رہے ہیں کہ جس کے سبب سے وہ اپنے دائرہ غور و فکر کو اس قدر وسیع کرنے سے انکار کیے دیتے ہیں کہ جس سے وہ خلل اندازیاں الگ ہو جائیں جو اُس کے مشاہدات میں مخل ہیں یہ سب سے پہلا اور اصولی اعتراض ہے جو مابعد الطبعیات والوں اور ان کے فلسفے کی پہلی منزل پر وارد ہوتا ہے۔ لیکن اگر ہم ذرا زیادہ گہرے جائیں تو ایک اور کیفیت نظر آئے گی جو اتنی بیّن ہو یا نہ ہو، فیصلہ کُن ضرور ہے اور وہ یہ کہ جب مابعد الطبعیات والا یہ تسلیم کر لیتا ہے کہ ایک ہی نفس کے مطالعہ سے وہ کُل نفوس کے قوانین دریافت کر سکتا ہے تو اُسے ایک قسم کی دشواری پیش آجاتی ہے اور وہ اس قسم کی دشواری ہے کہ اور مسئلوں میں بالعموم پیش نہیں آتی اور اس لیے جو لوگ خاص مابعد الطبعیات کے مباحث سے واقفیت نہیں رکھتے اُن کی نظر اس دشواری پر نہیں پڑتی۔ لہٰذا اس کو اچھی طرح ذہن نشین کرنے کے لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے ایک مختصر حال اُن دو بڑے مذاہب کا بیان کر دیا جائے جن میں سے ایک نہ ایک سے کُل مابعد الطبعیات والے علاقہ رکھتے ہیں:-

نفس انسانی کی فطرت و ماہیت کو مابعد الطبعیات کے اصول پر صرف دو طرح تحقیق کیا جا سکتا ہے۔ یہ دونوں راستے وسیع و کشادہ ہیں لیکن بالکل جُداگانہ نتائج پر پہنچاتے ہیں کیونکہ پہلے طریقے کی رُو سے تحقیق کرنے والا اپنے محسوسات کے مطالعہ سے تحقیق شروع کرتا ہے اور دوسرے طریقے کا پیرو اپنی تحقیقات کا آغاز تصورات کے مطالعہ کو بناتا ہے۔ یہ دونوں ہمیشہ متضاد نتائج پر پہنچتے ہیں اور اس کے اسباب کا سمجھنا چنداں دشوار نہیں۔ مابعد الطبعیات میں نفس ایک آلہ ہے اور نفس ہی وہ مواد ہے جس پر یہ آلہ عمل کرتا ہے تو چونکہ وہ ذریعہ جس سے یہ فلسفیانہ تحقیقات ہونی چاہیئے اور وہ شے جس پر اُسے کام کرنا چاہیئے یعنی علت اول و علت فاعلی دونوں ایک ہیں لہٰذا ایک عجیب قسم کی مشکل پیش آتی ہے۔ یعنی کل آثار ذہنی پر جامع اور مانع حیثیت سے مطالعہ کرنا غیر ممکن ہو جاتا ہے۔ کیونکہ چاہے کتنی ہی وسعت نظر سے مطالعہ کیا جائے خود اُس نفس کی حالت خارج رہے گی جس سے یا جس میں مطالعہ کیا گیا ہے اسی سے ہم دیکھ سکتے ہیں کہ طبعیات اور مابعد الطبعیات کی